صاحبِ طرز ادیب حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ

کے

ادبی شہ پارے

دوم

مرتب

محمد سمیع الدین نظام آبادی

دارالکتاب دیوبند

صاحبِ طرز ادیب حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

کے

ادبی شہ پارے

(حصۂ دوم)

مرتب

محمد سمیع الدین نظام آبادی

دارالکتاب دیوبند

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ادبی شہ پارے (حصۂ دوم)

صفحات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۳۶

مرتب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد سمیع الدین نظام آبادی

کمپیوٹر کتابت۔۔۔۔۔عبداللہ وسیم (سراج کمپیوٹر سینٹرز مدنی مسجد دیوبند)

سال اشاعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شعبان ۱۴۲۳ھ

قیمت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ناشر

دارالکتاب دیوبند

Ph/Fax: Off. 01336-22558
Phone. Res. 01336-22924

بیٹی سے خطاب

شریف بچیوں کو پہلا سبق اطاعت کا ملتا ہے، خدمت گزاری کا ملتا ہے، اپنے دل کو مار کر، کچل کر دوسرے کا جی خوش کرنے کا ملتا ہے۔ شریف لڑکی! سبق کے امتحان کا وقت آ گیا۔ ادھر نکاح کے دو بول منہ سے نکلے، ادھر وہ امتحان شروع ہو گیا۔ بھلا دے، آج سے، کہ پرورش کن نازوں میں ہوئی، بھول جا کہ آج سے دنیا میں کوئی ناز بردار باقی ہے وقف سمجھ لے آج سے اپنی زندگی خدمت کے لیے، اطاعت کے لیے، صبر کے لیے۔ زہر میں قند کا مزہ حاصل کرنا سیکھ، سوکھی روٹی کے ٹکڑے ملیں، تو جنت کے خوان سمجھ۔ پھٹے پرانے کپڑے پہننے میں آئیں، تو زرو جواہر خیال کر، زبان درازیاں ہوں تو اپنے کانوں کو بہرا بنا لے۔ آوازے کسے جائیں تو زبان پر مہر لگا لے۔ کلیجہ میں نشتر بن کر ہر چبھنے والے طعنے کو ماں کا پیار سمجھ اور ہر چڑھی ہوئی تیوری میں اپنے مقدر کی مسکراہٹ کا جلوہ دیکھ! صبر وضبط کے ساتھ شکر واطمینان کے ساتھ زندگی ساری کی ساری گزار دے اور دنیا کو دکھا جا کہ اپنے بڑوں کے نام کی لاج رکھنے والیاں، خدائے واحد کی بندیاں، رسول برحق کی باندیاں، عائشہؓ و فاطمہؓ کے قدموں پر نثار ہو جانے والیاں۔ اس چودھویں صدی میں بھی کیسی ہوتی ہیں۔

(خطبات ماجدیا بدیہ زوجین ص: ۱۵)

مولانا ابوالکلام آزاد

تیور مردانہ، لہجہ شریفانہ، ترکیبوں میں جزالت، الفاظ میں جلالت، تشبیہوں میں جدت، استعاروں میں ندرت، خیال میں بلندی، بیان میں صفائی، مطالب فکر انگیز، اسلوب ولولہ خیز، نثر ہر جگہ ادیبانہ، کہیں خطیبانہ، خطابت کا مزاج شاہانہ، عبارت کی سطح کہیں حکیمانہ، کہیں حاکمانہ، حکمت کی جگہ حکمت، ظرافت کی جگہ ظرافت حکایت غم وحزن ہو یا داستان سرور نشاط، لطافت وشادابی سطر سطر سے عیاں، اور آمد اور بے ساختہ پن لفظ لفظ سے نمایاں، مطالعہ میں گہرائی مشاہدہ میں گیرائی بات میں بات پیدا کرنے کا وہ سلیقہ اور معمولی جزئیات سے دور رس نتائج نکالنے کا وہ ملکہ کہ دھوکہ حضرت رومیؒ کی مثنوی کے دفتروں کا ہونے لگے۔

قادر الکلام کا لفظ ہمارے یہاں شاعروں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے نثر نگاری میں کسی پر اس کا اطلاق اگر پوری طرح ہوسکتا ہے تو وہ ابوالکلام کی ذات ہے۔ مضمون خوشی کا ہو یا غم کا۔ داستان رزم کی ہو یا بزم کی، موضوع فنی ہو یا شعری، عنوان سیاسی ہو یا فلسفیانہ، یہ سدا بہار قلم ہر انداز بیاں، ہر اسلوب نگارش، ہر پرواز فکر پر یکساں قادر!

(نشریات۔ ا جدحصہ دوم ۷۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☆فہرستِ مضامین☆

آئینۂ عناوین | صفحات نمبر

☆ پانچواں باب۔ ذکرِ رسول

☆ مردوں کی مسیحائی ۱۷
☆ یتیم کا راج ۱۹
☆ یتیم کی جیت ۲۲
☆ دوراستے ۲۶
☆ ورفعنا لک ذکرک ۲۹
☆ محبوب سے خطاب ۳۴
☆ صابر رسول ۳۹
☆ مناقب کی جامعیت ۴۲
☆ اسوۂ حسنہ ۴۳

☆ چھٹواں باب۔ صحافتِ ماجدی

فصل اول۔ سچی باتیں

☆ (۱) ۴۹
☆ (۲) ۵۱
☆ (۳) ۵۳
☆ (۴) ۵۴
☆ (۵) ۵۵
☆ (۶) ۵۶
☆ (۷) ۵۷
☆ (۸) ۵۹
☆ (۹) ۶۰
☆ (۱۰) ۶۰
☆ (۱۱) ۶۱
☆ (۱۲) ۶۲
☆ (۱۳) ۶۳
☆ (۱۴) ۶۴
☆ (۱۵) ۶۵

فصل دوم۔ تنقیداتِ ماجدی

☆ جامعہ ملیہ "اسلامیہ" کی جدید خدمتِ "اسلام" ۶۷
☆ ایک گندی کتاب ۷۶
۷۶

فصل سوم۔ شذراتِ ماجدی

☆ روزہ اسلام کا اہم رکن ۷۹

☆ یہ قومی دھارا ۸۳
☆ فرنگی جمہوریت یا اسلامی شوریت ۸۴
☆ ایک ضخیم ناول ۸۵
☆ ایک اصولی بحث ۸۶
☆ شوقِ مرگ ۸۷
☆ بیماری کی حلاوتیں ۸۸
☆ لذتِ غم رہی..... ۸۹
☆ بے برکتی ۸۹
☆ بیٹی سے خطاب ۹۱

فصل چہارم۔طنزیاتِ ماجدی

☆ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں..... ۹۹
☆ پھول کہاں سے کھل گئے..... ۹۹
☆ آپس کی گالیاں ہیں..... ۱۰۰
☆ ماں کی برہنگی کا نظارہ ۱۰۰
☆ ایک انوکھا ملک ۱۰۱
☆ رحمتیں ہیں تری اغیار..... ۱۰۱
☆ جامۂ تہذیب کی عریانیاں ۱۰۲
☆ اقتدار کی دھوپ چھاؤں ۔ ۱۰۳
☆ خوں خوار سیاست ۱۰۳
☆ .....خاکِ وطن کفن میں ۱۰۴
☆ نئی آمد نیا خرچ ۱۰۵

☆ بدنصیب کی خوش نصیبی ۱۰۵

☆ ''کوئی حد بھی ہے'' ۱۰۶

☆ تجدد میں کہنگی ۱۰۶

☆ بے اثر یقین دہانی ۱۰۷

☆ شنید سے دید تک ۱۰۸

☆ ذہانت کا ایک عجیب استعمال ۱۰۸

☆ یہ سیکولر دیس ۱۰۹

☆ الٹی گنگا ۱۰۹

☆ ایک ہجو ملیح ۱۱۰

☆ گردن کشوں کی سجدہ ریزی ۱۱۰

☆ غریبی کے ٹھاٹھ ۱۱۱

☆ مثالی ستم ظریفی ۱۱۱

☆ زہریلی ترقیاں ۱۱۱

☆ پرچم آصفی کی رحلت ۱۱۲

☆ ہمارے گھرانے ۱۱۲

☆ خوش درخشندہ..... ۱۱۳

☆ جنت رندی کی تلاش میں ۱۱۳

☆ ترقی کا نشان ۱۱۴

☆ ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر..... ۱۱۴

☆ انٹرنیشنل نونہال ۱۱۵

☆ تحفۂ تہذیب ۱۱۶

☆ ایک دلکش نظارہ ۱۱۶
☆ اہلِ ناز کا نیاز ۱۱۷
☆ منکروں کا اقرار ۱۱۷
☆ شادی میں غم ۱۱۸
☆ اہل ''عقل'' کا کمال ''نقل'' ۱۱۹
☆ فطرت سے بغاوت ۱۲۰
☆ جہاں پناہ کا غسلِ صحت ۱۲۲

☆ ساتواں باب۔ انشائے ماجدی

☆ پیامِ اکبر ۱۲۵
☆ اردو کا ایک بدنام شاعر ۱۳۷
☆ الفاظ کا جادو ۱۵۰
☆ جھوٹ میں سچ ۱۵۳
☆ بہار کی بہار ۱۵۸
☆ مرزا رسوا کے قصے ۱۶۰
☆ اردو کا واعظ شاعر ۱۶۵
☆ پریم چندر ۱۶۹
☆ نیا آئینِ اکبری ۱۷۱
☆ موت میں زندگی ۱۷۵
☆ ایک بزمِ مشاعرہ کی غیر شاعرانہ صدارت ۱۸۱
☆ شبلیؒ ۱۸۳
☆ سفرِ سعادت ۱۸۷

☆ تاریخ نظم اردو ۱۸۸
☆ مرزا بلگرامی ۱۹۰
☆ ہم اور وہ ۱۹۱

☆ آٹھواں باب۔ مکتوباتِ ماجدی

فصل اول۔ دلآویز ادبی مکتوبات

☆ بنام سید لقمان صاحب ۱۹۴
☆ خواجہ حمید الدین شاہد صاحب ۱۹۴
☆ یوسف قمر صاحب ۱۹۵
☆ خواجہ محمد شفیع دہلوی ۱۹۵
☆ حکیم بنیاد علی میرٹھی ۱۹۵
☆ رازق الخیری صاحب ۱۹۶
☆ مولوی حبیب ریحان صاحب ندوی ۱۹۶
☆ ابن احمد صاحب ۱۹۷
☆ مولانا جمال الدین عبدالوہاب صاحب ۱۹۷
☆ ایڈیٹر صداقت ۱۹۷
☆ حاجی مقتدا خان صاحب شیروانی ۱۹۸
☆ ایڈیٹر صداقت ۱۹۸
☆ ناظم انجمن اردو ۱۹۹
☆ انوار ظہوری صاحب ۲۲۰
☆ خورشید احمد صاحب ۲۲۰

☆ پروفیسر حسن رضوی ۲۰۱
☆ جوش ملیح آبادی ۲۰۱
☆ حبیب انصاری صاحب ۲۰۲
☆ مولانا عبدالرؤف صاحب ۲۰۲
☆ مولانا قاری طیب صاحب دیوبندی ۲۰۲
☆ ایڈیٹر صاحب "چراغِ راہ" ۲۰۳
☆ طالب چکوائی ۲۰۳
☆ مولوی محمد زماں حسینی قاسمی ۲۰۳
☆ حیات وارثی صاحب ۲۰۳
☆ محمد عصمت خان صاحب ۲۰۴
☆ حکیم نیر صاحب ۲۰۵
☆ ایس اے حسن نقوی ۲۰۵
☆ مولانا شاہ معین الدین صاحب ۲۰۶
☆ جناب شہباز حسین صاحب ۲۰۷
☆ مولوی صبغۃ اللہ شہید صاحب انصاری ۲۰۷
☆ مولانا عبدالباری صاحب ندوی ۲۰۹
☆ قطب الدین احمد صاحب ۲۰۹
☆ مولانا اویس صاحب ندوی نگرامی ۲۱۰
☆ مولوی سید رئیس احمد جعفر ندوی ۲۱۱
☆ مولانا مناظر احسن گیلانی ۲۱۲
☆ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۱۳

فصل دوم۔ دلدوز تعزیتی مکتوبات

☆ دل شکستہ ماں کے نام ۲۱۴

☆ حسرت زدہ باپ کے نام ۲۱۶

☆ الم نصیب بیوہ کے نام ۲۱۸

☆ مغموم شوہر کے نام ۲۱۹

☆ متفکر بیٹے کے نام ۲۲۲

☆ رنجیدہ بھائی کے نام ۲۲۴

☆ عام تعزیتی مکتوبات ۲۲۶

فصل سوم۔ دلچسپ علمی مکتوبات

☆ محمد احمد غریب صاحب ۲۳۱

☆ مولانا عبدالباری صاحب ندوی ۲۳۱

☆ قطب الدین احمد صاحب ۲۳۴

☆ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی ۲۳۴

☆ نواں باب۔ نشریاتِ ماجدی

☆ ہماری زندگی اور اس کے رنگ ڈھنگ ۲۳۶

☆ قرآن کیا ہے؟ ۲۳۹

☆ عیدالفطر ۲۴۰

☆ عیدِ قرباں ۲۴۲

☆ محمد علی ۲۴۴

☆ امیر خسرو ۲۴۵

☆ غالبؔ کا فلسفہ ۲۴۷
☆ شکوہ جواب شکوہ ۲۴۹
☆ اکبرؔ الٰہ آبادی ۲۵۰
☆ کربلا اور اسلام ۲۵۱
☆ نیکی کر اور دریا میں ڈال ۲۵۲
☆ مذہب اور قومیت ۲۵۴
☆ ہمہ گیر اخوت ۲۵۵
☆ ہم اپنی وضع کیوں بدلیں ۲۵۸
☆ خانہ کعبہ ۲۶۱
☆ حضرت ابراہیمؑ ۲۶۲
☆ ابوالکلام کی شخصیت ۲۶۳
☆ مولانا آزادؔ ۲۶۶
☆ مولانا کہلانے سے قبل ۲۶۷

☆ دسواں باب۔ معاصرین

☆ والدین ۲۷۱
☆ حکیم الامت ۲۷۳
☆ احمد شریف شیخ سنوی ۲۷۵
☆ اکبرؔ الٰہ آبادی ۲۷۶
☆ مولانا شوکت علی ۲۷۹
☆ حسرت موہانی ۲۸۰
☆ بوڑھا کنوارا ۲۸۱

☆ خواجہ حسن نظامی ۲۸۳
☆ راشد الخیری ۲۸۴
☆ راجہ صاحب ۲۸۶
☆ عبدالحلیم شرر ۲۸۷
☆ مولانا ثناءاللہ امرتسری ۲۸۸
☆ اعلیٰ حضرت ۲۸۹
☆ افضل العلماء کرنولی ۲۹۰
☆ غازی مسعود ۲۹۳
☆ مولانا عبدالباری ندوی ۲۹۴
☆ علی میاں ۲۹۵
☆ عبدالرحمٰن ندوی نگرامی ۲۹۶

☆ گیارہواں باب۔ وفیاتِ ماجدی

☆ والدہ ماجدہ ۲۹۹
☆ نازبردار بھائی ۳۰۰
☆ ہمشیر کی رخصتی ۳۰۲
☆ بوڑھی محبوبہ ۳۰۳
☆ نئی نویلی ۳۰۶
☆ ایک خدمت گار کی یاد میں ۳۰۷
☆ عبدالرحمٰن کی موت ۳۰۹
☆ ہمنام نامور ۳۱۳
☆ محقق گیلانی ۳۱۵

☆ مولانا صدر یار جنگ ۳۱۷

☆ افضل العلماء عبد الحق کرنولی مرحوم ۳۱۹

☆ محمد علی ۳۲۱

☆ حسرت موہانی ۳۲۳

☆ آہ۔ ابوالکلام! ۳۲۵

☆ رفیع احمد قدوائی ۳۲۵

☆ قائدِ ملت ۳۲۷

☆ مرزا ثاقب ۳۳۰

☆ چودھری محمد علی مرحوم ۳۳۲

☆ طبیب کی موت ۳۳۳

☆ ''جشن نوشابہ'' ۳۳۴

پانچواں باب

ذکرِ رسول

کسی مسلمان کا قلم لکھنے لکھانے سے آشنا رہے پھر سیرتِ نبوی کی زمین پر گل بوٹے کھلانے سے محروم! تو اس کی بدنصیبی و واماندگی پر سوائے حسرت و ماتم کے اور کیا کیا جاسکتا ہے؟۔۔۔۔مشک کی تعریف کرنا خود اپنی قیمت کو بڑھانا ہے ورنہ مشک تعریف و توصیف سے اعلیٰ اور کہیں برتر و بالا ہوتا ہے۔

سیرتِ نبوی کا موضوع ہر دور میں جاوداں رہا ہے۔ اپنے تو اپنے، غیروں نے بھی اس چمن کی آبیاری اپنے لیے باعثِ صد فخر و افتخار سمجھی ہے۔ جب کتابیں حدِ شمار سے باہر ہیں تو روزمرہ کے مقالات و مضامین کا استقصاء کس انسان کے بس کی بات ہے۔ بس شاعر کی زبان میں اپنے عجز و درماندگی کا اقرار کر کے سکوت اختیار کرنا پڑتا ہے

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

مولانا دریابادیؒ کی سوائے ''سیرتِ نبوی قرآن مجید سے'' کے کوئی اور مستقل تصنیف سیرت نبوی پر موجود نہیں۔ البتہ اس کے مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً اپنے ہفتہ واری پرچہ سچ اور اس کے نقشِ ثانی و ثالث صدق اور صدق جدید میں جو کچھ لکھتے رہے وہ ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اب ''ذکر رسول'' کے نام سے یہ مجموعہ بازار میں دستیاب ہے۔ فصاحت، بلاغت، سلاست، حسنِ معنیٰ و صورت اور مولانا کے ادیبانہ قلم کی دستکاری کی وجہ سے یہ کتاب سیرتِ نبوی کے اعلیٰ و معیاری ذخیرہ میں یقیناً جگہ پانے کی مستحق اور اس لائق ہے کہ سیرت کے عناوین کے انتخاب اور طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان میں اس کی تقلید کی جائے۔

اس باب میں بعض مضامین کی جامعیت اور ان کی ادبی رعنائی کی وجہ سے بعینہٖ پورے مضمون کو نقل کر دیا گیا ہے جس کی افادیت پڑھنے کے بعد ہی محسوس ہوگی۔

مُردوں کی مسیحائی

انسان زندہ بنایا گیا ہے، لیکن یہی زندہ کبھی مردہ بھی ہو جاتا ہے. دنیا روشن پیدا کی گئی ہے، لیکن یہی روشنی کبھی تاریکی میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے. روئے زمین کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے ہادی ورہنما آئے اور گزر چکے. لیکن اب ایک مدت سے دنیا ان کی ہدایت سے محروم ہے. بارش اپنے موسم میں زمین کو خوب سیراب کر چکی تھی، لیکن اب جلتی اور تپتی ہوئی زمین کے ہونٹوں پر پیاس سے خشکی کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں. آخری نبی حضرت مسیحؑ کے زمانہ کو ساڑھے پانچ سو سال کی مدت گزر چکی ہے، اور اب سطحِ زمین نورانیت کے فیض سے یکسر محروم ہے. دن کی روشنی چھپ چکی ہے، اور عالمِ انسانیت پر رات کی سیاہی چھائی ہوئی ہے کسی ایک ملک کی تخصیص نہیں، آفتاب کے طلوع ہونے کی جگہ مشرق، اور آفتاب کے غروب ہونے کی جگہ مغرب، سب گمراہی وسرگشتگی کی اسی سیاہ چادر میں لپٹے ہوئے ہیں. بحر و بر، شرق وغرب، عرب وعجم سب کی روحانی زندگی موت سے **ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس** تبدیل ہو چکی ہے، اور کائناتِ انسانی کی ساری فضاء شقاوت ونفس پرستی، بدی وبدکاری، شرارت ونفاق کے گہرے بادلوں سے سیاہ ہو رہی ہے۔

یہ حال سارے عالمِ انسانیت کا ہے، لیکن براعظم ایشیاء کے جنوب ومغرب کا وہ حصہ، جو عرب کے نام سے موسوم ہے، اس عموم میں ایک خصوص رکھتا ہے. یہ سرزمین جس طرح مادی حیثیت سے بنجر ہے، شاید اسی طرح اب تک فطرت کی روحانی بارشوں اور بخششوں سے بھی محروم ہے. اس کی تباہ کاریاں اور تیرہ بختیاں سارے عالم کے لیے ایک نمونۂ عبرت ہیں. بیمار کُل دنیا ہے، لیکن عرب کا مریض، دق میں مبتلا ہے. خشک سالی سب کہیں ہے، لیکن یہاں قحط شدید پڑا ہوا ہے. اس کی اخلاقی پستی حد سے گزر چلی ہے، اس کی روحانی بیماریاں تقریباً لاعلاج ہو چکی ہیں.

یہ تصریحات اُس کتاب پاک کی ہیں، جو ہر قسم کے مبالغہ وافراط سے بالاتر ہے، اور جس کا ایک ایک حرف، صداقت وحقیقت کے اونچے سے اونچے معیار کا نمونہ ہے. یہ فضا ہے، جس میں ایک

بے کس و بے یاور، یتیم اور اَن پڑھ بچہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے. کارساز فطرت کی مشیت یہ ہوتی ہے، کہ اسی بے کس و ناتواں کے ذریعہ سے، ایک قبیلہ کی نہیں، ایک قوم کی نہیں، ایک ملک کی نہیں، سارے عالم، بلکہ سارے عالموں لیکون للعٰلمین نذیرا کی اصلاح کا کام لیا جائے اور اسے سارے جہانوں کی جانب یہ پیام دے کر بھیجا جائے، کہ فطرت سے بغاوت کرتے رہنے والوں کا بالآخر کیا انجام ہونے والا ہے. پیامبر اپنا پیام پہنچاتا ہے، اور اس کے گرد و پیش کی ساری شیطانی قوتیں دولت وقوت کے سایہ میں جمع ہو کر اس کی مخالفت و عداوت پر کمر بستہ ہو جاتی ہے۔

جس پروردگار نے مادی رہنمائی و روشنی کے لئے سب کچھ سامان مہیا کر دیئے ہیں، کیا وہ اپنے بندوں کو روحانی روشنی کے سامان سے محروم رکھے گا؟ آفتاب اُسی وقت طلوع ہوتا ہے، جب پہلے تاریکی اچھی طرح چھا چکی ہوتی ہے، دنیا کی روحانی تاریکی اب اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہے، وقت آ گیا ہے، کہ سراج منیر، تمام عالموں کے روشن کر دینے والے چراغ کا طلوع ہو. آفتاب جب طلوع ہوتا ہے، تو اس کی تڑپ سے چاند بھی جگمگا اٹھتا ہے، اور خود روشن ہو کر دوسروں کو روشن کر دیتا ہے ..... نفس پرستی و خدا فراموشی کی طویل شبِ دیجور کا ختم ہو کر رہنا لازمی تھا، وہ ختم ہوئی اور روحانیت کا آفتاب، اصلاح و ہدایت کا سورج طلوع ہو گیا۔

زمین خشک اور پیاسی پڑی ہوتی ہے، بارش کے فیض سے افسردہ چمن لہلہانے لگتا ہے، مردہ کھیتی میں جان پڑ جاتی ہے، سویا ہوا سبزہ جاگ اٹھتا ہے، باغ سنسان پڑا ہوتا ہے، پتیاں مرجھا مرجھا کر گر چکتی ہیں، بہار کی ہوا چلتے ہی نئی اور ہری پتیاں نکل آتی ہیں، اور اجڑا ہوا باغ سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے. عالم پر شب کی سیاہی چھائی ہوتی ہے، ہر شے تاریکی میں گم ہوتی ہے، صبح کے طلوع ہوتے ہی، ہر طرف اجالا پھیل جاتا ہے، اور ہر ذرّہ روشن ہونے لگتا ہے. ایک پاک روح دنیا میں اصلاح و تزکیہ کے لئے آتی ہے اور اپنے فیضِ صحبت سے، بہت سے اندھوں کو بینا، بہت سے بیماروں کو تندرست اور بہت سے مُردوں کو زندہ کر دیتی ہے. کارخانہ فطرت میں اس قانون فطرت کی نظیریں برابر ملتی رہتی ہیں۔۔۔۔ لیکن دنیا میں یہ انقلابِ روحانی پیدا کر دینا کہ کل تک جو رہزن تھے،

وہ آج اچھے رہرو ہی نہیں، بلکہ بہترین رہبر بھی ہو جائیں، کل تک جن کی زندگی فسق و فجور کی نذر تھی، آج وہ اتنے بلند و مقدس مرتبہ پر پہنچ جائیں، کہ صداقت و پاکیزگی کو ان کے انتساب سے شرف ہو جائے، کل تک جو مردہ تھے، وہ آج زندہ ہی نہیں، بلکہ دوسروں کو زندہ کر دینے والے بن جائیں، ایسے آفتاب کا طلوع جو ہر ذرّہ کو آفتاب بنا دے، ایسے مسیح کا نزول جو مردہ کو مسیح بنا دے۔۔۔۔اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بجز سرورِ عالم کے صحابیوں، بجز محمدؐ کے غلاموں کے اور کہیں مل بھی سکتی ہے؟

نادانوں کا قول ہے کہ خاتم النبیین نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا، حالانکہ یہ پاک زندگی شروع سے آخر تک خود ایک معجزہ تھی، اور اس کا کوئی جزئیہ ایسا نہ تھا، جو اپنے اندر ایک اعجازی رنگ نہ رکھتا ہو! اس ''زندہ فرقان'' کے ان زندہ معجزوں کے ہوتے ہوئے، کشتیِ نوح، گلزارِ خلیل، عصائے موسیٰ، تختِ سلیمانی، حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، کسی محدود، وقتی و مقامی معجزہ کی کچھ ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنھم کی زندگی نہ اس وقت راز تھی، نہ آج راز ہے۔ ابولہب و ابوجہل اور ان کے سارے ہمنشینوں نے اس وقت دیکھا، کہ بدبودار اور پُرعفونت کھاد گملے میں پڑی اور اُن کی آنکھوں کے سامنے، شاداب و خوشرنگ مہکتے ہوئے گلاب کے پھول میں تبدیل ہو گئی۔ حق کی قوت، ہر تردید و تغلیط کے خطرے سے بے پرواہ ہے، زندہ معبود کے زندہ رسولؐ کے زندہ معجزہ کا جواب نہ اس وقت بن پڑا، نہ آج حق کے جھٹلانے والوں، محمد کے دشمنوں، اور ابولہب و ابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں سے کسی کے بس کی بات ہے۔ اللہ مراتب بلند کرے، اکبرالہ آبادی مرحوم کے، سارے مضامینِ نعت کا عطر ایک شعر میں کھینچ کے رکھ دیا ہے ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا!

(ص:۱۳۰)

یتیم کا راج

کچھ کم چودہ سو برس کا زمانہ گزرتا ہے، کہ تمدن کی نمائش گاہوں سے کوسوں دور، تہذیب کے سبزہ

زاروں سے الگ، ایک ویران و بے رونق بستی میں، چلچلاتی دھوپ والے آسمان کے نیچے، خشک اور پتھریلی سرزمین کے اوپر، ایک شریف لیکن اَن پڑھ اور بے زر خاندان میں، ایک بچہ عالمِ آب وگل میں آنکھیں کھولتا ہے

شفیق باپ کا سایہ پہلے ہی سے اٹھ چکتا ہے، ماں بھی کچھ ہی روز بعد سفرِ آخرت اختیار کر لیتی ہیں. تربیت کے جو ظاہری قدرتی ذریعے ہیں. وہ یوں گم ہو جاتے ہیں. بوڑھے دادا اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیتے ہیں، لیکن بچہ کا بچپن ابھی ختم نہیں ہونے پاتا کہ وہ بھی ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں. گھر میں نہ نقد ہے، نہ جائیداد، حکومت ہے نہ ریاست، خانہ ویرانی کا یہ عالم ہے، کہ نہ ماں ہے نہ باپ. نہ دادا ہے نہ دادی، نہ بھائی ہیں، نہ بہن. تن تنہا بے ساز وسامان، بے یار و مددگار، ایک نوعمر اللہ کا بندہ ہے، جسے سہارا ہے تو اُسی نظروں سے اوجھل مولا کا، اور آسرا ہے تو اُسی نگاہوں سے غائب مالک کا!

فضائے ملک، بلکہ فضائے عالم کی اس تیرگی میں یہ نوعمر یتیم کھڑا ہوتا ہے، اور اپنی پاک و پاکیزہ کتاب کے ہر ورق کو کھول کر رکھ دیتا ہے. اور اپنی زندگی کا ایک کامل و مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے حوصلہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنا جیسا بنایا جائے. ایک طرف ساز وسامان سے محرومی ہے. ہر پہلو سے بے کسی اور بے بسی ہے، ہر اعتبار سے بے اختیاری ہے، اور دوسری طرف ملک وقوم کی اصلاح کی امنگیں ہیں، بلکہ کہنا چاہئے، کہ ساری کائناتِ انسانی کے سدھارنے کے حوصلے ہیں ..... یہ نوعمر، حسین وخوش رو ہے، نوجوانی کا خون اس کی رگوں میں بھی گردش کرتا ہے، ملک میں گھر گھر فحش و بے حیائی کے چرچے ہیں، لیکن اس کی نیچی نظروں پر خود حیاداری قربان ہو ہو جاتی ہے. مئے ناب کے ساغر ہر طرف جھلک رہے ہیں، پیمانہ چاروں طرف گردش میں ہے، لیکن اس کے دامنِ تقوی پر فرشتے تک نماز پڑھنے کے آرزومند ہیں. لوگ لڑ رہے ہیں، یہ صلح کرا رہا ہے. وہ چھیننے میں مصروف ہے، یہ بانٹنے میں. دنیا تحصیل وفراہمی میں لگی ہوئی ہے، اور یہ عطا و بخشش میں. عام مخلوق، مخلوق پرستی کی لعنت میں مبتلا ہے، ایک اس کے دل میں خالق کی لو لگی ہوئی ہے۔

کٹھن کام اب شروع ہوتا ہے ایک طرف ملکِ حجاز کی قوت وجمعیت ہے اور دوسری

طرف تن تنہا ایک فرد اصلاح وہدایت کا کام ہاتھ میں لینے والا صدیوں کی پڑی ہوئی خصلتوں کا چھڑانا سیکڑوں برس کے زنگ دلوں سے دور کرنا، ایک دو شخص نہیں، ایک دو خاندان نہیں، ایک قبیلہ نہیں، سارے ملک کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے. پھر زندگی کی کوئی ایک صنف نہیں، ہر صنف اور ہر شعبۂ زندگی کو نئے سرے سے بدلنا! غرض خاندان مخالف، برادری مخالف، شہر کی ساری آبادی مخالف، وطن کے در و دیوار مخالف، اور چشمِ ظاہر میں تو یہ نظر آنے لگا کہ وہ جو اس بزمِ ہستی کا صدر بنا کر بھیجا گیا، زمین کے ذرّے اس کے مخالف، آسمان کے تارے اس کے مخالف.

ایک طرف ادائے فرض کا احساس، دوسری طرف مخالفتوں کا یہ ہجوم بے پایاں! عین اس وقت کے جب کہ عالمِ بشریت میں سامانِ تسکین وتشفی ممکن نہ تھا، یہ صدائے غیب کانوں میں آتی ہے کہ اے ہمارے پیارے اور فرمانبردار بندے! گھبرانے اور ہمت چھوڑنے کی کوئی بات نہیں. ہم نے تیرے اوپر وہ لطف وکرم کیا ہے کہ وحی کی روشنی دے کر خود تجھے راہ راست پوری کی پوری دکھادی، بلکہ اس نعمت سے بھی سرفراز کر دیا، کہ دوسروں کو بھی راہِ ہدایت دکھاتا رہ. مخالفین کے منصوبوں اور شرارتوں سے تنگ دل نہ ہونا، تو ہماری حفاظت میں ہے، یہ تیرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، آج یہ نالائق اپنے نزدیک تجھے مٹا دینے کی فکر میں ہیں، لیکن ہم نے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے ورفعنا لک ذکرک، پھر جس ذکر کو ہم بلند قرار دیں، کون بشر اُس کی بلندی کا پورا اندازہ کر سکتا ہے؟ یہ مخالفین اور یہ سازشیں تجھے کیا میٹ سکیں گی، مخالفین اور سازش کرنے والے خود ہی مٹ جائیں گے، اور تیرا نام ان سب کو پست وسرنگوں کر کے خود ممتاز وسربلند رہے گا۔

یہ آواز اس وقت دنیا کے سامنے بلند ہوئی تھی، جب اسلام کے خلاف دولت، امارت وحکومت کی ساری قوتوں کا ایکا تھا، جب اسلام محدود تھا، تنگدستوں اور بیکسوں، ضعیفوں اور شکستہ حالوں کی ایک مختصر سی جماعت میں جب اللہ کا نام زبان پر لانے کا انعام ملتا تھا، گالیوں اور ذلتوں، تازیانوں اور عقوبتوں سے. مگر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ چند ہی روز میں کیسی کایا پلٹ تھی! قریش کے زور آور خاک میں مل گئے. اُن کے حلیف اور حمایتی مٹ کر رہ گئے. دولت مند یہود کا تختہ الٹ گیا.

اور جن کی عقل وفہم پر، قوت واثر پر، دولت وسرمایہ پر، زمانہ کو ناز تھا، اُن کے نام تک صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ ساڑھے تیرہ سو برس کی مدت میں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی، عقل ودانش کی کتنی منزلیں، حدوحساب سے باہر، عدد وحساب سے خارج، طے ہوچکیں۔ الحاد و مادیت کی قلمرو کتنی وسیع ہوچکی۔ پر آج خالق کے نام کے ساتھ جس مخلوق کا نام زبانوں پر آتا ہے اللہ کے ذکر کے ساتھ جس بندہ کا ذکر کانوں تک پہونچتا ہے وہ..... عبداللہ کے لختِ جگر، آمنہ کے نورِ نظر، خاکِ بطحا کے اُسی بے کس وبے بس یتیم کا، جسے قریش کے زور آور، جہل ونخوت کے نشہ میں اپنا ہی جیسا محض ایک مشتِ خاک سمجھ رہے تھے۔

کشمیر کے سبزہ زاروں میں، دکن کی پہاڑیوں میں، افغانستان کی بلندیوں میں، ہمالیہ کی چوٹیوں میں، گنگا کی وادیوں میں، چین میں، جاپان میں، جاوا میں، برما میں، روس میں، ..... ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں، اوران سب مہذب، نیم مہذب ملکوں کو چھوڑ کر خاص ناف تمدن ومرکز تہذیب، لندن، پیرس اور برلن کی آبادیوں میں، ہر سال نہیں، ہر ماہ نہیں، ہر ہفتہ نہیں، ہر روز پانچ پانچ مرتبہ، بلند میناروں سے جس نام کی پکار خالق کے نام کے ساتھ، فضا میں گونجتی ہے، وہ اسی ایک سچے اور اچھے کا نام ہے، جسے بصیرت سے محروم دنیا نے ایک زمانہ میں محض ایک بے کس ویتیم کی حیثیت سے جانا تھا۔

(ص:۲۷)

یتیم کی جیت

جو زور والے تھے، ان کا زور توڑنے کے لیے، جو گھمنڈ والے تھے انھیں نیچا دکھانے کے لیے، جو حکمت اور حکومت والے تھے، اُن میں عبدیت کی شکستگی پیدا کرنے کے لیے اور سب سے بڑھ کر، اپنی بے مثال قدرت وحکمت کے بے مثال نمونہ دکھانے کے لیے، انتخاب اس کا کیا جاتا ہے، جو نہ زر رکھتا تھا نہ زور۔ نہ اس کے جلو میں سوار اور پیادے ہیں، اور نہ اُس کی بغل میں علوم وفنون کی پوتھیاں! ایک بے یار ومددگار یتیم بچہ جس کی ولادت سے قبل ہی اس کے باپ کو اٹھالیا جاتا ہے، عرب

کی سرزمین پر نمودار ہوتا ہے اور اسے حکم ملتا ہے کہ اپنے خاندان اور قبیلہ ہی کی نہیں، سارے ملک کی بھی نہیں، سارے عالم کی اصلاح پر کمر بستہ ہو جائے! عقل حیران، دماغ متحیر!

جنھیں اپنی تہذیب وشائستگی پر ناز تھا انھوں نے قہقہے لگائے، جنھیں خطابت وسحر بیانی کا دعویٰ تھا، انھوں نے تالیاں بجائیں، جنھیں آج کل کی برہنہ تصویروں اور نیم برہنہ تصویروں کی طرح اپنی برہنہ شاعری پر فخر تھا، انھوں نے آوازے کسے، مال اور جتھے والوں کے تیور پر بل پڑے، اور جو زور قوت والے تھے، تن تن کر، اور اکڑ اکڑ کر میدان میں نکل آئے!

مقابلہ زور اور ضعف کے درمیان. جسے دنیا زور اور قوت سے تعبیر کرتی ہے، اور جسے دنیا ضعف وتوانائی کہکر پکارتی ہے. ایک طرف سامان کی فراوانی، دوسری طرف بے سروسامانی. اِدھر معاہدہ اور سازشیں، اُدھر تنہائی کی عبادتیں. یہاں ریاست وسرداری، وہاں فاقہ ونامرادی. اس طرف جاہ وتجمل، اس طرف فقر وتوکل. جو اکیلا اور دنیا کی نظر میں بے یار ومددگار تھا، اس پر خوب جی بھر ٹھٹے لگائے گئے. اور جو شان کے اونچے اور جتھے والے تھے، انھوں نے پکار پکار کر کہا، کہ ذرا سننا اور دیکھنا، اس تخیل کو تو دیکھنا، کہ جسے جھونپڑا بھی نصیب نہیں، وہ محلوں کے خواب دیکھ رہا ہے اور جو اپنی بے بسی اور بے کسی کے دور کرنے پر قادر نہیں، وہ دنیا کو راہِ ہدایت دکھانے کا دعوٰی، اور خلق کو جادۂ اصلاح پر لانے کا حوصلہ کر رہا ہے!۔۔۔۔ یہ سب کرشمے وہ دکھا تا رہا تھا، جس نے نمرود کا بھیجا، ایک مچھر کے ذریعہ سے پاش پاش کر دیا تھا، جس نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی خوراک بنا دیا تھا اور آج بھی لارڈ کچرا اور لارڈ ٹامسن کو دم کے دم میں ڈبوتا اور جلاتا اور زار روس اور زارینہ کو آن کی آن میں مارتا اور ہلاک کرتا رہتا ہے۔

قُدرت اور حکمت کا تازہ ظہور یوں ہوتا ہے، کہ خدائے واحد کے اس اکیلے پرستار کا اکلوتا اور لاڈلہ بچہ، اس کی آنکھوں کے سامنے جان دیتا ہے. اور جو دشمن کی بھی تکلیف کو دیکھ کر تڑپ جاتا تھا، اس کا ننھا اور معصوم لختِ جگر اسی کے آغوشِ شفقت میں دم توڑ رہتا ہے. اللہ اللہ! کیا شان بے نیازی اور جلوۂ حکمت آرائی ہے، کہ باغیوں اور سرکشوں کی، اولاد اور اولاد در اولاد، پھل پھول رہی

ہے، اور جو اپنے رَب کا نام جپنے والا ہے، اسے اس نعمت سے محروم کیا جا رہا ہے! اُس کے پاس نہ دولت تھی نہ حکومت، نہ اس کی کوئی بڑی پارٹی تھی، نہ اس کے معتقدین کا کوئی وسیع حلقہ۔ ہر طرف سے مخالفت کا ہجوم، ہر سعیِ اصلاح میں ناکامی، ہر دعوتِ حق میں بے اثری، غرض ہر دنیوی نعمت سے محرومی چشمِ ظاہر کو پہلے ہی سے نظر آ رہی تھی، لے دے کے یہ جو آخری نعمت تھی، اب یہ بھی چھن کر رہ گئی! دنیا ایسے مواقع پر کیا رائے قائم کرتی؟ اُس نے وہی رائے قائم کی، جو اندھوں اور بے بصروں نے ہمیشہ قائم کی ہے، وہ ہنسی، وہ مسکرائی، وہ خوشی سے اُچھلی کودی۔ عاص بن وائل منکروں کا ایک سردار اور ناہنجاروں کا پیشوا تھا، اس نے چمک چمک کر اور مٹک مٹک کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چلو چھٹی ہوگئی، محمد کی نسل ختم ہوئی، اور آگے نہ اس کے کام کو چلانے والا باقی رہا نہ اس کا نام کا لینے والا، دیکھا ہمارے دیوتاؤں سے بے ادبی کرنے کا یہ انجام ۔۔۔۔ جنھوں نے محمد کو محض گوشت و پوست کا مجموعہ سمجھ رکھا تھا، وہ اس طنز میں شاید معذور بھی تھے، کوئی کس طرح دکھا دیتا، کہ کس جسم عنصری کا لفافہ اپنے اندر کس روح مطہر کو ڈھانپے اور چھپائے ہوئے ہے۔

بہر کیف غیرتِ حق نے اس طعن کو سنا، اور اب اُس میں حرکت ہوئی، آواز آتی ہے جہاں نہ الفاظ کا گزر ہے، نہ حروف کا پتہ، کہ یہ بے خبر اور بے بصر، یہ غافل اور جاہل، تیرے اوپر طعنہ زن ہیں، ان بدبختوں کو کیا خبر کہ ہم نے تجھے خیر کثیر دے رکھی ہے، بھلائیوں کے خزانے در خزانے تجھے عطا کر رکھے ہیں۔ انا اعطینک الکوثر ۔ ساری اچھائیوں، ساری خوبیوں، ساری محبوبیوں کا مالک تجھے بنا رکھا ہے۔ تیرے لیے کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے، دنیا میں بھی عقبیٰ میں بھی؟ جسے دینے والے ہم ہوں اس کی دولتمندی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ جسے بخشنے والے ہم ہوں اس کی نعمت اندوزیاں کس کے شمار میں آ سکتی ہیں؟ جس پر مہربان ہم ہوں اُس کے جاہ و جلال، اس کے عز و کمال، اس کے حسن و جمال، اس کے مال و منال اور اس کے اوج و اقبال کا احاطہ کرنا، کس کے بس کی بات ہے؟

انا اعطینک الکوثر،

خیر کثیر دینے والا تو ہوا، اور دیا کیا گیا؟ بہت اور بہت ہی بہت "کوثر" اس کوثر کی تشریح

کون کرے، اور کن لفظوں میں کرے؟ ارباب شرح وتفسیر میں سے سب نے اپنے اپنے مذاق کی پیروی کی ہے. کوئی کہتا ہے کہ کوثر سے مراد جنت کی نہر کوثر اور محشر کا حوض کوثر ہے اور کسی نے لکھا ہے، کہ دوسرے انبیاء پر جو فضیلت وسربلندی دی گئی ہے، وہ اس سے مراد ہے. بے شک یہ سب کچھ ہوگا، لیکن لفظ کے مفہوم کی وسعت کو کیوں کر محدود کیجیے، اور کیوں نہ اُسے انہیں فراخیوں اور پہنائیوں کا حامل رہنے دیجیے جو بخشنے والے اور عطا کرنے والے کی شانِ یکتائی کے شایان ہے! اللہ اکبر! جن نعمتوں اور جن بخششوں کو بے تکان اور بے اندازہ بخشنے والا خود ''بہت'' اور ''بہت ہی بہت'' فرمائے، اُن کے رقبے کی پیمائش کے لیے انسان بے چارہ کوئی پیمانہ کہاں سے لائے؟ اہل سنت نے بہت ہاتھ پیر مارے کوثر کی شرح مختلف عنوانوں اور متعدد پیرایوں سے کی، بالآخر یہی کہتے بنا، کہ وما لایحصٰی من الخیر وہ اُن سب بھلائیوں پر شامل ہے جو شمار میں بھی نہیں آسکتیں، اب مراد کلام واضح اور مفہوم متکلم ظاہر ہے۔

یہ خبیث طعنہ زن ہیں کہ تیری نسل ختم ہورہی ہے اور تیرا سلسلہ منقطع ہورہا ہے! تیری نسل بھلا کبھی ختم ہونے والی اور تیرا سلسلہ کبھی قطع ہونے والا ہے؟ دنیا میں تیرے نام کی وہ عزت ہوگی، جو نہ آج تک کسی بندہ کی ہوئی، نہ آئندہ ہوگی. اونچے اونچے میناروں سے تیرا نام، ہمارے نام کے ساتھ پکارا جائے گا، دشت وجبل، صحرا ودریا، بحر وبر، شہروں اور دیہاتوں آبادیوں اور ویرانوں، سمندروں اور پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں سب کہیں تیرے نام کی منادی ہوگی، حجاز وعراق، یمن وشام، حبش ومصر، ایران وتوران، بخارا وہندوستان، چین وجاپان، روس وافغانستان، جرمنی وانگلستان، فرانس وامریکہ، دنیا کا گوشہ گوشہ اور ہماری وسیع زمین کا چپہ چپہ تیرے نام کی پکار سے گونجے گا، ذرّہ ذرّہ تیرے کام کی عظمت کی گواہی دے گا، اور تیرا نام اُن اُن کانوں تک پہنچے گا، جو سوا تیرے ہر دوسرے ہادی کے نام سے ناآشنا ہوں گے! آج تو ان کور بصروں کی نگاہ میں حقیر ہے، کل تو ہی بلند کیا جائے گا، کل تیری ہی عزت ہوگی، اور اُس وقت ہوگی جب سب کی عزتیں پامال اور سب کی شہرتیں خاک میں مل چکی ہوں گی. جو اپنی شامت سے تجھے مانیں گے نہیں، وہ بھی کم از کم جان

ضرور لیں گے۔

(ص:۳۷)

دو راستے

مکہ کی سرزمین جو توحید کے منادی پر تنگ ہو چکی تھی، اب اُسی بے بس و بے کس یتیم کے جاہ و جلال، فتح و اقبال کے سامنے اپنی ساری وسعتوں اور پہنائیوں کے ساتھ پیش ہوئی، اور خانۂ کعبہ کا دروازہ اسی ہجرت کر جانے والے پردیسی کے ہاتھوں، نہیں بلکہ اس کے خادموں اور خدمت گزاروں کے ہاتھوں، کھل کر رہا۔ جس اللہ کا نام زبان پر لانا منع تھا، اب اُسی کی بڑائی کی پکار عرب کے گوشہ گوشہ میں گونجی، اور اس کے جس بندہ کو مکہ نے حقیر جانا اور طائف نے جس پر تمسخر کیا تھا، اس کی سچائی اور عظمت کی شہادت دینے پر اب مکہ و طائف، نجد و حجاز، یمن و عمان، دشت و جبل کے پیر و جوان، زن و مرد، غول کے غول، خیل کے خیل، جھپٹ جھپٹ کر آگے بڑھنے لگے! جس مجبور و بے کس کو، اپنا عزیز و محبوب وطن، بالفاظ کہن، راتوں رات، صرف ایک رفیق طریق کی معیت میں چھوڑنا پڑا تھا، وہ اس شہر میں، جس کے در و دیوار تک اس کی عداوت کا عہد کر چکے تھے، اس کے آٹھویں ہی برس، اس شان سے داخل ہوا کہ دس ہزار آہن پوش جاں باز اس کے جلو میں تھے۔ چند سال کے اندر دیکھتے دیکھتے دنیا کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ اب راج تھا، تو مکہ کے اسی امی کا، اور جیت تھی، تو بنی ہاشم کے اسی یتیم کی، ابوجہل کی فخاری، عتبہ کی سرداری، ابولہب کی ریاست، سب نسیا منسیا ہو چکی تھی اور عاص بن وائل، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ کے بھائی اور بھتیجے بیٹے اور پوتے، اگر کہیں تھے، تو اس آرزو و تمنا میں دوڑتے ہوئے، کہ اللہ کے رسول کی رکابوں کو چومیں، اور خاکِ پا کو آنکھوں سے لگائیں!

دنیا جب فتحمند ہوتی ہے، تو عام طور پر کیا کرتی ہے؟ اچھلتی ہے، کودتی ہے، ناچتی ہے، گاتی ہے، باجہ بجاتی ہے، جشن مناتی ہے، کھاتی ہے، کھلاتی ہے، پیتی ہے، پلاتی ہے۔ یہ "فتح" جس طرح اپنی ذات میں بے نظیر تھی، اپنے ثمرات و عواقب کے لحاظ سے بھی بے نظیر رکھی گئی۔ حکم یہ نہیں ملتا کہ اس

فتح کی خوشی میں چراغاں کیا جائے، کوئی جلوس نکالا جائے، جلسے اور مظاہرے کر کر کے تجویزیں پاس کی جائیں، بلکہ ارشاد ہوتا ہے، کہ اے پیغمبر! اب دین کی تکمیل ہو چکی فسبح بحمد ربک و استغفرہ.

سبحان اللہ! کیا شانِ بے نیازی ہے، اور کس درجہ تکمیل عبدیت مقصود ہے! استغفار کا حکم اسے مل رہا ہے، جو خود دوسروں کی مغفرت کرائے گا، اور توبہ قبول ہونے کی بشارت اسے دی جا رہی ہے، جو معصوم ہی نہیں معصوموں کا سردار ہے، لیکن صلِ علیٰ. بندہ بھی کیسا تھا، اپنے مولا کا عاشقِ زار! حکم کی تعمیل مغا تو جس طرح کی ہوگی، اس کا حال اہلِ معنیٰ ہی جان سکتے ہیں لفظاً اس طرح کی، اٹھتے بیٹھتے، اور آتے جاتے، کوئی وقت ایسا نہ تھا، کہ زبان سبحان اللہ وبحمدہ کے ورد سے نا آشنا رہنے پائی ہو۔

ایک راستہ یہ تھا، حق پرستوں کا راستہ تھا، صرف "تھا" یہ صیغۂ ماضی نہیں "ہے" یہ صیغۂ حال بھی. جس طرح ہمیشہ کھلا ہوا تھا. آج بھی کھلا ہوا ہے. حق کی پرستش بیکار نہیں جاتی، اور راہ کی منزلیں کتنی ہی دشوار گزار، اور آزمائشیں کیسی ہی سخت ہوں، آخری فلاح و کامیابی حق پرستوں ہی کو ہو کر رہتی ہے. قرآن پاک واقعاتِ تاریخی کا رجسٹر نہیں، ہدایت و رہنمائی کا نسخہ ہے، دنیا کے سارے حق پرستاروں کے سردار کی سرگزشت سنا کر جتا دیا، راہِ حق پر چلنے والوں کے لئے یہ نقشۂ تقدیر ہے. پہلے "عسر" پھر "یسر" پہلے بے بسی و بے کسی، پھر قوت و عظمت، پہلے یتیمی و بے سامانی، پھر غلبہ و کامرانی. پہلے ہجرت، پھر فتح و نصرت، شرط صرف یہ ہے، کہ حرا کی غار نشینی نظر انداز نہ ہونے پائے، اور سخت سے سخت بے چارگی میں، لاتحزن ان اللہ معنا کہنے والے کی طرح "کسی" کی معیت کا سرشتہ تصور ہاتھ سے نہ چھوٹے! لیکن دنیا میں یہی ایک راستہ نہیں. ایک دوسرا راستہ ٹھیک اسی کے مقابل مادیت و خود پرستی کا ہے۔

ہر نور، اپنے مقابل ٹھیک اسی درجہ کی ظلمت کو چاہتا ہے. جو خیر محض نورِ مجسم بنا کر بھیجا گیا، اس کے مقابلہ پر، جو شر محض ظلمتِ مجسم بن کر اٹھا، وہ نسبتاً و قرابتاً کوئی غیر نہیں، اوروں سے بڑھ کر اپنا، یعنی اس داعی حق کا چچا ہے، ریاستِ مکہ کا رئیس ہے، صرف دنیوی ہی نہیں، بلکہ دینی بھی. اہل مکہ کا لیڈر ہے، اور خانۂ کعبہ کا متولی! اس کے جاہ و اثر، اقتدار و وجاہت کا کیا پوچھنا. ادھر صفا کے ٹیلہ پر

چڑھ کر پیمبرِ برحقؐ نے اپنے عزیزوں اور قریبوں کو اپنا پیام سنانا چاہا کہ اُدھر اس دشمنِ حق نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کوسا کہ ''اے محمد! تو ہلاک ہو، کیا تو نے ہمیں بس اسی کے لئے اکھٹا کیا تھا! اور اُس وقت سے یہ شیوہ ہو گیا کہ جدھر وہ حق کا راہبر اپنے وعظ و پند کے لئے رُخ کرتا ہوتا تھا، اسی طرف یہ ظالم بھی اپنی قوت و اقتدار کی پوری نمائش کے ساتھ سدِ راہ بن بن کر ساتھ ہوتا تھا۔ اب حق و باطل کا معرکہ شباب پر تھا، اور باطل اپنی تائید پر ساری ظاہری و مادی قوتوں کے اجتماع کے ساتھ غلبہ پاتا ہوا نظر آ رہا تھا، عین اس وقت جب کہ حق کی بے چارگی اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچی ہوئی تھی اور حق کے پرستار پر معلوم ہوتا تھا کہ زمین آسمان سب تنگ ہو چکے ہیں، اعلان ہوتا ہے کہ یہ جوشِ مخالفت اور آتشِ عداوت سے بھرا ہوا شخص، جو اپنے انجام کی تبّت یدا ابی لھب وتب کی مناسبت سے اسی دنیا میں ابولہب (شعلہ والا) کے نام سے مشہور ہو چکا ہے، ہلاک ہو گیا۔

پیش گوئی، کسی شاعر کا تخیل نہ تھا۔ کاتبِ تقدیر کا فرمان تھا۔ حرف حرف پورا ہو کر رہا۔ چند ہی سال کی مدت میں، آسمان کے نوریوں ہی نے نہیں، زمین کے خاکیوں نے بھی دیکھا، کہ یہ خوش اقبال رئیسِ مکہ و بلند بخت امیرِ قریش، اپنے ہر منصوبہ میں ناکام و نامراد، ہر طرح خائب و خاسر، اپنے کلبۂ احزان میں، ایک وبائی جلدی مرض میں مبتلا، رفیقوں اور دوستوں کی دلدہی، اور عزیزوں قریبوں کی تیمارداری سے محروم، تن تنہا بسترِ مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا ہے، اور مرنے کے بعد جب جسم بالکل سڑ جاتا ہے، اور عفونت دور دور پھیلنے لگتی ہے، تو حبشی لاشۂ بے کفن کو گھسیٹ کر ایک گڈھے میں ڈال آتے ہیں ۔۔۔۔۔ انجام عاجل یہ ہوا، اب انجام آجل کی بھی خبر سن لیجئے۔ دنیا یوں گئی، آخرت کو بھی جاتا ہوا اب دیکھ لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے، کہ ابھی ہوا ہی کیا ہے، یہ تو نمونہ تھا، اس ابدی حرماں سیصلٰی نارًا ذات لھب و امرأتہ حمّالۃ الحطب فی جیدھا حبل من مسد۔ اور دائمی خسران کا جو آگے پیش آ رہا ہے وہ وقت، جب اس بدنصیب کے اندر کی آگ اسے باہر سے بھی گھیر لے گی۔ اور اپنے نام کی طرح جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان یہ پھینکا جائے گا۔ اس کی جتھے مندیاں جب دنیا میں اسے نہ بچا سکیں، تو وہاں کیا کام آئیں گی۔

(ص:۳۹)

ورفعنا لک ذکرک

کروڑوں تو شاید، لیکن لکھو کھا بندے اللہ کے یقیناً ایسے ملیں گے، جو اپنی نجات اور اپنی عقبیٰ شیخ الہند عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات سے وابستہ سمجھ رہے ہیں، اور آج ہی نہیں، سیکڑوں برس سے سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ عقیدہ کی صحت و غلطی سے یہاں بحث نہیں، مقصود نفس واقعہ کا اظہار ہے، ان کی زبانوں پر نام ہے تو غوثِ اعظمؒ کا اور دلوں میں اعتقاد ہے تو محبوبِ سبحانیؒ کا لیکن ذرا سوچ کر بتایئے، کہ شیخؒ اور ان کے سارے پیش رَو اور پس رَو، حسن بصریؒ اور جنید بغدادیؒ، خواجہ اجمیریؒ اور سید احمد سرہندیؒ، نظام الدینؒ اور علاء الدین صابر کلیریؒ، نازاں کس شے پر ہیں؟ اپنی سروری وسرداری پر، یا عرب کے امی کی غلامی اور مکہ کے یتیم کی چاکری پر؟ اللہ اللہ! جو خود لاکھوں کے سردار اور کروڑوں کے پیشوا انہیں اگر فخر، ہے تو صرف اس کا کہ کسی آستانِ پاک کے جاروب کش ہیں اور بس!۔۔۔۔ دنیا میں اب تک بڑے بڑے جوگی اور رشی، راہب اور اہلِ ریاضت گزرے ہیں، یہ امتیاز اور یہ اعزاز کسی اور کے حصہ میں آیا ہے؟ کسی کے خادموں میں بھی ایسے ایسے آفتاب اور ماہتاب، اور وہ بھی اس کثرت سے ہوئے ہیں؟

امام بخاریؒ کے مرتبہ وعظمت سے کون ناواقف ہے؟ ان کی کاوش وتحقیق کی نظیر کسی ملک، کسی قوم میں ملتی ہے؟ پھر انہوں نے اور انھیں کی راہ پر دوسرے صدہا چلنے والوں نے، امام مسلمؒ نے، امام مالکؒ نے، امام ابوداؤدؒ نے، امام ترمذیؒ نے، امام نسائیؒ نے، اپنی ساری ساری عمریں کس شغل کی نذر کردیں؟ محض ایک امیؐ ہی کے اعمال واقوال کے جمع کرنے میں! اور عسقلانی اور عینی، قسطلانی اور طیبی، سخاوی اور شوکانی قاضی اور نووی اور ان جیسے سیکڑوں دوسروں نے اپنی زندگیوں کو کس چیز کے لیے وقف کر رکھا ہے؟ اسی امی کے اقوال کی شرح وتفسیر، اور اس کی جانب منسوب الفاظ کی تنقیح و تدقیق کے لیے! ابن جوزیؒ اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ اس پردۂ عالم پر ایک سے بڑھ ایک عالم وفاضل، حکیم وفلسفی، ادیب، مہندس پیدا ہو چکے ہیں، دنیا نے اب تک ان میں سے کسی کے ساتھ، اس کا

نصف بھی اعتناء کیا ہے؟ کسی افلاطون، کسی سقراط، کسی ارسطو، کسی نیوٹن، کسی کینٹ، کسی ڈارون کے اقوال وملفوظات اس کاوش کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں؟ کسی کا ایک ایک فقرہ ایک ایک قول، ایک ایک لفظ اتنی جرح اور ایسی ایسی موشگافیوں کے بعد، پاکوں کے واسطہ سے اور سچوں کی شہادت سے یوں سلسلہ بہ سلسلہ منقول ہو کر پہونچا ہے؟

ابن اسحاق اور ابن ہشام، سہیلی اور زرقانی، ابن سعد اور قاضی عیاض دمیاطی اور مغلطائی اور ان کے صدہا شاگردوں اور رفیقوں کے ضخیم مجلدات آپ کی نظر سے اگر نہیں گزرے نہ سہی، ان کے ناموں کی شہرت تو یقیناً آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہوگی. ان کا مشغلہ زندگی کیا رہا؟ یہ کاہے میں جئے اور کاہے میں مرے؟ اُسی امی معلمِ کائنات کی سیرت کا ایک ایک گوشہ محفوظ رکھنے میں، اس کی کتابِ زندگی کی ایک ایک سطر حفظ کرنے میں. اور محض یہی نہیں "روشن خیال" میور، اور "علم دوست" مارگولیس "تحقیق پسند" کارلائل اور "حقیقت طراز" ولہاوسن کو کس کے سوانح نویسوں کی صف میں شمار ہونے کی آرزو بیقرار کئے ہوئے ہے. دنیا میں بڑے بڑے گردن کش بادشاہ اور تاجدار ہو چکے ہیں، کسی کی سیرت، اس تحقیق اور اس جزئی تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں کہیں بھی ملے گی؟ کسی فرعون، کسی نپولین، کسی سکندر، کسی زار، کسی قیصر، کسی دارا، کسی فغفور، کسی سلطان، کسی مہاراجہ، کسی ہز مجسٹی کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا، ہنسنا، رونا، لیٹنا، بولنا، اس جامعیت، اس استقصاء، اس تاریخیت اور اس اہتمام کے ساتھ کاغذ کے نقوش پر آج تک منتقل ہو سکا ہے؟

امام ابوحنیفہؒ کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے. کون دل ہے جو آپ کی عظمت سے خالی ہے؟ آپ خود الگ رہے، ان کے شاگرد، بلکہ اُن کے شاگردوں کے شاگرد، اس پایہ کے تھے، کہ معاصرین نے انھیں امام وقت تسلیم کیا. لیکن خود یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ اور ان کے احباب ورفقاء وتلامذہ، سفیان ثوریؒ اور اوزاعیؒ اور ابو یوسفؒ اور محمدؒ، زفرؒ اور حسنؒ، حمادؒ اور مزنیؒ، طحاویؒ اور سرخسیؒ اور صدہا ہزارہا فقہاء، جواب تک ہو چکے ہیں، یہ آخر گروہ در گروہ، انبوہ در انبوہ، کرتے کیا رہے ہیں؟ اُسی اَن پڑھ کے لائے ہوئے قانون کی شرح وتفسیر، اور اُسی حرف ناشناس کی

بتائی ہوئی شریعت کے فروع کا حل اور جزئیات احکام کا استنباط، دنیا میں آخر اور بڑے بڑے امیر، وزیر، قانون ساز، قانون گر، مدبرین سلطنت گزرے ہیں، کیا ان میں سے کسی کو ایسے اور اتنے شارحین نصیب ہوئے ہیں؟ یونان، ہندوستان، مصر وغیرہ کو چھوڑیئے، روم کو لیجیے، کہ اُس کا ''رومن لا'' آج خدا معلوم کتنے دماغوں کو مرعوب کیے ہوئے ہے. جو بسط و وسعت اسلامی فقہ کو حاصل ہے. ''رومن لا'' غریب کو اس کا عشر عشیر بھی تو نصیب نہیں ہے۔

مثنوی شریف آج بھی کتنے دلوں کو مست کیے اور کتنی محفلوں کو گرمائے ہوئے ہے، یہ مولانا رومیؒ اور خواجہ حافظؒ، سعدی شیرازیؒ اور نظامی گنجویؒ، خسروؒ اور جامیؒ، سنائیؒ اور عطارؒ، صدیوں سے کس کے نام پر سر دُھن رہے ہیں؟ کس کے پیام کی ترجمانی کر رہے ہیں؟ کس بڑے کا سہارا پکڑ کر خود بھی بڑے بن چکے ہیں؟ وہی بادیہ عرب کا بوریہ نشین، جو شاید شعر موزوں پڑھ بھی نہیں سکتا تھا، اور جس کے لیے شاعری موجب فخر نہیں، باعث ننگ تھی. **وما علمّناه الشعر وما ينبغي له**. دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں نے آج تک کس کا اس طرح استقبال کیا ہے؟ کس بادشاہ کی شان میں اس عقیدت قلب کے ساتھ، اس ارادت وخلوص کے ساتھ، اس سوز وگداز کے ساتھ قصائد لکھے ہیں؟ کسے یوں بے تاب ہو ہو کر پکارا ہے؟ ہومرؔ کے، امراء القیسؔ کے، فردوسیؔ کے، والمیکؔ کے، شکسپیئرؔ کے، ملٹنؔ کے، گوئٹےؔ کے، کالیداس کے، کسی خطہ اور کسی زمانے کے شاعر کے نام کو، پیام کو، کلام کو، یہ مقبولیت، یہ مرتبہ، نہ سہی، اس کا آدھا، چوتھائی، دسواں حصہ نصیب ہوا ہے؟

عمر فاروقؓ اور علی مرتضیٰؓ کے نام سے کیسے کیسے سورماؤں کے کلیجے دہل دہل کر رہے، خالد سیف اللہؓ کی شمشیر اور ابن عاصؓ کی تدبیروں نے پتھروں کو پانی کر کے بہا دیا، لیکن یہ سب خود، کس شمع کے پروانے تھے؟ کس کے آستانہ پر جبیں سائی سے رفعتیں اور بلندیاں حاصل کرتے رہے؟ ہارون اور مامون، سلجوق اور ویلم، غزنوی وغوری، تیمور و بایزید، عثمان وسلیم، طارق وقاسم، لودی وخلجی، تیمور و بابر، ہمایون و جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب، کس کی خاک بوسی کو، سدا اپنے لیے معراج کمال اور وسیلۂ نجات سمجھے؟ دکن کا موجودہ سریر آرا کس کے اشتیاق وتمنا میں گرم آنسو بہاتا اور سرد آہیں

بھرتا رہتا ہے؟ بے سروسامان ریفیوں نے کس کے دین کی غیرت میں اسپین اور فرانس دو دو سلطنتوں کا چیلنج قبول کرلیا؟ انور نے کس کی امت کی خاطر جان تک نذر کردی، محمود الحسن کو کس کے نام کی عزت وناموس نے دَر دَر پھرایا؟ گھر سے بے گھر کرایا، نظر بند کرایا؟ محمد علی کس کی امت کے غم میں دیوانہ اور جلا وطن ہوا، نظر بند ہوا، جیل میں کئی کئی سال کاٹے؟ سب کے جواب میں ایک بار پھر اُسی عبداللہ کے لختِ جگر اور آمنہ کے نورِ نظر کا نام لیا جائے گا، یا کسی اور کا؟

غزالیؒ کی تصانیف پر خود انھیں رشک آ گیا ہے، جن پر ہم دن رات رشک کرتے رہتے ہیں. یہ غزالی اور ان کے آثارِ قدم پر چلنے والے شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ وغیرہم نے علم اسرار الدین اور معالجہ امراض نفسانی پر جو دفتر کے دفتر تیار کر دیے ہیں، ان کا حاصل اور لب لباب کیا ہے، بس اسی نبی امی کے لائے اور پھیلائے ہوئے دین کی حمایت ونصرت، اور اس کی تبلیغ وترویج. ابوالحسن اشعری اور ابوبکر باقلانی، رازی اور آمدی، نسفی اور جرجانی نے عقائد وکلام میں تصانیف کا جو انبار لگادیا، اور ان کے جانشین جس طرح ہر دور میں پیدا ہوتے رہے، یہاں تک آج چودھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی جو کام ہو رہا ہے، اس پایہ کا علم کلام کسی شخصیت کے اردگرد پیدا ہوسکا ہے؟ کون سی تاریخی ہستی اتنا زبردست اور اس قدر وسیع کلامی لٹریچر پیدا کرا سکی ہے؟

مفسرین کرام کے نام اور ان کے کارنامے کس پر روشن نہیں؟ تابعین میں ضحاک اور قتادہ، مجاہد اور ابن زید نے معانی قرآنی کی خدمت کی، اس کا صلہ کس کے امکان میں ہے. ابن جریر کے تیس مجلدات کو کون بھول سکتا ہے. ابن کثیر کی کاوش وجستجو کی داد کون دے سکتا ہے. بیضاوی وزمخشری کی قدر کس کے دل میں نہیں. بغوی اور نسفی ابن حبان اور ابوسعود نے اپنی عمریں کس کی خدمت کے لیے وقف کردیں. چشم تصور دیکھ رہی ہے، کہ یہ سب کے سب، اپنے مجلدات واسفار لیے ہوئے، ایک امی کی خدمت میں دست بستہ اس کی نگاہِ کرم کے منتظر کھڑے ہیں اور اُن کی بڑی سی بڑی آرزو ہے، تو یہ کہ اس کے قدموں پر نثار ہو جائیں!

نحو ولغت کی طرف آیئے، تو ایک سے بڑھ کر ایک امامِ فن نظر آئیں گے، ایسے کہ جن پر خود فن کو ناز ہے. کسائی اور ابوالاسود دوئلی، خلیل اور سیبویہ، ابن مالک اور ابن حاجب، ابن دریدہ وابن

میدہ، زمخشری ومطرزی، جوہری وفیروز آبادی، ابن منظور بیدی کسی نے صَرف پر لکھا اور کسی نے نحو پر، کسی نے لغت کو اپنا موضوع رکھا، لیکن ان تمام پردوں کے پیچھے، مقصود اصلی سب کا کیا رہا؟ وہی دین کی خدمت، امی کے لائے اور بتلائے ہوئے دین کی خدمت! کیا دنیا میں امیوں اور ان پڑھوں کو یہی مرتبے حاصل ہوا کرتے ہیں؟ امیّوں کو چھوڑیئے، جو زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے گزرے ہیں، کیا ان میں سے کسی کو بھی ایسے شارح، ایسے ایسے خادم نصیب ہوئے ہیں؟ معانی وبیان اور بدیع پر لکھنے والوں کی تعداد، اس فہرست پر مستزاد۔

سب سے آخر میں، فلسفیوں کو لیجیے، فلسفی بھی بھلا کسی کے ہوئے ہیں؟ لیکن یہاں کیا ہے کہ ابن سینا وابن رشد، طوسی وفارابی، رازی وشیرازی، سب کے سب اُسی زلف کے اسیر، سب کی عقیدتوں کے دامن، امی کے بندِ نعلین سے وابستہ! کتنے علوم وفنون کے نام گنائے جائیں؟ زندگی کے کن کن شعبوں کو روشنی میں لایا جائے؟ قوت اور صولت کے کن کن پہلوؤں کو شمار کیا جائے؟ سرداروں اور ناموروں کے نام، شہادت میں کہاں تک پیش کئے جائیں، کہ

جملہ ترکانِ جہاں ہندوے تو!

مصر کے جامع ازہر اور آزاد اسلامی ممالک کے مدرسوں کو چھوڑیئے، غلام اور بے نوا ہندوستان میں، جہاں عربی کے سکہ کا چلن کسی بازار میں بھی نہیں، یہ آخر ندوہ اور دیوبند کے سے عظیم الشان مدارس کس کے نام لیے ہوئے چل رہے ہیں؟ جامعہ ملیہ کس کی امت کی خدمت کی خاطر زندہ ہے؟ علیگڈھ، آزادیوں کے دعوے کے باوجود، کس کے دین وآئین کی پابندیوں پر نازاں ہے؟

بلندیِ ذکر کی یہ وہ تفسیر ہے، جو اوراق لیل ونہار پر ساڑھے تیرہ سو برس سے ثبت چلی آرہی ہے، چشمِ روزگار اسے صدیوں سے پڑھتی چلی آرہی ہے، اور خدا معلوم کب تک اسی طرح پڑھتی رہے گی! حشر کے دن عنداللہ، اس بندہ کا جو مرتبہ ہوگا، وہ تو ہوہی گا، اس سے قطعِ نظر کرکے، ذرا صرف اس مرتبہ کا تصور کیجیے، جو محض اس بلندی ذکر کے لحاظ سے اس روز حاصل ہوگا فوج کی فوج، انبوہ در انبوہ، اِدھر سے ملوک وسلاطین چلے آرہے ہیں، اُدھر سے بڑے سے بڑے نامور جنرل اور سپہ سالار. ایک طرف سے محدثین کرام جوق جوق چلے آرہے. اور دوسری طرف سے مفسرین عظام، اہلِ فقہ، اہلِ

اصول، اہلِ تصوف، اہلِ لغت، اہلِ سیر، اہلِ رجال، اہلِ نحو، اہلِ معانی، اہلِ بیان، اہلِ فلسفہ، اہلِ منطق، اہلِ اخلاق، جس فن کو بھی لیجیے اس کے ائمہ و ماہرین، اَدب سے آنکھیں نیچی کیے ہوئے، ہاتھ باندھے ہوئے خادمانہ انداز سے گرد و پیش حلقہ کیے ہوئے ہیں! ایک اسی انعام کی پوری وسعت کا تصور کس کے بس کی بات ہے؟

(ص:۵۹)

محبوب سے خطاب

اللہ کے بندے کو مجبور کیا گیا، کہ قیامِ شب کی عادت کو دو یا تین راتوں کے لیے ترک کردے. ظالموں کو اس پر بس نہیں ہوتا، بلکہ ایک شب شیطانی عورت، جو رشتہ میں چچی بھی ہوتی ہے، آتی ہے، اور کہتی ہے کہ ''بھتیجے! معلوم ہوتا ہے، تیرے شیطان نے اب تجھے تعلیم دینا چھوڑ دی''. (العیاذ باللہ) بندہ گو بہترین بندہ ہو پھر بھی بندہ ہے اور بشر، گو خیر البشر ہو، بہر حال بشر ہے، بندگی کا تقاضا، بشریت کا اقتضا، خیال قدرۃً یہ گزرا، کہ کہیں اس ذات نے جو ہمہ بے نیازی ہے، واقعتًا التفات ترک نہ کر دیا ہو!

یہ غم اسے پیدا ہوا، جو دنیا کو غم سے نجات پانے کا راستہ دکھانے آیا تھا. اِدھر اس فکر و غم کا پیدا ہونا تھا، کہ اُدھر عالم قدس میں جنبش پیدا ہوگئی. غم اگر بندہ کو ہوا تو بندہ کا مالک تو غم کے دور کرنے سے عاجز نہ تھا. اضطراب اگر پیکر خاک کو ہوا، تو تسکین کا نسخہ جان پاک سے تو کچھ دور نہ تھا، نورانیوں کے سردار، اور قدوسیوں کے پیشوا، جبرئیل امین خدمت سفارت پر مامور ہوتے ہیں، اور ہفت افلاک کی منزلیں طے کر کے تسلی و تشفی کا صحیفہ لے کر اسی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، کہ غم و اضطراب کی کیا بات ہے۔

والضحیٰ۔ دن نکل آیا. ہدایت و نورانیت کا آفتاب طلوع ہو چکا. بشارت ہو، کہ اُس آفتاب کی کرنیں پھوٹ چکیں، اس کا اُجالا گھر گھر پھیل چکا. وہ رب رحیم جو عالم کے جسمانی نشو و نما اور حیات مادی کی تکمیل کے لیے روز آنہ آفتاب کو چمکا تا رہتا ہے کیا انسان کی ربوبیت روحانی کے

لیے آفتاب ہدایت کی روشنی نہ پھیلاتا؟ پس ہر روز آفتاب کے اُجالے کا ظہور خود تیرے منبع نور وہدایت ہونے پر، تیری صداقت پر، اور تیری رسالت پر گواہ ہے، اور محض شعاعوں والا دن ہی نہیں، بلکہ سکون والی رات، وہ رات جس کا کام والـلـیـل اذا سـجیٰ سکون دینا ہوتا ہے. وقت کا وہ تاریک حصہ جس میں ساری جاندار مخلوق سکون وآرام لیتی ہے، وہ بھی تیری ہی سچائی کا ایک نشان ہے. جو حکیم مطلق جانداروں کے آرام وآسائش کے لیے یہ وقت نکالتا ہے، وہ انسان کی راحت اور روحانی سکون کا سامان نہ کرے گا؟

آفتاب کا ظہور اور رات کا سکون، بجائے خود اس کے گواہ ہیں، اور زبانِ حال سے مـا وَدّعک ربّک وما قلیٰ اس پر شہادت دے رہے ہیں، کہ اے خلق کے غمخوار، تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے، اور نہ وہ تجھ سے ناخوش ہے، یہ تیرے منکر اور تیرے حاسد اپنی بے بصری سے جو رائے تیرے متعلق چاہیں قائم کریں، مگر یہ کہیں ممکن ہے، کہ جس نے تجھے خلعتِ رسالت سے سرفراز کیا ہے، وہ تجھے چھوڑ دے، یا تجھ سے ناخوش ہو جائے! وہ تیرا ''رب'' ہے، اس کی نسبتِ ربوبیت کا تو عین تقاضا ہے، کہ وہ تیری تربیت کرتا رہے، اور جس غرض سے اُس نے تجھے اپنا پیامبر بنا کر بھیجا ہے، اس کی تکمیل کے لیے لازمی ہے، کہ وہ تیرے اوپر اپنی مسلسل وغیر منقطع رحمتوں کی بارش جاری رکھے، نافہموں نے یہ کہنا شروع کیا ہے، کہ تیرے پروردگار نے تجھے چھوڑ دیا ہے، اور تجھ سے ناخوش ہو گیا ہے. چھوڑنا اور ناخوش ہونا تو الگ رہا، تیرے رب کی تو تیرے حال پر اس درجہ شفقت ومرحمت ہے، کہ وللاٰخرۃ خیر لک من الاولیٰ تیرے لیے تو ترقی ہی ترقی ہے، تیری آخرت تیری دنیا سے کہیں بڑھ کر، اور تیری ہر پچھلی حالت تیری ہر پہلی حالت سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہے گی، آخرت کا حال جب معلوم ہوگا، لیکن اسی دنیا میں فتح ونصرت تو تجھے ابھی حاصل ہوتی ہے. آج جو تجھے ذلیل وخوار کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، کل وہ خود ذلیل وخوار ہوں گے. آج جو تجھے ستانا چاہتے ہیں کل وہ خود اُس مادی دنیا میں مٹ کر رہیں گے. مکہ تیرا ہوگا، مدینہ تیرا ہوگا، طائف کا سبزہ زار تیرا کلمہ پڑھے گا، خیبر کا قلعہ تیرے سپاہیوں کے نعرۂ تکبیر سے گونجے گا. تیرا جاہ وجلال ہر لحظہ، ہر آن ترقی

کرے گا، اور تو ہی اپنی بے چارگی و بے سروسامانی کے ساتھ سارے ساز وسامان والوں، سارے قوت وجبروت والوں پر غالب ہوکر رہے گا، یہ بد بخت اور کور باطن تجھے ہماری رحمت اور ہمارے قرب سے دور سمجھ رہے ہیں، تو تو ہم سے اتنا نزدیک، اور ہمیں اتنا عزیز، اتنا محبوب، اتنا پیارا ہے، کہ ہماری رضا عین تیری رضا ہے. تجھ پر ہمارے لطف وکرم کی اس درجہ بارش ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ ہے، کہ تو خود ہمارے الطافِ بیکراں سے سیر اور مطمئن ہوجائے گا، تیری طبیعت خود ہمارے عطایائے پیہم سے آسودہ ہوجائے گی تو جو مانگے گا ملے گا. تیری جو خوشی ہوگی پوری ہوگی. یہاں بھی اور وہاں بھی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آج بھی اور کل بھی. یہ عطائیں اور بخششیں تیرے ''رب'' کی طرف سے ہوں گی. اس کی ربوبیت تجھے پورے منتہائے کمال تک پہونچا کر رہے گی اور کمالات میں دنیا کے کمالات بھی شامل ہیں. اور آخرت کے بھی ''آج'' عطاء وبخشش کا مشاہدہ یوں ہوگا، کہ تیرے گِنے چُنے مفلس مرید اور فاقہ مست شاگرد اپنے سے دس گنے اور بیس گنے سورماؤں پر، بڑے بڑے جتھے اور سرمایہ والے سرداروں پر غالب آئیں گے. مکہ کو فتح کریں گے، مدینہ پر حکومت کریں گے، یمن کو زیر کریں گے، عراق پر اپنا علم نصب کریں گے، مصر کو اپنا کلمہ پڑھائیں گے قیصر کے قصر جہانداری کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، ایران کے پایۂ تخت کو ہلا کر رکھ دیں گے، اور ''کل'' تیرے کمالات کا ظہور اس رنگ میں ہوگا کہ اس وقت ابرار واخیار لرزاں وترساں ہوں گے، جس دم بڑے سے بڑے مقربین اپنے لیے تھرا رہے ہوں گے، جس گھڑی موسیٰ کلیم وعیسیٰ مسیح تک کی زبانوں پر نفسی نفسی ہوگا. اُس آن اور اس گھڑی لوائے حمد تیرے ہی ہاتھ میں ہوگا، اس وقت تیری ہی سنی جائے گی اس وقت تیری ہی مانی جائے گی۔

اور یہ وعدے اور یہ بشارتیں تو خیر آئندہ کے لیے ہیں، انھیں دیکھنے کے لیے پھر بھی کسی قدر پیش بینی اور نورِ بصیرت کی ضرورت ہے، یہ منکر اور حاسد تو اتنے اندھے ہیں، اور بصارت سے اس حد تک محروم ہوچکے ہیں، کہ اب تک جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا ہے، وہ بھی انھیں نہیں سوجھ پڑتا! اب تک اے پیمبر، جو معاملہ تیرے ساتھ رہا ہے، وہ بجز محبوبوں کے کسی اور کے

ساتھ بھی رہ سکتا ہے؟ کیا ان بے بصروں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس الم یجدک یتیما فاٰوی، عالم ناسوت میں تیری آمد کس بے کسی اور کیسی بے چارگی کی فضا میں ہوئی تھی؟ دنیا بھر میں تعلیم وتربیت پرورش وپرداخت کا اصلی ذریعہ باپ ہوتا ہے. تیرے پیدا ہوتے ہی تیرے لیے یہ سہارا توڑ دیا گیا تھا. باپ کے بعد پھر بے غرض خدمت کرنے والی ہستی ماں کی ہوتی ہے چند ہی روز بعد تجھے اس کی آغوش سے بھی جدا کر دیا گیا تھا. لے دے کے ایک سہارا دادا جان کا تھا، لیکن قبل اس کے، کہ تیرا بچپن ختم ہو، یہ سایہ بھی تیرے سر سے اٹھالیا! اب تو تھا اور تیری یتیمی، تو تھا اور تیری بے کسی! نہ گھرانا کوئی خوشحال، نہ تعلیم وتربیت کا کوئی سامان! پھر آخر بجز ہماری ربوبیت کے کس نے تیرا ہاتھ پکڑا ہے، بجز ہماری رحمتِ کاملہ کے کس نے تیری دست گیری کی؟ کس نے تیرے سر پر ہاتھ رکھا؟ کس نے تجھے ہر خطرہ سے بچایا؟ کس نے قدم قدم پر تیری حفاظت کی؟ کس نے تیری صورت، تیری سیرت، تیری صحت اور تیرے اخلاق کو ایسا سنوارا کہ تیرے ظاہر پر شہزادے اور امیر زادے، تیرے باطن پر حکماء ودرویش رشک کرنے لگے؟ دشمنوں سے کس نے بچایا؟ ابولہب کی تلوار اور ابوجہل کے نیزے کو کس نے تجھ سے دور رکھا؟ پھر یہی نہیں بلکہ تو بے تعلیم اور حرف ناشناس ووجدک ضالاً فھدیٰ، جو خدمت خلق کی دُھن میں، راہ نجات کی تلاش میں تزکیۂ باطن کے فراق میں، غافل وبے خبر اِدھر سے اُدھر سرگرداں پھرا کرتا تھا، کس نے تجھے بغیر کسی درس گاہ وکتب خانہ کی مدد کے، بغیر کسی مرشد واستاد کی وساطت کے اپنی صاف اور روشن راہ دکھادی؟ کس نے علوم لدنی کے صحیفے تیرے لیے کھول دیے؟ کس نے تیرے قلب کا پردہ روشن کر دیا تھا جو اگلوں اور پچھلوں میں سے کسی پر روشن نہیں ہوا تھا؟ یہ اگر ہماری ربوبیت کاملہ کا کرشمہ نہیں، تو اور کیا ہو سکتا تھا؟ اور اسی طرح تو جو ہر طرح محتاج تھا؟ تجھے تونگر ومستغنی کس نے بنادیا؟ کیا بجز ہماری رحمت کاملہ وربوبیتِ مطلقہ کے ووجدک عائلا فاغنیٰ کوئی اور شے، جس نے خدیجہ کی خوشحالی میں تجھے شریک بنادیا، جس نے متمول صحابہ مہاجرین کی دولتیں تیری نذر کرادیں؟ تیرا قلب تڑپ رہا تھا کہ دنیا میں توحید باری کیوں کر قائم کی جائے، تیرے قلب کو اس کے دلائل سے بھر دیا گیا، تیرے نفس کے فقر کو غنا سے تبدیل کر دیا گیا، تو خود اپنی مغفرت

ونجات کی فکر میں تھا، ہم نے تجھے خود تیری ہی نجات کی طرف سے بے فکر نہیں کر دیا، بلکہ اعلان عام کر دیا، کہ جو بھی تیرا وسیلہ تلاش کرے گا؟ جو تیرے نام کا سہارا پکڑ کے آئے گا، اس کے لیے نجات ہی نجات ہے، کہاں ابھی خود اپنے لیے راہ تلاش کر رہا تھا، اور کہاں ابھی رہبر و رہنما ہی نہیں، بلکہ دنیا جہاں کے رہبروں کا سردار اور رہنماؤں کا پیشوا بنا دیا گیا! یہ معاملات اگر خاص محبوبوں کے ساتھ نہیں تو کیا کسی اور کے ساتھ ہو سکتے ہیں؟ بے بصروں منکروں اور حاسدوں کو، مستقبل نہ سہی، ماضی میں بھی تیرے مرتبہ قرب کی یہ کھلی ہوئی نشانیاں نہ دکھائی پڑیں؟

یہ مرتبۂ محبوب سارے عالم کے محبوبوں میں سے کسی کو حاصل ہوا ہے؟ پھر یہ مراتب محبوبیت اب بھی ختم نہیں ہوتے، محبوب کی ذات ہی نہیں، ان کی ایک ایک صفت محبوب ہوتی ہے. ان کا ایک ایک وصف، محبت کی کائنات میں کیا کچھ درجہ رکھتا ہے! تو ''یتیم'' تھا، لے آج سے ہم کو خود یہ صفتِ یتیمی **فاما الیتیم فلا تقھر** محبوب بن گئی ہے، آج سے کسی یتیم کے ساتھ سختی، بدسلوکی، بد مہری، بے اعتنائی ہمیں گوارا نہیں. جو یتیم سے بے مہری کرے گا، خود اس کے ساتھ بے مہری کی جائے گی، جو یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ نہ پھیرے گا، وہ خود شفقت و رحمت سے محروم رہے گا، جس کے دل میں یتیم کا درد نہ ہوگا، اس بے درد کے ساتھ بھی دردمندی نہ برتی جائے گی. یہ اعلان کتاب میں ہمیشہ کے لیے کیا جا رہا ہے. ہماری کتاب یتیمی کی قدر و منزلت کی گواہ رہے گی، اور ہمارا دین یتیموں کے حقوق کا محافظ ہوگا! تو بہت دنوں تک راہ کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا، تو بہت روز تک اپنی تشفی کے لیے سائل بنا رہا، تو بہت زمانہ بہ حیثیت سوالی کے بسر کیا، اس کی یادگار و **اما السائل فلا تنھر** میں یہ اعلان عام کیا جاتا ہے، کہ سائل کی عزت کے ہم نگراں ہیں. سوال کرنے والا ہرگز سختی و درشتی کے برتاؤ کا مستحق نہیں. بلکہ نرمی، آشتی و شیریں زبان اس کا حق ہے، اور راہِ ہدایت کا سرگرداں، حق کی راہ میں ہر نکلنے والا، علم صحیح کی تلاش میں ہر قدم رکھنے والا اس کا مستحق ہے، کہ اس کی تشفی کی جائے. آج سے ہماری آسمانی کتاب زمین والوں کو حکم دیتی ہے کہ سوالی کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آئیں. آخر ہر سائل کو عرب کے ''سائل'' اعظم سے کچھ نسبت و مناسبت تو بہر حال حاصل ہے، اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ ہم نے تجھے محتاج اور بدرجۂ غایت محتاج پایا تھا جس درجہ کی یہ محتاجی تھی، اسی درجہ کا غنا، ہم نے اپنی عطا و بخشش سے مرحمت فرمایا، و اما بنعمة ربک فحدث اس دولت کا نام، دولت نبوت وقرآن ہے. ہماری یہ نعمت چھپا کر رکھنے کی نہیں، خوب لٹانے اور تقسیم کرنے کی ہے. بس جہاں تک ممکن ہو، اس دولت کو لٹاؤ، اس نعمت کا فیض عام جاری کرو، اور اس چشمۂ رحمت سے ایک ایک کو مستفیض کرتے رہو۔

مکہ کے بے بس و بے کس یتیم، غارِ حرا میں مراقبہ کرنے والے گوشہ نشین! دیکھ لی تیرے مرتبہ کی بلندی دیکھ لی. تیری شان محبوبیت کا نظارہ کرلیا! خادموں اور غلاموں ہی نے نہیں، منکروں اور حاسدوں بد باطنوں، اور کور چشموں تک نے تیرے آفتاب اقبال کی چمک دمک دیکھ لی، جو تجھ سے ٹکرایا، مٹادیا گیا توڑ دیا گیا، پاش پاش کر دیا گیا! جو تیرے سامنے جھکا، نوازا گیا، سرفراز ہوا، اپنی مراد کو پہونچا. ابوجہل اور فرزند خطاب، دونوں تیرے حق میں یکساں تھے. ابوجہل نے تجھ سے دشمنی کی، اپنے آپ سے دشمنی کرلی! عقل و دانش نیک نامی و اقبال مندی، آفتاب و ماہتاب، زمین و آسمان سب اس کے دشمن ہو گئے! فرزند خطاب نے اپنا سر تیرے آگے جھکا دیا، سب اس کے آگے جھک گئے. خزانے جھکے، فوج و لشکر جھکے، اقبال و حشم جھکا، ناموری و اقبال مندی جھکی، شام و ایران، مصر و عراق کے تخت و تاج جھکے، ایک عالم کا عالم صولتِ فاروقی کے آگے جھک گیا۔

(ص:۷۹)

صابر رسول

مظلومیت و غربت، بے کسی اور بے بسی، ہم پر، آج کسی درجہ میں طاری ہو، اسوۂ محمدی سے بڑھ کر کون اسوہ ملے گا. تسکین و تسلی کے لیے اس ذات کے سوا اور کہاں سامان نظر آئے گا؟ لیکن فراغت و غلبہ کے وقت بھی کیا اس کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے پائے گا؟ اچھا تو یہ بتاؤ کہ سرداری و فتحمندی کی حالت میں کبھی اس سردار کے قدم نے عبدیت کے حدود سے ذرا بھی تجاوز کیا ہے؟ انتہائی مشغولیت میں بھی کبھی غفلت طاری ہوئی ہے؟ بڑی سے بڑی جنگ اور معرکہ آرائی کے وقت رسد کا

سامان، اور روپیہ کا انتظام، گھوڑوں کی فراہمی اور ہتھیاروں کی خریداری، میدانِ جنگ کا انتخاب اور صفوفِ لشکر کی ترتیب کوچ کا حکم اور قیام کا ارشاد، فوجوں کا لڑانا، صلح کے شرائط طے کرنا، مالِ غنیمت کی تقسیم اور ملوک وسلاطین سے نامہ وپیام یہ سارے کام جن کے لیے آج بیسیوں ماہرینِ خصوصی کی ضرورت ہوتی ہے، کمسریٹ والوں انجینیروں کی، جنرل اور مدبر کی، خدمات بنفس نفیس ہی انجام دیتے تھے، اور ممکن نہ تھا کہ ان میں پڑ کر کسی وقت کی نماز رہ جائے معمولات عبادات میں فرق آجائے۔ پھر آج کسی کے مشاغل کیا ان سے زائد ہو سکتے ہیں؟ کسی کی مشغول زندگی اس کے مقابل لانی ممکن ہے؟

جنگ کی حالت کو چھوڑیئے، امن کا زمانہ لیجئے۔ ابھی طائف مسلمان ہو رہا ہے، ابھی یمن کے اسلام کی خوشخبری آرہی ہے، ابھی بحرین اسلام قبول کر رہا ہے، ابھی عمان طاعت قبول کر رہا ہے، ابھی مزنیہ کا وفد آرہا ہے، ابھی بنو تمیم کی سفارت پہونچ رہی ہے، ابھی قیصر وکسریٰ کے نام خطوط روانہ ہو رہے ہیں، ابھی شاہِ مصر کو دعوتِ اسلام بھیجی جارہی ہے، فلاں قبیلہ پر جزیہ کی تشخیص ہو رہی ہے، فلاں نومسلم آبادی پر زکوٰۃ کی تعیین کی جارہی ہے، اِدھر دعات ومؤذنین کا تقرر ہو رہا ہے، اُدھر مختلف شہروں اور صوبوں کے لئے حکام وولات مقرر کیے جارہے ہیں، ابھی غیر ممالک کے قاصدوں سے گفتگو ہو رہی ہے، اور ساتھ ہی احتساب کا کام بھی جاری ہے، اور تسبیح وتہلیل میں فرق آنے پاتا ہے، نہ شب بیداری وتہجد گزاری میں، وہی مناجات اور گریہ وزاری کے ساتھ عبادتیں، اور وہی راتوں کو کھڑے ہو ہو کر اتنا قرآن پڑھنا کہ پائے مبارک پر ورم ہو ہو آئے! آج ذرا سی بھی مشغولیت کسی کو پیش آجاتی ہے تو جھٹ نوافل کیا معنیٰ، فرائض تک کے ترک کا حیلہ ہاتھ آجاتا ہے، اور ادھر یہ نظیر موجود ہے، کہ اس بے حد وحساب مشغولیت کے باوجود تعلق مع اللہ کے آثارِ ظاہری میں سرِ مو فرق نہیں۔ جنگ ہو یا صلح، فوجی خدمات ہوں یا ملکی مناصب، زمینداری ہو یا ریاست، کاشتکاری ہو یا تجارت، کلکٹری ہو یا ججی، منسٹری ہو یا گورنری، انسانی زندگی کا کون سا رُخ ایسا ہے، جس کے لئے، وہ آفتابِ ہدایت دلیلِ راہ نہیں؟

یتیمی کے داغ سے بڑھ کر اور کون داغ ہوسکتا ہے. اس وقت سے بڑھ کر کسی اور بے چارگی کا اور کون سا وقت ہوتا ہے؟ آج ساری دنیا کے بے کس بیچارے، یتیموں کو خوشخبری ہو کہ جس نے ساری دنیا کے یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھا، وہ خود یتیم ہی ہو کر دنیا میں آیا. اور یتیمی بھی کس غضب کی، عمر کے دس سال پر نہیں، پانچ سال پر نہیں، والد کی شکل سرے سے دیکھی ہی نہیں. اور باپ کی محبت کی محبت کو ایک لمحہ کے لئے بھی جانا ہی نہیں! جب دنیا میں تشریف لائے تو باپ پہلے ہی واپس بلا لئے گئے تھے. رہیں والدہ ماجدہ، سو وہ بھی پانچ سال سے زائد اپنی آنکھوں کے تارے، اور عالم کے آفتاب کا نظارہ نہ کرسکیں! یتیم کا اطلاق تو اس پر ہونے لگتا ہے جس کا صرف باپ زندہ نہ ہو. یہاں شروع سے بے پدری، اور شعور پیدا ہوتے ہی بے مادری، ایک ساتھ یتیمی و یسیری! دنیا جہاں کے یتیمو! اپنے حال پر رونے اور کڑھنے کی جگہ خوش اور نازاں ہو، کہ کس کی صف میں کھڑے ہوئے ہو۔

بیوی کسی کی ایک ہوتی ہے، تو اس کے پورے ادائے حقوق اور اس کے ساتھ ہمیشہ لطف و موافقت مشکل رہتا ہے، چہ جائے کہ جس کی ایک وقت میں دو دو نہیں، تین تین نہیں، اکھٹی نو نو بیویاں ہوں! ان سب کے ساتھ بہ حسنِ معاشرت نباہ کرنا معمولی بشر کا کام تھا! عقل کے اندھے کہتے ہیں، کہ یہ ایک صورت عیش پرستی کی تھی. خدائے واحد کی قسم! یہ صورت انتہائی مجاہدہ اور نفس کشی کی تھی. بیویاں بھی جنت کی حوریں یا فرشتہ بنا کر بھیجی نہیں گئی تھیں، یہی انسانی اجسام ان کے تھے، یہی کھانے پینے کی خواہشیں اور یہی پہننے اور اوڑھنے کی ضرورتیں، یہی قلوب کے اندر رقابت کی چشمکیں باہم چلتیں، باتیں بڑھتیں، اور ملال و تکدر حضورؐ کے قلب مبارک تک پہونچتا. کاشانہ مبارک میں جو بے سروسامانی تھی ظاہر ہے. صراحت کے ساتھ ان بیویوں کو علیحدگی کا اختیار دیا گیا. سب کی سب اس درجہ والہ و شیدا تھیں کہ کسی ایک نے بھی اختیار سے فائدہ اٹھانا گوارا نہیں کیا. بیوی بچوں کے جنجال میں پھنسے ہوئے امتی، کیا کوئی سبق نہیں لے سکتے؟

غرض اجتماعی و انفرادی، قومی و معاشرتی، خانگی و شخصی، کوئی بھی ممکن پہلو انسانی زندگی کا لیجیے، غم و الم کی جیتی جاگتی صورتیں انسان کو کسی شعبۂ حیات میں پیش آسکتی ہیں، انھیں فرض

کیجیے۔ ہر درد کا درماں، ہر زخم کا مرہم، ہر حادثہ کے لیے تعزیت اگر ملے گی تو اسی دار الشفاء محمدی کے اندر۔

(ص:۹۷)

مناقب کی جامعیت

دنیا میں اب تک جتنے مصلح اور بزرگ پیدا ہوئے ہیں۔ سب نے اسی سہ گانہ نفسی زندگی کی کسی ایک ہی صنف یا شاخ تک اپنی اصلاحوں کا دائرہ محدود رکھا ہے، کوئی وجودِ باری پر بہتر سے بہتر عقلی دلائل قائم کر گئے، معرفتِ الٰہی کے دقیق اسرار کھول گئے، رموزِ الٰہیات کی بہترین شروحات لکھ گئے، کوئی ایسے آئے، جو اپنے کلام کی شیرینی، زندگی کی سادگی، اور پیام کی تاثیر سے دلوں کو موہ گئے، بزم کائنات کے جذبات کو بے خود و بے قرار کر گئے، محفل گیتی کے احساسات سوز و گداز سے گرما گئے، اور کوئی ایسے بھی گزرے، جنھوں نے اپنی ہمتوں کا ہدف بجائے دل و دماغ کے جسموں کو رکھا، اپنی زبردست قوتِ ارادی کی فوجوں کے ساتھ باطل کو ہر معرکہ میں شکست دی، اور جو اپنی بے پناہ قوتِ عملی کی شمشیر زنی کا نشان رزمگاہِ عالم کے چپہ چپہ پر ثبت کر گئے، لیکن وہ بے نظیر ہستی، جو معرکۂ بدر میں سپہ سالار بھی ہو، اور بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ کر صبر کرنے والی بھی ہو، جو ایک کامیاب و معاملہ فہم تاجر بھی ہو، اور ساری ساری رات عبادت کے لئے کھڑے ہو کر کاٹ دینے والا بھی ہو، جو ناصح بھی ہو، اور زندہ دل بھی، جو فقر و توکل کا بوریہ نشین بھی ہو، اور آئینِ جہاں بانی کا معلم بھی، جو علم و حکمت کا درس بھی دیتا ہو، اور عشق و محبت کے گُر بھی سکھاتا ہو، جو ایک ہی وقت میں عقل و فہم کی درسگاہ کا استاد بھی ہو، جذبات کے چمن کا سب سے زیادہ لطیف، شاداب اور سدا بہار پھول بھی ہو، اور سعی و ارادہ کے میدان میں سب کا سردار بھی ہو، ایسی جامع اور لاشریک لہٗ ہستی تو صرف اسی مصلحِ اعظم کی ہوئی ہے، جس کی تصدیق کسی وقتی معجزہ اور ہنگامی کرامت پر منحصر نہیں، بلکہ جس کی سچائی پر (نٓ والقلم وما یسطرون) دوات اور قلم، اور ان کے لکھے ہوئے دفتر، علوم و فنون کی خاموش زبانیں ہمیشہ کے لئے گواہِ ناطق رہیں گی۔

(ص:۱۲۷)

اسوۂ حسنہ

بزمِ کائنات اپنی ساری دلفریب زینتوں، اور دلکش آرائشوں کے ساتھ سج چکی، طلسم خانۂ فطرت اپنی تمام رونقوں اور نیرنگیوں کے ساتھ تیار ہو چکا، نگارخانۂ موجودات کا ایک ایک نقش آب و رنگ کی جگمگاہٹ سے چمک اٹھا، اس وقت ما کان و مایکون کا سب سے زیادہ بے بہا، سب سے زیادہ عزیز الوجود گوہر "امانتِ الٰہی" کے نام سے کثرت کے بازار میں پیش ہوا، اور وحدت کے جلوت کدہ سے آواز آئی کہ "ہے کوئی جو اس گوہر شرف کا حامل بن سکے؟ ہے کوئی جو اس بارِ امانت کو اٹھا سکے؟ عالمِ ملکوت میں سناٹا چھا گیا، عالمِ ناسوت پر لرزہ پڑ گیا، پہاڑ تھرتھرائے، سمندر کی موجیں رک گئیں، ماہتاب ماند پڑ گیا، آفتاب کی ہمت نے جواب دے دیا، اونچے آسمان نے اپنے دوش ناتواں کو اس کا اہل نہ پا کر آنکھیں نیچی کر لیں، پھیلی ہوئی زمین عجز و درماندگی کے احساس سے سمٹ کر رہ گئی، اس وقت ضعیف و ناتواں کمزور و حقیر، ظلوم و جہول خاک کا پُتلا آگے بڑھا، اور اپنی ہمت کے بازوؤں کو پھیلا کر یہ بارِ عظیم اپنے سر لے لیا۔

خاک نژاد آدم کی بے شمار نسلیں پیدا ہوئیں اور رخصت ہو گئیں، پھیلی اور بڑھیں، ابھریں اور مٹیں، یہاں تک کہ عالمِ عنصریات کی شب دراز ختم ہوتی ہے، اور صبح محشر طلوع ہو چکا ہے۔ کمزور جلد باز، خطا کار و نسیان شعار انسان طلب ہوتا ہے، اور اُس کا ہر فرد "امانت" کا حساب سمجھانے حاضر ہوتا ہے۔ افراد کی تعداد حد شمار سے خارج ہے، ریاضی کا ہر عدد، سب کی گنتی بتانے سے قاصر ہے۔ اچھے اور برے، فاسق و فاجر، مومن و کافر، عالم و جاہل، شاہ و گدا، امیر و فقیر، حکیم و شاعر، عابد و زاہد، ولی و درویش، سب ایک ایک کر کے صف در صف حاضر ہو رہے ہیں، لیکن کسی ایک کے نامۂ عمل فطرت کے محاسبہ پر پورا نہیں اترتا۔ کسی کا بھی دامنِ امانت خیانت کے داغ سے پاک نظر نہیں آتا۔ کسی ایک کی بھی فردِ اعمال ایسی نہیں جو دعوے کے ساتھ پیش ہو سکے، ہر سمت حسرتیں، ندامتیں، پشیمانیاں، اور پریشانیاں ہیں، زاریاں اور بے قراریاں، افسردگیاں اور غمگینیاں ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ نفوسِ قدسیہ تک، جو دوسروں کی ہدایت و روشنی کے لیے خلق ہوئے تھے اور جو عرش کا پیام لے کر فرش پر آئے تھے۔ آج اپنی اپنی حالت

میں گرفتار ہیں اور زبانوں پر نفسی نفسی کا وظیفہ جاری ہے۔

گستاخ وشوخ چشم انسان، اس وقت بھی تمرد وخیرہ سری سے باز نہیں رہتا، اور سوال کر بیٹھتا ہے، کہ ایسی ناقص ہستیوں کے وجود میں لانے کا کیا ثمرہ تھا، جن میں سے کوئی ایک بھی معیار کمال پر پوری نہیں اترتی؟ اس بے شمار انبوہ کو خلعت وجود سے مشرف کرنے کا کچھ بھی حاصل تھا، جس کی ایک فرد بھی اپنے مقصد آفرینش کو پورا نہ کر سکی؟ حریم قدس سے آواز اتی ہے کہ دیکھ اے جاہل انسان، اور اپنی جہالت کا اقرار کر بن اے نادان آدم زاد اور اپنی نادانی پر شرما. یہ پیکر نورانی جو تیرے سامنے عرصۂ محشر میں موجود، اپنی ذات کی طرف سے فارغ ومطمئن اور دوسروں کے نجات دلانے کی کوشش میں مصروف وسرگرم نظر آ رہا ہے، تیری ہی طرح ایک انسان تھا تیری ہی طرح اس کا خمیر بھی آب وگل سے تھا، تیری ہی طرح خاک کے ذروں سے اپنے جسدِ عنصری کی ترکیب رکھتا تھا، لیکن ہمارا عبد کامل تھا. ہماری امانت کا پورا امین تھا، اور اپنے عہد کو نباہنے والا، قیدِ عنصر میں داخل ہونے سے قبل ہر وقت ہماری حمد وثنا میں مشغول رہا، تو ہم نے احمد (بہت تعریف کرنے والا) کے نام سے پکارا، اور اس کا صلہ یہ دیا، کہ جب عالمِ آب وگل میں پابند بنا کر بھیجا، تو اس کا لقب محمدؐ (بہت تعریف کئے گئے) رکھا. دیکھ اے غافل انسان! کہ آج نہ صرف ہم اس سب سے اچھے اور سب سے پیارے بندہ کو کیا درجہ نصیب کرتے ہیں، بلکہ جس کسی نے اس کی پیروی کی بھی کوشش کی، اس کے لیے بھی آج ہمارے ہاں کیا کیا سرفرازیاں اور سربلندیاں موجود ہیں۔

(ص:۱۳۵)

چھٹواں باب

صحافتِ ماجدی

صحافت کہنا چاہیے کہ مولانا دریابادیؒ کا پیدائشی میدان رہا ہے۔ اور زندگی بھر کا اوڑھنا بچھونا، ابھی عمر کی گیارھویں بارھویں سیڑھی ہی پر قدم پڑ پائے تھے اور ساتویں جماعت کے طالب علم، کہ جدت پسند طبقہ کی طرف سے مسائل اسلام کی ترمیم کی تائید میں ایک مضمون نکلا۔ غیرتِ ایمانی سے بیتاب ہوکر اس کا رَد ایک فرضی نام سے وقت کے ایک نامور اخبار میں لکھ بھیجا۔ اور وہ چھپ بھی گیا۔ یہ سرگزشت مولانا دریابادیؒ ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:-

''غالباً ۱۹۰۲ء تھا کہ آریہ سماجیوں نے لُدھیانہ (مشرقی پنجاب) کے کسی سادہ مزاج مسلمان گریجویٹ کو پھانس کر آریہ بنالیا تھا، خود اس سے اُس کے وجوہِ ارتداد پر ایک بڑی بدلگام کتاب ترکِ اسلام لکھا ڈالی۔ ملک بھر کی فضا میں جیسے سنسنی پھیل گئی اور جس مسلمان نے جہاں سُنا، بس سناٹے میں آ گیا۔ سال کی دوسری ششماہی تھی، اور میں سیتاپور ہائی اسکول کے چھٹے درجہ کا طالبِ علم کہ کتاب ایک آریہ لڑکے کے پاس نظر آ گئی۔ اور میں نے ایک سرسری نظر وہیں بیٹھے بیٹھے کر ڈالی۔ پڑھتے ہی جیسے بخار چڑھ آیا۔ دس سال کا سن تھا، اس وقت یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شخص قرآن اور رسولؐ سے اس درجہ بدتمیزی اور دریدہ دہنی کر سکتا ہے۔ اسکول سے آیا تو خون کھول رہا تھا۔ اور بجائے اس کے کہ اندر جا کر حسب معمول ناشتہ کروں، سیدھا اپنے چچازاد بھائی کے پاس گیا۔ اور بڑے تاؤ کے ساتھ انھیں یہ سنایا، ان بچارہ نے بڑی تسلی دی اور بولے کہ ''ذرا صبر و انتظار کرو، ہمارے علماء کیا بھلا چھوڑیں گے، پنجاب ہی سے اس کے

جواب ا نشاءاللہ ضرور نکلیں گے''. بات سچ نکلی، جواب ایک نہیں، کئی ایک، خوب خوب نکلے، ان میں سب سے زیادہ شہرت مولانا ثناءاللہ امرتسری کے ترکِ اسلام کو حاصل ہوئی. اپنی خودگزشت کے سلسلے میں بات کہنے کی یہ ہے کہ جواب لکھنے کی تحریک خود اپنے دل میں بھی پیدا ہوئی، اور حسرت کے ساتھ سوچنے لگا کہ وہ کون دن ہوگا جب میں خود جواب لکھنے کے قابل ہوں گا.

۱۹۰۳ء کا اخیر اور ۱۹۰۴ء کا شروع تھا کہ اُردو اخبارو ں میں مضمون علی گڑھ کے ''روشن خیالوں'' کی طرف سے شمائل اسلام کی ترمیم وتصحیف میں چھپنے شروع ہو گئے، کسی نے کہا کہ عورتوں کو بھی پورے حق مرد کے برا بر ملنے چاہیے کسی نے کہا کہ قانون وراثت قابل ترمیم ہے، ساری جائیداد اولاد اکبر کو ملنا چاہیے. کسی نے کہا قرآن کے احکام معاملات کو حصہ عقائد سے بالکل الگ کر دیا جائے، اس وقت تجدد کی یہ پیش قدمی بڑی ہی ''سنسنی خیز'' اور صبر آزما تھی، مذہبی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی، لیکن جواب لکھنے کی ہمت کتر ہی کسی کو ہوئی. میں سا تویں کا طالب علم تھا، اور عمر کے گیارھویں بارھویں سال میں، جوں توں کر کے خود ہی جواب لکھا اور کسی فرضی نام سے، اودھ اخبار میں چھپنے کو بھیج دیا. اور اب کیا بیان ہو کہ کتنی خوشی اس وقت (۱۹۰۴ء) میں اپنا پہلا مضمون چھپا ہوا دیکھ کر ہوئی.

مضمون نام سے کیوں نہ لکھا، ایک تو فطری شرمیلا پن، دوسرے والد ماجد کا ڈر، کہ کہیں ڈانٹ پھٹکار نہ پڑ جائے کہ اپنا اسکول کورس چھوڑ چھاڑ یہ مضمون نگاری کہاں سے شروع کر دی. راز کے واقف وہی بھائی صاحب تھے. جو پڑھائی میں کوئی تین سال آگے تھے.

پہلے مضمون کا نکلنا تھا کہ جھجک مٹ گئی اور ہیا ؤ کُھل گیا، سال چھ مہینے کے اندر اندر دوسرا نکلا، اور پھر تیسرا، سلسلہ قائم ہو گیا. زیادہ تر اسی اودھ

اخبار میں، مضمون بالعموم ''نیچریوں'' کے رد میں ہوتے، والد ماجد مرحوم انجمن اسلامیہ سیتاپور کے صدر بھی تھے، ایک بار کسی نے ان پر اعتراض جڑ دیا. میں نے اس کا بھی جواب تڑ سے دیا اور جواب الجواب کا لمڈور اور فریقین کی طرف سے ہفتوں مہینوں کا بڑھتا رہا. مضمون بدستور گمنام ہی رہتے اور لوگوں کو حیرت رہتی کہ لکھنے والا ہے کون؟ عجب تماشہ ہوتا کہ اِدھر والد صاحب اور ان کے ہم نشین گمنام مضمون نگار کی داد دے رہے ہیں، اور اُدھر میں کواڑ سے کان لگائے سُن رہا ہوں، اور اندر ہی اندر نہال ہوا جا رہا ہوں!۔۔۔۔ہائے، وہ کم سنی کی معصومانہ خوشیاں! آج کیا صورت اس کا کوئی شائبہ بھی لوٹانے کی ہے!''

(آپ بیتی ص:۲۰۵)

جوں جوں عمر کی منزل کی طرف قدم بڑھتے گئے، قلم میں پختگی بھی آتی گئی. رفتہ رفتہ اخباروں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا. بالآخر اگست ۲۵ء سے مستقل اپنا ہفتہ واری پرچہ ''سچ'' نکالا. اس میں اپنے علمی، ادبی، اصلاحی اور صحافتی مضامین کے علاوہ ایک مستقل کالم ''سچی باتوں'' کا بھی رکھا. جو دنیائے صحافت میں ایک نئی، انوکھی اور دلچسپ چیز تھی. چلی اور خوب چلی جس میں قرآن، حدیث اور اسلاف کے حالات وواقعات کی روشنی میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے تقلیدی نتائج سے آگاہ اور مشرقی تہذیب کے محاسن سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ دینی شعور اور شوقِ آخرت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی. جس کے اب فاضل محترم مولانا نعیم الرحمٰن صاحب صدیقی کی کوششوں سے کتابی شکل میں حصے بھی نکلنے شروع ہو چکے ہیں۔

مولانا کے قلم حقیقت رقم میں تنقیدی صلاحیت بھی اعلیٰ درجہ کی پائی جاتی تھی. دوسری فصل میں ''جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جدید خدمت اسلام'' کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون درج ہے. جو مولانا کی حمیتِ اسلام اور تنقیدی مذاق کا مُظہر ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری تصنیفوں کارناموں سے قطعِ نظر خود اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ کل یوم آخرت میں مولانا کے حق میں حجت بن جائے.

اس کے علاوہ پرچہ میں حالات حاضرہ وواقعات پیش آمدہ پر جچے تُلے مختصر الفاظ میں تبصرے

ہوا کرتے۔اور خصوصاً مغربی بدتہذیبی کے عنوان پر آ کر مولانا کی طبیعت اکبرؔ ہی کی طرح پھڑک اٹھتی۔اور پھر جدّتِ عنوان کے ساتھ تیکھے طنزیہ انداز میں اس پر جاندار تبصرے کرتے۔جو مشرقی تہذیب کے نو پرستاروں کو دعوتِ فکر دینے کے ساتھ دیدۂ بصیرت کے بینا کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

سچ حق وصداقت کی تبلیغ وترویج میں ہمیشہ پیش پیش رہا اور اخیر تک اپنی صداقت شعاری کو نباہتا رہا۔''سچ'' نو سال اور چند ماہ نکل کر چند وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا۔اور پھر کچھ وقفہ کے بعد ''صدق'' اور ''صدق جدید'' جو سچ ہی کا نقش ثانی وثالث تھے مولانا کی تاحینِ حیات نکلتے رہے۔اپنے پرچہ کے علاوہ مولانا دریابادی اپنے علمی تراشے،تبصرے اور ترجمے وقت کے مشہور ومعروف پرچوں میں بھی لکھتے رہتے۔جن میں معارف،ہمدرد اور ہمدم قابل ذکر ہیں۔اس طرح مولانا دریابادیؒ کی کچھ کم وبیش ستر سالہ زندگی صحافت کے میدان میں گزری۔جو شاید ہی کسی خوش نصیب کے نصیب میں آئی ہوگی!

صحافتِ ماجدی کی ہم نے چار فصلیں قائم کی ہیں۔

(۱) سچی باتیں

(۲) تنقیداتِ ماجدی

(۳) شذراتِ ماجدی

(۴) طنزیاتِ ماجدی

''خطبات ماجدیا ہدیۂ زوجین''عربی کے خطبۂ نکاح کو اردو کے قالب میں ڈھالے گئے مولانا دریابادیؒ کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی ایک بھتیجی اور تین صاحبزادیوں کے عقد کے موقعہ پر ترتیب دیئے تھے۔جن میں تخلیقِ انسانی کے مقصد جنسِ عورت کی آفرینش کی وجہ،نکاح کے فضائل اور اس کی اہمیت پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے اور نوشہ وعروسہ کو ایک دوسرے کے حقوق سے آگاہ کرتے ہوئے آئندہ کی زندگی سے متعلق چند ہدایتیں کی ہیں۔۔۔۔ان خطبات کے چند ضمنی شذرات کے لیے مستقل باب قائم کرنا تکلف سے خالی نظر نہ آیا اس لیے صحافت ماجدی کے ہی شذرات کے تحت ان کو بھی نقل کیا جاتا ہے۔

فصل اول

سچی باتیں

(۱)

اپنے بچپن میں جب بڑے لوگوں کی حکایتیں سنتا تھا تو خود بھی بڑے بن جانے کی تمنا دل میں پیدا ہو جاتی تھی لیکن یہ تمنا محض مبہم غیر متعین تھی. ذہن کے سامنے یہ صاف نہ تھا کہ بڑا ہونا کسے کہتے ہیں. اور بڑائی حاصل کیونکر ہوتی ہے؟ آیا محض سن کے بڑھ جانے سے یا کچھ اور بھی ضرورت پڑتی ہے؟ جب اسکول کے نیچے کے درجوں میں پڑھنا شروع کیا تو خیال ہوا کہ جب نویں اور دسویں درجہ میں پہنچ جائیں گے تو بڑے ہو جائیں گے. بڑے کہلائیں گے اور بڑے شمار کئے جانے لگیں گے. وہ زمانہ آیا نواں درجہ بھی پاس کیا اور میٹریکولیشن کا امتحان بھی دیا. ایک امتحان میں اتنے اچھے نمبر ملے کہ وظیفہ ملا لیکن ''بڑائی'' اب بھی نہ حاصل ہوئی۔

خیال ہوا کہ اسکولی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، عزت کالج کی طالب علمی میں ہے. کالج میں داخلہ ہوا اور یہاں فرسٹ ایر کے طلبہ سب سے زیادہ حقیر تھے. دل نے کہا کہ عزت اور بڑائی اس وقت سے شروع ہوگی. جب بی اے کلاس میں آئے. ایف اے پاس کیا اور بڑی خوشی سے تھرڈ ایر میں آئے. پھر یہ خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی. اب رائے یہ قائم ہوئی کہ دنیا معزز اس وقت قرار دے گی جب گریجویٹ ہو جائیں گے اور نام کے ساتھ بی اے لکھا جانے لگے گا. کالج میں متعدد انعامات پائے مجلس علمی میں مضامین و مقالات پڑھ کر سنائے. ان پر خوب واہ واہ ہوئی. محفل مشاعرہ کا لطف

اٹھایا گیا. بالآخر بی اے کے امتحان میں شرکت کی. جب نتیجہ شائع ہونے کو ہوا تو خوشی اور شوق سے راتیں آنکھوں میں کٹتی رہیں اور دل دن گنتا رہا کہ گزٹ کب آئے گا. آخر کار وہ مبارک دن آ کر رہا اور جی خوب خوب خوش ہوا معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بس اب مسرت و جاودانی کا خزانہ ہاتھ آ گیا. پَر افسوس کہ یہ مسرت بھی دیرپا نہ ثابت ہوئی اور دل بدستور عزت اور بڑائی کا تمنائی، جاہ و ناموری کا بھوکا اور فکروں میں پڑ گیا اور امیدوں اور تمناؤں کے نئے نئے ہوائی قلعے تعمیر ہونے لگے۔

سن بڑھتا گیا، کامیابیاں اور کامرانیاں اندازے اور استحقاق دونوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر نصیب ہوتی رہیں. جاہ و مال، عزت و ناموری، دوستوں کی دوستی اور عزیزوں کی محبت داد دینے والوں اور دل بڑھانے والوں کی کسی طرف سے محرومی نہ رہی. پَر دل کی ہوس کسی منزل پر پہونچ کر نہ بجھی، ہر منزل پہلے دور سے تھکے ہارے مسافر کے لئے سرد پانی کا چشمہ، لیکن جب اس منزل پر قدم پہونچا تو نظر کا فریب کھل کر رہا اور ہمیشہ یہی نظر آیا کہ یہ راہ کی منزل تھی، منزل مقصود نہ تھی. پانی کا چشمہ نہ تھا ریگ کے ذروں کا چمکتا ہوا میدان تھا! عمر کا بیشتر حصہ گزر چکا. دل و دماغ، جسم و حواس کی بہترین قوتوں کی فرصتیں ختم ہو چکیں اور حاصل اگر ہوا تو صرف یہ کہ کچھ حاصل نہ ہوا اور سبق اگر ملا تو یہ کہ رہگزر کے فریب نے اب تک ہر ہر قدم پر مبتلا رکھا! ساری ''دل لگی'' صرف ''طلب'' کے وقت تک ہے. ''یافت'' کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بھی ''یافت'' نہ ہوئی. فلاں عہدہ اور فلاں مرتبہ، فلاں اعزاز اور فلاں دولت ساری امیدیں اور آرزوئیں سوا اس کے کہ عمر بھر طبیعت کو ڈانواں ڈول ہی رکھیں اور کسی کام کی ہیں! اردو کے عارف شاعر اکبر الٰہ آبادیؒ نے بھی اسی آپ بیتی کو کتنے خوش اور مؤثر لفظوں میں ادا کیا دوستو! اور عزیزو! عبرت حاصل کرو اس کے حال سے جس کا حال زار صرف عبرت ہی کے لئے ہے۔

کارِ جہاں کو دیکھ لیا میں نے غور سے
اک دل لگی ہے سعی میں حاصل میں کچھ نہیں

(صدق جدید ۱۵ر نومبر ۷۴ء بحوالہ سچ ۴ر مارچ ۱۹۳۲ء)

(۲)

کھانا انسان کی زندگی قائم رکھنے کے لیے ہے، یا انسان کی زندگی اس لیے ہے کہ اسے کھانے پینے کی لذتوں میں بسر کیا جائے؟ موجودہ مادّی دنیا نے شقِ دوم کو اختیار کیا ہے، اور اس کا عمل بھی اسی پر ہے۔ مذہب نے شقِ اول کو اختیار کیا ہے، اور اپنے پیروؤں کو اس پر عمل کی ہدایت کی ہے۔

اسلام دینِ فطرت کا دوسرا نام ہے، اس میں کوئی شے فطرتِ انسان وفطرتِ کائنات کے خلاف ہو نہیں سکتی۔ وہ ایک طرف اپنے پیروؤں کو جائز لذتوں سے لطف اٹھانے کی بار بار دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف قدم قدم پر "لا تسرفوا"! دائرۂ اعتدال سے قدم باہر نہ رکھو کی بھی تاکید کرتا جاتا ہے۔ لذتوں پر جھک پڑنے کا نام فسق ہے، اور لذتوں سے بالکل کنارہ کش ہو جانے کو رہبانیت کہتے ہیں۔ اسلام نے جو شاہراہِ ہدایت دنیا کے سامنے پیش کی ہے، وہ فسق ورہبانیت، دونوں سے بچ کر ان کی درمیانی راہ ہے۔

خواص جب گمراہ ہوتے ہیں، تو رہبانیت کے ڈھرے پر پڑ جاتے ہیں۔ عوام کی گمراہی کا نام فسق ہے۔ نفس انسانی میں لذتوں پر جھک پڑنے کا قدرتی میلان موجود ہے۔ انسان اکثر انہی لذتوں پر گرتا ہے اور ایسا گرتا ہے کہ انسانیت سے گزر کر بہیمیت کے غار تک پہنچ جاتا ہے۔ روح کو چاہیے کہ روز بروز لطافت کی جانب ترقی کرتی جائے تاکہ جب جسم سے جدا ہو جانے کا وقت آئے تو اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کر کے، جو از سرتا پا نور ولطافت ہے، وصل وصال کا وہ انتہائی لطف و سرور حاصل کرے، جس کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنت ہے، لیکن انسان جب فسق میں مبتلا ہو جاتا ہے، یعنی اُن مادّی لذتوں میں پڑ جاتا ہے (جو اس کی روحانی صحت کے حق میں مُضر ہیں، تو رفتہ رفتہ اس کی روح کثافت اور گندگی میں آلودہ رہنے لگتی ہے، یہاں تک کہ جسم سے جدا ہونے کے بعد اس میں اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور مجبوراً اسے تنزل کر کے مادّہ کی کثافتوں اور آلائشوں کے مرکز سے آمیز ہونا پڑتا ہے، جو اس سے کوئی بھی طبعی وخلقی مناسبت نہیں رکھتے، اس لیے

اسے انتہائی اذیت وتکلیف کا سامنا ہوتا ہے، اور اس کو مذہب کی اصطلاح میں دوزخ کہتے ہیں۔

اسلام خلق اللہ کو راحت وسرور کی انتہائی منزل تک پہنچانے کا بہترین راہبر ہے، اس نے چُن چُن کر اپنے نظام وآئین میں وہی باتیں رکھی ہیں جو روح کی فطری صلاحیت کو بڑھائیں اور گندگی وکثافت میں آلودہ ہونے سے اسے محفوظ رکھیں۔ ان سب تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر کا نام روزہ ہے۔ محض بھوکا اور پیاسا رہنا یا خواہ مخواہ کسی کو اپنے تئیں گرسنگی وتشنگی کی تکلیف میں مبتلا کرنا، ہرگز روزہ کا مُدّعا نہیں۔ روزہ کی غرض وغایت صرف یہ ہے کہ انسان کچھ دیر کے لیے تمام اہم لذات مادّی کی طرف سے بےتوجہ ہوکر روح کو اپنی صفائی وپاکیزگی کی جانب متوجہ ہونے کا موقع دے۔ قرآن پاک میں روزہ کی غایت دولفظوں میں فرمادی ہے "لعلکم تتقون" (تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ) "تقویٰ" کے معنی بچنے کے ہیں۔ بچنا کس شے سے؟ ہر اُس شے سے جو روح کی پرواز ترقی میں حائل ہوتی ہے۔ ہر اُس شے سے جو روح کے جوہرِ لطیف کے حق میں زہر کا اثر رکھتی ہے۔ ہر اُس شے سے جو روح کو کثافتوں اور آلائشوں کے دلدل میں پھنسائے رکھتی ہے، قرآنی بلاغت کا یہ معجزہ ہے کہ اس سارے مفہوم کو ایک لفظ "تتقون" کے ذریعہ سے ادا کردیا۔

(تفسیر ماجدی جلد اول ص: ۵۳۳ بحوالہ "سچ" مورخہ ۳ اپریل ۱۹۲۵ء)

(۳)

پندرہ بیس دن کا ذکر ہے، کہ بنگال یا بہار کے ایک نامور مہذب ومتین ہندوستانی کو "سر" کا خطاب ملا تھا۔ چند ہی روز بعد اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی، کہ وہ بزرگ مع اپنی بیوی کے (جو اَب لیڈی بن چکی تھیں) ایک "بال" (انگریزی ناچ) میں شریک ہوئے۔ الٰہ آباد کے مشہور پیر ظریف نے اپنے ایک شعر میں اسی جانب اشارہ کیا ہے ۔

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہوگیا
"سر" ہوگئے تو "بال" کا بھی شوق ہوگیا

یہ تو شعر کی "شان نزول" تھی لیکن اسی الہام شعری کی تفسیر اگر واقعات کے رنگ میں

دیکھنا ہے، تو کیا کوئی ایک یا دو واقعے ملیں گے؟ ہر سمت سے واقعات کس کثرت کے ساتھ آپ کی نگاہ کی طرف لپکیں گے، اور تصدیق و تفسیر کے لیے اپنی تئیں پیش کریں گے!

لیکن یہ حقیقت اپنے سب سے زیادہ مضحک اور سب سے زیادہ دردانگیز رنگ میں اس وقت ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی پرانے خیالات اور فرسودہ معاشرت کے ہندوستانی دفعۃً کسی بہت بڑے سرکاری منصب پر سرفراز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ابھی وکیل تھے، اور ابھی ہائی کورٹ کے جج ہو گئے، اور صبح جو سو کر اٹھے، تو اپنے کو صوبے کا ہوم ممبر پایا۔ خود تو ترقی کر کے مراتب چشم زدن میں طے کر کے جوں توں ''صاحب'' بن ہی جاتے ہیں۔ لیکن ''اہلیہ صاحبہ'' کا یا ''گھر کے لوگوں'' کا، یا ''بیوی'' کا، یا ''بیگم'' کا، یا ''بیگم صاحبہ'' کا دفعۃً لیڈی صاحبہ بن جانا آسان نہیں ہوتا! اور اُس وقت تبدیل ماہیت کی جو سرگرم کوششیں کی جاتی ہیں۔ اُن کا تعلق سننے سے نہیں، دیکھنے سے ہے! ہندوستانی لباس اتار کر فوراً فرنگیوں کا لباس پہنا دیا جاتا ہے، چہرہ کے لیے پاؤڈر لازمی ہو جاتے ہیں۔ ہندوستانی عطروں کے بجائے انگریزی خوشبوئیں، جسم پر رعنائی و شباب کے واپس لانے کے لیے ہر مصنوعی تدبیر شروع ہو جاتی ہے۔ پردہ کی کہاں تو یہ احتیاط تھی، کہ گھر کے اندر بھی دوپٹہ سر سے نہ سرکنے پائے، اور کہاں اب غیروں کی محفلوں میں، پارٹیوں میں، کلبوں میں چہرہ بھی زیر نقاب نہیں رہ سکتا۔ اور سب سے مقدم یہ کہ انگریزی بولنے کی مشق فرنگیوں کے لب و لہجہ کے ساتھ آ جائے!

دیہات کی لڑکیاں، قصبات کی شریف زادیاں، ماں باپ کے ہاں ساری تربیت اس کی ملی تھی، کہ ''چراغ خانہ'' بن کر رہو۔ تقدیر کی کسے خبر تھی، کہ اُدھیڑ سن پر پہونچ کر دفعۃً ''شمع محفل'' بن جانا پڑے گا! ہر نا کردنی، کردنی بن کر رہتی ہے، ہر بے حیائی عزت میں تبدیل ہو جاتی ہے، ہر محال ممکن ہو کر رہتا ہے! مشرقی تہذیب اگر آنسو بہاتی ہے، تو بہانے دیجیے، شرافت اگر ماتم کر رہی ہے، تو کرنے دیجیے، اسلام اگر اپنی بیٹیوں پر نفریں کر رہا ہے، تو کیا کرے، گھر اگر بگڑتا ہو، تو بگڑا کرے،

اللہ کے فرشتے اگر بیزار ہو رہے ہیں، تو ہوا کریں، جو کچھ ہو، ہو۔ ''صاحب'' تو بہر حال اسی سے خوش رہیں گے، اور یا جوج کے دربار میں عزت و مرتبہ، تقرب و رضا جوئی کا تو آخر یہی ذریعہ ہے۔ سچ کہا ہے اُسی ظریف عارف نے ؎

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں، نہ بھائی خوش ہیں، نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا، دلیل یہ ہے کہ ''آپ'' خوش ہیں

(۱۶ر دسمبر ۲۹ء)

(۴)

بمبئی سے خبر آئی ہے کہ ایک نیا ہوٹل شیرٹن کے نام سے ۱۶ کرور کی لاگت سے تعمیر ہو رہا ہے جس کا افتتاح وزیر صاحب خزانہ نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ اس کی ۳۵ منزلیں ہوں گی اور اس میں عیش و عشرت اور پُر تکلف زندگی کے وہ تمام سامان جمع ہوں گے جن کا فراہم ہونا ممکن ہو۔ بمبئی یوں بھی اب تک تاج محل ہوٹل اور دوسرے چھوٹے بڑے ہوٹلوں کے لئے سارے ملک میں مشہور تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اس شہرت کے بعد بھی امیری کے مزید ٹھاٹ باٹھ کی گنجائش باقی ہے۔ اور اس ''غریبی ہٹاؤ'' کے دور میں اور راجوں مہاراجوں کے فنا ہو جانے کے بعد اس خلا کو ۱۶ کرور کے سرمایہ اور ۳۵ منزلہ عمارت سے یوں پورا کیا جا رہا ہے!۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس لق و دق عمارت میں سیکڑوں آرام دہ کمرے ہوں گے۔ اور خدا جانے کتنے میں کمرے کھانے اور پینے کے، ناشتہ کے، بادہ نوشی کے، ناچ گانے کے، ہر قسم کے کھیل کود کے، تفریح و تفنن کے اور عیش و عشرت کے ہوں گے! ۔۔۔۔ ایک نیا اور نامور عشرت محل جس پر ہر سابق راجہ اور معزول نواب رشک کرے اور حسرت محسوس کرے۔

اسراف در اسراف، نفس پرستی اور معصیت کاری کی بے شمار صورتوں کو چھوڑیئے، صرف اسی کو سوچیے کہ یہ جو ''ماڈرن'' شوق ہوٹل بازی اور ہوٹل کاری کا پیدا ہوا ہے یہ صاف ضرب کاری

قدیم مشرقی واسلامی تخیل میزبانی اور مہمان نوازی پر لگا رہا ہے یا نہیں؟ ہمارے بزرگوں کے یہاں سرائیں اور مہمان سرائیں کیا ہوتیں..... ہر شریف کا گھر خود ایک مہمان خانہ ہوتا تھا اس کے عزیز وقریب، شناسا، ہم وطن سب اس کے یہاں اترتے تھے. ادھر میزبان پوری فیاضی کے ساتھ مہمان کی خدمت کرنا اپنے لیے باعثِ فلاح وسعادت اور موجبِ فخر سمجھتا تھا یا نہیں؟ یہ کرایہ کی مہمان داری جتنی بڑھتی جائے گی مشرقی اخلاق کی وہ شاخ فیاضی ومہمانداری روز بروز خشک ومضمحل ہوتی چلی جائے گی یا نہیں؟ اور یہ سائنس اور ٹکنالوجی والا تمدن لادینی بے دینی اور بددینی کی طرف نہیں بلکہ صریح لااخلاقیت اور بے شرافتی کی طرف لے جانے والا ہے یا نہیں؟

(صدق جدید ۷ر ستمبر ۷۳ء)

(۵)

موسیٰ بن میمون (جنھیں انگریزی میں Mamonidar) قرطبی اندلسی (۱۱۳۵ء تا ۱۲۰۴ء) قوم یہود کے شاید سب سے بڑے شخص ہوئے ہیں. عالم، فاضل، مہندس، متکلم، فلسفی وغیرہ. یہاں تک کہ ان کی ملت نے انھیں ''مثل موسیٰ'' یا موسیٰ ثانی'' کہنا شروع کر دیا یعنی بعد حضرت موسیٰ کے مرتبہ انھیں کا ہے. اور اپنے دوسرے کمالات کے علاوہ طبیب ومعالج بھی بڑے حاذق تھے. حال میں ان کے تذکرہ میں نظر سے گزرا کہ اخیر عمر میں مصر منتقل ہو آئے تھے اور پہلے سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح قسطنطنیہ کے نائب، اور پھر خود سلطان کے طبیب خاص اور معتمد علیہ اور مشیر راز دار ہو گئے تھے. کون سلطان؟ وہی جو اپنی اسلامیت اور شوق جہاد اور غزا یا ومبارزات کے لئے اپنے نام کی مہر تاریخ کے صفحات پر لگا گیا ہے. اور وہی جس نے محاربات صلیبی میں یورپ بھر سے ٹکر لے کر اپنا نام پیدا کر لیا تھا اور جس نے اپنی دینداری کے جوش میں پروانہ اپنی صحت کی کی، نہ اپنے کسی نقصان جان ومال کی ۔۔۔۔ تو ایک ایسے کٹر مسلمان کا معتمد علیہ اور جان تک کا دنیوی محافظ ایک ایسا کٹر یہودی!

اس صراحت نے ایک نیا شگوفۂ اُمید کا یہ چھوڑا کہ اسرائیلی عالم اسلامی کی نظر میں ہمیشہ ہی اتنا مبغوض نہیں رہا ہے۔ بلکہ تاریخ کے ٹیپ ریکارڈ کو اگر..... چابی دے کر چھوڑ یئے تو عجب نہیں، کہ

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کی گونج سنائی دینے لگے! کوئی تاریخ کے طالب علم اگر اسی عنوان کو اپنا موضوع تحقیق بنالیں، کہ ''منزلت یہود مسلم درباروں سرکاروں میں'' تو عجب نہیں کہ وزارتوں میں، نظامتوں میں، عہدہ داروں میں ایک پوری فہرست یہودی ناموں کی نکل آئے۔ اور فصل میں وصل کی جھلکیاں بار بار نظر آجائیں!

(۱۶ رمئی ۶۹ء)

(۶)

اسی مارچ کے مہینہ میں اسی شہر لکھنؤ میں تین شادیاں ایک مسلمان اچھی کھاتی پیتی برادری میں ہوئیں۔ اور دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ایسی شادیاں اس پشت یا اس نسل میں تو شاید ہی دیکھنے میں آئی ہوں۔ اہل تقریب محض نام کے مسلمان نہ تھے نماز، روزہ، زکوٰۃ حج کے پابند اور اسلامی شعاروں کی شمع روشن رکھنے والے اور جماعت تبلیغی کے عقیدت مند و شریک کار۔ اس لئے جو کھلے ہوئے محرمات شرعی ہیں۔ ناچ، رنگ، آتشبازی وغیرہ ان کا تو خیر امکان ہی نہ تھا۔ باقی انھیں چھوڑ کر تقریب اپنے دھوم دھام، تزک و احتشام، کروفر، اسراف و صرف زر اور تکلفات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھی۔ راویوں کا بیان ہے کہ ۱۰ ہزار کی تعداد میں تو اہل برادری ہی مدعو تھے اور دو ہزار کی تعداد میں باہر کے۔ بارہ ہزار کی سادہ مہمانداری ہی اس ہوش رُبا گرانی کے زمانہ میں آسان نہیں۔ چہ جائیکہ جب سادگی کا نہیں، تکلفات کا اہتمام قدم قدم پر ہو۔ اور مہمانوں کی تعداد بھی باقاعدہ مدعوئین تک محدود نہ ہو! خدا معلوم کتنے ناخواندہ مہمان نازل ہو گئے۔ اور خوان نعمت پر ٹوٹ پڑے۔ انتظامات رئیسانہ بلکہ شاہانہ پیمانے کے تھے پھر بھی ناکافی نکلے۔ بکرے سیکڑوں کٹ چکے تھے۔ اب اور کٹے۔ پلاؤ کی دیگیں ازسرِ نو چڑھیں اور کباب و شیرمال کے دسترخوان نئے نئے بچھے۔۔۔۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق

بجٹ بالآخر ۳۰لاکھ کا بنانا پڑا! ۳۰لاکھ اللہ کی ایک امانت تھی. کتنے ادارے فلاح امت کے اس سے چل سکتے تھے. انگریزی روزنامہ کے لئے ہائے ہائے، ہرایک کررہا ہے. کم ازکم اس کی داغ بیل تو پڑ ہی سکتی تھی؟

جہیز کی باربرداری کے لئے روایت ہے کہ شہر کے سارے باربردار ٹھیلے ناکافی ہوگئے. اور دوسرے شہروں سے بلوانا پڑا۔۔۔۔لکھنؤ ہی میں ایک دوسرے تاجر صاحب کے ہاں کی بھی تقریبات اب چند سال سے اپنی دھوم دھام وآرائش ونمایش کے لحاظ سے ایک ضرب المثل شہرت رکھنے لگی ہیں. لیکن وہ لوگ نہ تو اپنے مال تجارت میں اس درجہ محتاط، نہ اور عبادت کی زندگی میں اتنے ممتاز. یہ دوسرا خاندان تو دین ومذہب میں اتنا نیک نام، اور پھر موقع امتحان پر اور ملت کی طرف سے اس طرح بے نیاز نکلا تو اس پر صبر وخاموشی کیونکر اختیار کی جائے. اور سکوت سے کام لے کر اگر رضا کا نہیں تو نیم رضا کا سرٹیفکٹ کیونکر دے دیا جائے! ہمارے امیروں، رئیسوں، تاجروں، کاروباریوں کو اللہ ان کی دولت مبارک کرے۔۔۔۔اللہ ان کا سرمایہ ہرگز ان سے چھیننا نہیں چاہتا. بیشتر حصہ اپنی ذات پر لگالیتے ہیں مضائقہ نہیں لیکن یہ نہ ہو کہ ملی ضرورتیں بالکل ہی غفلت اور کس مپرسی میں پڑجائیں اور آپ بس اپنے ہی کو دیکھتے رہ جائیں۔۔۔۔قارون تک سے اس عہد کے مومنین نے صرف اتنا کہا تھا" اللہ نے تجھ کو جو ساز وسامان دے رکھا ہے اس میں سے کچھ اپنے لئے آخرت کے گھر کی بھی فکر کرلے"

(۱۸/اپریل ۶۹ء)

(۷)

دن کی تخلیق کی مصلحتیں تو روزِ روشن کی طرح ظاہر ہیں لیکن دن کے ساتھ رات کی خلقت کیوں ہوئی ہے سوا اس کے کہ اس سے دن کے کاروبار رکے رہیں اور طرح طرح کے جرم سرزد ہوتے رہیں اور دن کے پیدا کردینے سے کیا حاصل ہوا۔۔۔۔بہرحال انسان اپنی عقل خام کا

سے جورائیں بھی قائم کرتا رہے .اللہ نے رات کو بھی اس دنیا کا ضروری جزو اس طرح بنادیا، جس طرح دن کو .اور اجالے کے ساتھ اندھیرا نفع کے ساتھ نقصان، صحت کے ساتھ بیماری، بلندی کے ساتھ پستی، ترقی کے ساتھ تنزل، مسرت کے ساتھ غم، ہنسی کے ساتھ رونا اور لذت کے ساتھ الم کو بھی اسی دنیا کے اجزاء ضروری میں شامل کیا ہے اور اس عالم ناسوت کی اس ساخت وترکیب کے پیشِ نظر اس نے ہانک پکار کے کہہ بھی دیا کہ یہ دارُ الجزاء نہیں ہے. محض دارالعمل ہے .ایک تجربہ گاہ ہے۔

ھو الذی .....احسن عملا

وہ پروردگار وہی ہے جس نے موت وزندگی دونوں کو پیدا کر رکھا ہے جس سے وہ تم کو آزمائے کہ کون عمل بہتر کرتا ہے۔

نقد انقد نفع، دست بدست بدلہ، یہ اس نے اس دنیا کا قانون ہی نہیں رکھا. یہاں کا دستور اساسی تو مسلسل مقابلہ اور کشمکش ہے. سفیدی وسیاہی، نور وظلمت، رحمانیت وشیطنیت کے درمیان!

اسی اصل اصول کو سمجھ کر اپنی زندگی کا پروگرام بنایئے .اور یہ بات دل میں بٹھائے رکھیے کہ کارگاہ ہستی میں آپ کی ذات بس ایک پیادے کی ہے جس کا کام ہے نتیجہ کی فکر کے بغیر حق کا علم سنبھالے رہنا اور فتح وشکست سے یکسو ہو کر باطل سے مقابلہ کے لئے جانا جس کی اصلی قدر وقیمت محشر میں کھلے گی ورنہ یہاں تو کھرے کے ساتھ کھوٹے سکے، اور دودھ میں ملے ہوئے پانی کا چلن رہتا ہی ہے .آخر کامیابی یقیناً یہاں حق ہی کی ہونا ہے .لیکن اس کے لئے ''آخری'' ہونے کا تحقق بھی ضروری ہے .شیطان حیلہ ساز کا بڑا حربہ اس کی مسلسل وسوسہ اندازی ہے کہ دیکھیے فتح حق کو فی الفور اور پہلے قدم پر کہاں ہوئی .مؤمن کے سلح خانہ میں سب سے بڑا حربہ صبر واستقامت ہے .بس اسی مجاہدے پر قائم رہیے .اور یقین رکھیے کہ فلاح آپ ہی کا حصہ ہے .یہ منکر وکافر کی قسمت میں نہیں انہ لا یفلح الکافرون .

(۲۵ر اپریل ۶۹ء)

(۸)

کلام پاک میں بعض اگلی شامت زدہ وگمراہ قوموں کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ جب وہ لوگ احکام الٰہی سے برابر غفلت ہی برتتے رہے اور چونکا دینے سے نہ چونکے تو مشیتِ الٰہی نے دفعۃً انھیں کوئی سزا نہ دی فوراً ان پر دروازہ بند نہ ہوا بلکہ اس کے برعکس ان پر ہر شے کے دروازے کشادہ کر دیئے گئے (فتحنا علیھم ابواب کلّ شیٔ) اُن کی آمدنیاں بڑھنے لگیں۔ان کے دولت واقبال میں ترقی ہونے لگی۔ان کا جاہ وحشم عروج پر آ گیا، یہاں تک کہ وہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے نشہ میں اور زیادہ مست وسرشار ہو گئے۔خود پستی اور خدا فراموشی میں اور منہمک ہو گئے۔ اپنی فتح مندیوں، خود بینیوں اور خود اعتمادیوں کے گھمنڈ میں اور زیادہ آ گئے۔اس وقت ان پر یک بیک قہرِ الٰہی نازل ہوا اور وہ پاداش عمل میں دھڑ سے پکڑے گیے۔

آج آپ کو سود خواری کی تلقین کی جاتی ہے اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دیکھیے مغرب کی سود خوار قومیں کیسی خوش حال ہیں۔آج آپ کو شریعت شکنی کا سبز باغ دکھایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دیکھیے مغرب کی اقبال مند قومیں ان قیود سے آزاد ہو کر کیسی کیسی ترقیاں کر رہی ہیں۔کلام پاک کی جو تصریح ابھی آپ کی نظر سے گزری اس کے بعد اس قسم کے دلائل وشواہد کا کوئی وزن باقی رہ جاتا ہے ــــ ''خوش قسمت'' اور ''اقبال مند'' اور ''قابلِ رشک'' قومیں وہ نہیں جن کا آغاز خوش گوار ہوتا ہے گھوڑ دوڑ کی بازی اس کے ہاتھ نہیں رہتی ہے جو دوڑ کے شروع میں آگے ہوتا ہے۔بازی اس کے ہاتھ رہتی ہے جو خاتمہ پر سب سے آگے ہوتا ہے۔فرعون اور نمرود، ہامان اور قارون اور قومِ عاد وقومِ ثمود سے زیادہ شاندار اور زیادہ اقبال آغاز کس کا ہوا ہے۔لیکن انجام آخرت میں نہیں اس دنیا میں جو کچھ ہوا ہے۔اس کا تذکرہ بھی قرآن مجید میں محفوظ ہے۔خوش حالی واقبال مندی کو لازمی طور پر ہر حال میں کسی قوم کی ''صلاح وفلاح'' کی دلیل قرار دینا قرآن پاک کی تعلیم سے یکسر بے گانگی کا ثبوت دینا ہے۔

(۳۰ جولائی ۱۹۳۶ء)

(۹)

بمبئی کے انگریزی مصور ہفتہ وار ٹائمس آف انڈیا میں ایک انگریز شکاری کی تصویر شائع ہوتی ہے جو شیر کا شکار کرنے گیا تھا شیر نے الٹا خود اسی پر حملہ کر دیا تصویر میں منظر یہ دکھایا گیا ہے کہ شیر اپنے پچھلے پیروں شکاری پر حملہ آور ہے شکاری کی بندوق دانتوں میں لئے ہوئے چاہتا ہے کہ صیاد کو ریزہ ریزہ کر ڈالے اور پنجوں سے چاہتا ہے کہ شکاری کے چہرہ اور بازو کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ شکاری کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں کہ جانور کا نہیں ملک الموت کا سامنا ہے۔ خون کے شرارے جسم سے جاری ہیں۔ پھر بھی ہمت و پامردی سے مقابلہ کئے جا رہا ہے یہاں تک کہ غالب آ جاتا ہے۔ زخمی درندہ مہلک زخم کھا کر خود ہی بھاگ نکلتا ہے۔

حکایت اپنے سارے جزئیات میں صحیح ہو یا نہ ہو، یہاں سوال صرف یہ ہے کہ آپ نے اس قصہ سے کوئی سبق حاصل کیا؟ آیا کہ ہم بھی اس طرح دنیا کے وسیع صحرا میں خواہشوں اور آرزوؤں کے لق ودق جنگل میں ایک زبردست ہیبت ناک درندہ کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ ہم کو بھی ایک بڑے پرقوت موذی سے اسی طرح دست بدست جنگ اور موت وحیات کی کشمکش درپیش ہے۔ اس دشمن کا نام شیطان رکھیے یا نفس کہہ کر پکاریئے بہرحال مقابلہ شیر ہی کی طرح سخت ہے الحمدللہ کہ ایمان کی بندوق ہر مؤمن کے ہاتھ میں ہے۔ درندہ اس پر بھی حملہ کرے گا لیکن اگر ہم نے بندوق کا استعمال اچھی طرح سیکھ لیا ہے۔ اگر ہم نے ایمان کو اپنے قلب میں راسخ کر لیا ہے تو ان شاء اللہ خود اس حملہ آور کے دانت ٹوٹ کر رہ جائیں گے اور یقیناً وہ موذی بالآخر خود ہی ناکام ہو کر بھاگے گا۔ شرط یہ ہے کہ ہمت قوی رہے۔ مقابلہ پامردی سے جاری رہے اور ضعف و بزدلی دل میں راہ نہ پانے پائے۔

(سچ، مئی ۱۹۶۱ء)

(۱۰)

اللہ آپ کو اتنا زر و دولت دے دے کہ آپ کھانے پینے میں بجز لطیف ترین ماکولات اور نفیس ترین مشروبات کے اور کچھ نہ رکھیں۔ کھانے میں صرف انار و انگور، زعفران و شہد کا التزام رکھیں

اور پینے میں آبِ زمزم، کیوڑا، گلاب، اور عرق بید مشک کے سوا اور کسی چیز کو منہ نہ لگائیں تو بھی نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ فضلہ کا اخراج جب ہوگا وہ ساری نفاستیں اور نظافتیں، حلاوتیں اور خوشبوئیں خواب وخیال ہوں گی. آپ سے اس طرف دیکھا بھی نہ جائے گا اور کہیں کسی نے سونگھنے اور چھونے کی فرمائش کردی تو غضب ہوجائے گا اور آپ کو متلی ہوئے بغیر نہ رہے گی!۔۔۔۔۔اس سے ہلکے تجربے آپ کو روزمرہ ہوتے رہتے ہیں یا نہیں!

اور پھر دوسرا تجربہ بھی اسی اتصال وتواتر کے ساتھ ہوتا رہتا ہے یا نہیں کہ یہی غلاظت کا انبار جب کھاد بن کر کھیتیوں اور باغوں میں پڑتا ہے تو کیسے کیسے خوشبودار پھول گلاب اور جوہی اور چنبیلی کے اس سے پیدا ہوتے ہیں اور کیسے کیسے لطیف ونفیس پھل اس سے نمودار ہوجاتے ہیں! ۔۔۔۔روزمرہ یہی الٹ پھیر کا تماشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے چوبیسوں گھنٹے ہوتا رہتا ہے یا نہیں؟ یہ حیرت انگیز انقلاب یا استحالہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے کیمسٹ کے بس میں ہے! قرآن مجید نے اللہ کی یکتائی کے ساتھ اس کی معجزانہ پروردگاری اور حکمت وصناعی پر جو استدلال کیا ہے وہ انھیں ہر وقتی معجزات کے لحاظ سے ہے اور ''خوارق'' جنھیں عوام بھی خوارق کہیں ان کا ظہور بھی بیشک ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے. لیکن کبھی کبھی. باقی یہ طبعی وتکوینی معجزات ہر لحظہ اور ہر آن ظہور پذیر ہوتے ہیں. وہ ایک فرد ہیں یخرج الحیّ من المیت ویخرج المیت من الحیّ کے۔

(صدق جدید ۱۸ ستمبر ۷۲ء)

(۱۱)

اسی جولائی کے مہینہ کی بات ہے کہ ایک روز روزناموں میں کیا دیکھتے ہیں کہ شاہِ مراقش مولائے حسن ثانی فلاں محل میں اپنی ۲۴ سال گرہ کا جشن منا رہے تھے کہ یک بیک گولیاں چلیں اور بندوقوں کی باڑ نے سلطان اور ان کی حکومت دونوں کا خاتمہ کردیا. اور یہ ختم کرنے والے انھیں کے دربار کے اعیان اور فوج کے جنرل اور کرنل اور میجر تھے۔۔۔۔۔دوسرے ہی دن تردید چھپی کہ نہیں،

سلطان مارے نہیں گئے، حملہ بے شک ان کے خلاف ہوا تھا اور سازش بڑی گہری تھی مگر اچانک کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ الٹے سازشی اور باغی ہی پکڑ لئے گئے فوج بادشاہ کی وفادار رہی اور ان کے لیڈروں کو بندوق کی گولیوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کیسے کیسے جوان اور توانا بات کی بات میں لاشۂ بے جان ہو کر تڑپنے لگے۔

باغی ''باغی'' ہی ٹھہرے! بادشاہ بدستور بادشاہ بنے رہے! لیکن قسمت نے ذرا بھی ساتھ دیا ہوتا اور منٹوں اور گھنٹوں کے ہیر پھیر نے ذرا سی موافقت کی ہوتی تو آج وہی باغی وغدار ملک کے ''ہیرو'' ہوتے، ''انقلابی'' کہلاتے۔ ''مجاہدین آزادی'' کے نام سے مشہور ہوتے۔ مارے جاتے تو شہیدانِ ملت کا لقب پاتے۔ روپوش ہو جاتے تو بغیر کسی ملامت وبدنامی کے ''زیرِ زمین'' چلے جانے والوں کا نام پاتے ۔۔۔۔۔ یہ ہے دنیا اور اس کی مدح وذم! جیت جایئے تو گلے میں ہار پہنئے، حکومت واقبال مندی کے تخت پر جا بیٹھے، بادشاہ کہلایئے اور کہیں ہارے تو بس باغی اور غدار بنیے اور سر گنوایئے! دنیا کی تاریخ اول سے آخر تک پڑھ جایئے۔ ساری تاریخ کائنات کی یہی روداد ہے اور ہر دور کی یہی سرگزشت ہے!

(صدق جدید ۳۰ رجولائی ۷۱ء)

(۱۲)

بات کچھ ایسی زیادہ پرانی نہیں۔ کوئی تین ہی پشت اُدھر کا ذکر ہے کہ ریاست بھوپال کی فرماں روا ایک بیگم عالی قدر تھیں۔ نام غالباً سکندر جہاں بیگم تھا۔ ثقہ لوگوں سے روایت سننے میں آئی کہ بیگم علاوہ اپنے دینی معمولات وعبادات کے ایک ذاتی معمول یہ رکھتی کہ رات کا کھانا بہت دیر میں تناول فرماتیں یعنی جب آدھی رات گزر لیتی اور اس کی لم یہ تھی کہ اس وقت تک ہر ہر محلہ سے یہ اطلاع ان کے پاس سرکاری پیادوں سے آجاتی کہ رعایا کا ہر فرد وبشر کیا چھوٹا اور کیا بڑا کھانا کھا چکا، اور کوئی بھی بے رزق یا بھوکا سونے نہیں جا رہا ہے۔ بیگم اس اطلاع کے بغیر نہ دسترخوان پر بیٹھتیں نہ

نوالہ توڑتیں۔۔۔۔۔فرمایئے یہ مجاہدہ کچھ آسان ہے؟اوراس کی توقع رئیسوں،نوابوں،امیروں اور حکمرانوں کے طبقہ میں کسی سے رکھی جاسکتی ہے؟

(۲۳ر اپریل ۷۱ء)

(۱۳)

بات بہت دن کی اب ہوگئی لکھنؤ میں ایک مشاعرہ تھا ایک نسبتاً غیر معروف سے شاعر فدا احمد دانش مشاعرہ میں لائے جاتے ہیں.سن اسّی سال سے کچھ اوپر،آنکھوں سے معذور بالکل نابینا، جسم لاغر اور زار نزار،علالت وضعف کے پوری طرح شکار.زمین ہے ''دیوانے کو فرزانے کو''غزل شروع کرتے ہیں تو خیال یہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی کوئی شوخ رنگین قسم کی ہوگی.لیکن جب مطلع پڑھتے ہیں تو توقع اور اندازہ کے خلاف ہوتی ہے۔

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو نہ پیمانہ کو
آخری دور ہے بھردے کوئی پیمانے کو

''آخری دور ہے'' کا ٹکڑا قیامت کا،پورا شعر لفظاً وحرفاً حسبِ حال،قال کی مطابقت حال سے اس درجہ کم ہی ہوتی ہے.سننے والے تڑپ اٹھے،محفل مشاعرہ بزمِ ماتم میں تبدیل ہوگئی،آئے تھے ہنسی دل لگی تفریح کے لئے،واسطہ اداسی وغمگینی سے پڑ گیا.کچھ تو روئے اور بعض کا دل رویا ۔۔۔۔غفلت کے بیداری میں تبدیل ہوجانے کی،بے حسی سے ''تذکر'' کے پیدا ہوجانے کی کیا یہ کوئی انوکھی اور نرالی مثال ہے؟

طلسماتِ گل بکاؤلی (صحیح نام مذہبِ عشق ہے) ایک لچر سی کتاب قصہ کہانی اور دل بہلاوے کی ہے اور افسانہ عشق سراپا فسق کا ہے.لیکن اگر کوئی کبھی اتفاق سے نظر پڑ جائے تو دیکھئے گا کہ خرافات کے انبار میں پند وموعظت کے کیسے کیسے گوہر نایاب بھی چھپے ہوئے اور تپے ہوئے جھلک رہے ہیں۔۔۔۔اور فسانہ آزاد جو ایک غیر مسلم کے قلم سے چار ضخیم جلدوں میں بیگماتی زبان میں

محض ہنسنے ہنسانے کے لئے لکھا گیا ہے اور جو آج سے قبل کے نوابی لکھنؤ کی ہو بہو من وعن تصویر ہے۔ وہ بھی شروع سے آخر تک محض گدگدیوں سے بھرپور نہیں۔ بلکہ کہیں کہیں چٹکیاں بھی رکھتی ہیں اور کہیں کہیں سسکیاں بھی ۔۔۔۔ دونوں کے بھی ۲۵ سال کے بعد جو امرؤ جان ادا چھپ کر آئی وہ کہنے کو ایک نستعلیق خواندہ بیسوا کی آپ بیتی ہے لیکن خباثت کی ترغیب وتشویق سے یکسر خالی اور ''آرٹ'' کے حق فخر وپندار کا نہیں، حسرت وندامت کا جذبہ پیدا کرنے والی ہے۔ یہاں تک کہ جب آپ کتاب بند کریں گے تو عجب نہیں کہ حالتہ شرافت کو ایک نئی اشراقیت سے جگمگاتے ہوئے پائیں۔

(۱۳ر تمبر ۱۹۷۱ء)

(۱۴)

کہتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں اپنے رات کے گشت میں تھے کہ ایک سنسان محلہ میں آواز سنی کہ ماں دودھ میں پانی ملا رہی ہے اور لڑکی اسے اس سے روک رہی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ ''یہاں خلیفہ یا اس کا کوئی آدمی نہیں ہے لڑکی جواب میں کہتی ہے کہ ''مگر اللہ تو دیکھ رہا ہے'' ماں اس پر لاجواب ہو کر رہ گئی ۔۔۔۔ مشہور قصہ ہے کہ آپ نے کتابوں اور رسالوں میں ضرور اسے پڑھا ہوگا یا کسی واعظ کی زبان سے سنا ہوگا۔ اور اس پر سے ہر اچھی حکایت کی طرح سرسری طور سے گزر گئے ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ اس پر خوش ہوئے ہوں گے کہ خلیفہ عمرؓ کی باخبری اور فرض شناسی کی کیسی زبردست سند مل گئی۔ حکایت تاریخی ہے۔ خوش عقیدگی کی پیداوار نہیں۔

حالانکہ حکایت کی جان لڑکی کی زندہ ضمیری اور اس کی عادتِ احتساب ہے۔ اور لڑکی بھی کوئی ورع وتقوی میں خاص طور سے ممتاز نہ تھی، معمولی سی لڑکی تھی جیسی عام طور پر رعایا میں ہوتی ہیں جس چیز نے معاشرہ کو فریب دہی کے عذاب سے محفوظ رکھا وہ صرف خوفِ خدا تھا۔ جو ساری آبادی پر چھایا ہوا تھا اور ایک سے اگر لغزش ہوتی تو کوئی دوسرا اسے فوراً ہی ٹوک دیتا اور بھولا ہوا سبق یاد دلا دیتا۔ آج آپ کا وطن اسی ملاوٹ کے کاروبار اور کمر توڑ مہنگائی سے چیخ رہا ہے یا نہیں؟ بڑے چھوٹے،

امیر، غریب سب ہی تنگ آچکے ہیں. گورنمنٹ کیسی کیسی تدبیریں کررہی ہیں. کمیٹی، کمیشن سب ہی چیزوں کی طرف ذہن جارہا ہے. مگر ایک تدبیر کارگر نہیں ہورہی ہے۔۔۔۔۔اصلی مجرم تو وہ معاشرہ اور نظام معیشت ہے جس نے خوفِ خدا کو دلوں سے سوفی صدی نکال دیا ہے. اور استحضارِ آخرت کو ایک مضحکہ کی چیز بنا رکھا ہے۔

(۲۴ر اگست ۷۳ء)

(۱۵)

''مزارِ اشرف'' پر حاضری کی تمنا دل میں عرصہ سے تھی. جولائی کے مہینہ سے یہ قرض برابر چلا آرہا تھا. نوبت وسط نومبر میں آئی. ۱۵ کی دوپہر سے ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پر اترا اور سیدھا مزار پر حاضر ہوگیا۔۔۔۔تھانہ بھون کی حاضری اس ۱۵ برس کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار ہوچکی تھی، آج کا سفر ان سارے سفروں سے کتنا مختلف تھا. کتنا اشتیاق ہوتا تھا! کیسا قوی اور کامل یقین کہ دوکان کھلی ہوئی ہے، مطب گرم ہے، جایئے اور پہنچتے ہی مرہم شفا ہاتھ میں ہوگا! ہر درد کی دوا! ہر فکر وغم سے تشفی! آج رُت بدلی ہوئی تھی. آج قسمت پلٹی ہوئی تھی. دوکان بند، مطب اجاڑ! شفا کے بجائے حسرتِ شفا! دوا کی جگہ دوا کی یاد! مکین کے عوض صرف مکان!۔۔۔۔خوشگوار یادوں کا محفوظ رہ جانا بھی اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے!

---

۱۵ برس کا خوب جانا پہچانا ہوا، پچاسوں بار کا چڑھا اترا ہوا، اسٹیشن آج کچھ اجنبی سا تھا، مانوس آج نامانوس تھا. ہر بار حضرت کا کوئی خادم اسٹیشن پر ہمت افزائی کے لئے موجود ہوتا تھا. اور ایک آدھ بار تو حضرت نے کرم کی حد کردی تھی، کہ بہ نفس نفیس تشریف لے آئے تھے! آج یہ سب خواب وخیال تھا! اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا، پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں، اور مزار؟ آہ، مزار! نہ کوئی بلند گنبد نہ کوئی کلس دار قبہ، نہ چار دیواری نہ آستانہ، نہ جنگلہ نہ کٹہرا، ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ. ایک سمت میں مختصر پر فضا عمارت، وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ، اور وہی اللہ کے اس بندہ

کی خوابگاہ! نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! سادگی کی تصویر! صاحب قبر کی بے نفسی کا آئینہ! نہ لوح نہ کتبہ، نہ پھول نہ چادر، چند قدم کے فاصلہ پر وصل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے سے پہنچے ہوئے. شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست!۔۔۔۔ زندگی میں بھی تو اپنے کو متوسلین سے پیچھے رکھتے تھے۔

قصور کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا، تخیل کے کان میں کیا کیا آوازیں آئیں کوئی کہے بھی تو کس زبان سے کہے!

ایں حدیثے را بیاں دیگرست!

مدت ہوئی ایک بار امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مزار کی زیارت ہوئی تھی. بس کہنا چاہیے کہ وہی نقشہ یہاں بھی ہو بہو موجود! وہی سوزش وہی شورش، وہی سکینت وہی ٹھنڈک، وہی ہیبت وہی جلال، وہی انس وہی جمال

مرأت کمال ذو الجلالی

جی میں آیا کہ مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگائیے. عقل نے کچھ اور ہی سمجھایا. روتی ہوئی آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام رخصت عرض کیا. اور اپنے کو خانقاہ تک پہنچایا. خانقاہ! آہ، وہ روح بے جسد، وہ مکان بے مکیں، وہ انگشتری بے نگیں، مدرسہ چل رہا تھا، لیکن سہ دری خاموش ویران، بجھی ہوئی شمع، ایک ہو کا عالم، سناٹے کا مقام، نہ دری نہ جاجم، نہ تکیہ نہ مسند، نہ ڈسک نہ قلمدان، یاد ایک ایک چیز آتی رہی، اور دل کو حسرت وعبرت کی ختم نہ ہونے والی داستان سناتی رہی. یوں آنا ہوتا تھا، یہاں بیٹھنا ہوتا تھا. کیا کیا سننے میں، کیا کیا دیکھنے میں آتا تھا!۔۔۔۔ آہ، تو تیرا یہ بندہ بھی فانی تھا؟ بے شک موت وفنا تو اس نامور خادم کے نامور آقا تک کے لئے مقدر کر دی گئی تھی وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل. یہ ایک آیت امت کی تسلی وتعزیت کی کیسی پوری دنیا کی دنیا اپنے اندر آباد رکھتی ہے!

(صدق ۲۹/نومبر ۴۳ء)

فصل دوم

تنقیداتِ ماجدی

جامعہ ملیہ ''اسلامیہ''

کی

جدید ''خدمتِ اسلام''

''یثرب جو مکہ سے چار روز کے سفر پر واقع ہے'' ص ۲۸

یہ ایک نمونہ ہے، اُس تحقیق کا، جس سے جرمنی مستشرق ڈاکٹر جوزیف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی کی کتاب کا ہر صفحہ لبریز ہے! اور جس کا اردو ترجمہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک ہونہار گریجویٹ نے ''عربوں کے تمدن'' کے نام سے شایع فرمایا ہے۔ عجائب خانہ میں رکھنے کے لیے نہیں، بلکہ عزت وعقیدت کے ساتھ کتبخانہ میں رکھنے کے لیے! جغرافیۂ عرب کا مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے، کہ مدینہ ومکہ کے درمیان، قریب ترین راستہ گیارہ دن کا ہے، ورنہ عموماً تیرہ دن کا، اور رسول اللہ ﷺ کا سفر ہجرت تو سولہ منزلوں میں طے ہوا تھا، جن کے نام تک محفوظ ہیں فاصلہ کی پیمایش اگر میلوں کے حساب سے رکھی جائے، تو حجاز ریلوے جو قریب ترین راستہ سے مکہ ومدینہ کے درمیان نکل رہی تھی، دوسو چالیس میل لامحی تھی اور اونٹوں کا جو عام سلطانی راستہ کہلاتا ہے، اس کے حساب سے تو یہ فاصلہ دوسو پینسٹھ میل کا ہے، لیکن یہ سارے حسابات یقیناً غلط ہوں گے، یہ ساری پیمائش قطعاً جھوٹی ہوں گی۔ اس لیے کہ ایک فاضل مستشرق کا بیان اس کے مخالف ہے، اور مستشرقین کے بیانات بھلا آج تک کبھی غلط ثابت ہوئے ہیں؟

قرونِ اولیٰ کی حیرت انگیز عظیم الشان فتوحات اسلامی کی بابت یہ خیال تو اب تک آپ کا بہر حال ہوگا، کہ تائید غیبی نہ سہی، فرشتوں کا آسمان سے اترنا نہ سہی، رسول کا معجزہ نہ سہی، صحابہ کی کرامت نہ سہی، باوجود ہر قسم کی ظاہری کم سامانی اور تعداد کی کمی کے مسلمانوں کا اپنی سے کئی کئی گنی فوجوں، اور اپنے سے کہیں زیادہ مسلح و آراستہ لشکروں پر غالب آجانا، ان کے سچے مذہبی جوش، ان کی گہری دین داری، ان کے شوق حصول جنت، ان کے طلب و رضائے الٰہی، ان کے ذوق شہادت، ان کے عقیدہ ثواب غزا اور ان کے خلوص قلب و حسنِ نیت کا نتیجہ ہوتا تھا لیکن آج سن لیجیے، اور ''تاریخ'' کی زبان سے سن لیجیے، کہ

''عربوں کی ان مہموں کا اصلی مقصد تبلیغ اسلام نہ تھا، بلکہ اُس دولت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، جو پڑوس کی مہذب قوموں کے پاس ہوتی تھی'' ص ۶۰

انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ گویا صدیقؓ و فاروقؓ، علیؓ و عثمانؓ، طلحہؓ و زبیرؓ، ابوعبیدہؓ و سعد بن ابی وقاصؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ و خالد سیف اللہؓ، معاذؓ و ابوذرؓ جو کچھ کر رہے تھے، اپنے کو جس طرح مٹا رہے تھے، اپنے مال کو جس طرح بار بار لٹا چکے تھے، اپنی جان کو جس طرح بار بار خطرہ میں ڈال چکے تھے، یہ سب نعوذ باللہ محض ایک کھیل تھا، ایک تماشہ تھا، ایک بناوٹ تھی، ایک فریب تھا، ایک دھوکا تھا، نہ اسلام کا درد تھا، نہ اسلام کی اشاعت دل سے لگی ہوئی تھی نہ رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ شہادت کی تڑپ تھی، بلکہ فرنگستان کا یہ حیوانِ ناطق اپنے ظرف پر، اپنی قوم کے ظرف پر، قیاس کر کے لکھتا ہے کہ ۔۔۔۔ محض حرصِ دولت اور طمعِ دنیوی تھی! اور یہ نفوس قدسیہ اگر غیر مہذب ڈاکو اور مہذب لٹیرے نہیں، تو اسی فرنگی کے ہم قوموں کی طرح (معاذ اللہ) مہذب ڈاکو اور مہذب لٹیرے تھے، اور بس!

اس فرنگی اور فرنگی زادہ نے جو کچھ لکھا، اُس پر رنج ہے نہ حیرت، وہ بیچارہ مجبور تھا، کہ جو پیمانہ اس کے پاس تھا، اُسی سے سب کو ناپے، رونا جو کچھ ہے، اس کا ہے، کہ اس کا ترجمہ تردید و انکار کے ساتھ نہیں، بلکہ مدح و قبول کے ساتھ، تحسین و داد کے ساتھ، اعتراف و ستائش کے ساتھ، اور بالکل برائے نام تنقید کے ساتھ جامعہ سے شایع ہوتا ہے! اُس جامعہ سے، جو ملیہ بھی ہے اور ''اسلامیہ''

بھی ہے۔ اُس جامعہ سے، جو مسلمانوں کے بچوں کے لیے، مسلمانوں کے روپیہ سے، مسلمانوں کے ہاتھ سے قائم ہوا تھا! اُس جامعہ سے جس کی بنیاد ہی فرنگ سے بغاوت پر تھی! اُس جامعہ سے، جس کے خدا معلوم کتنے فرزند بڑے بڑے عہدوں کو چھوڑ چکے ہیں، اونچی اونچی تنخواہوں سے منہ پھیر چکے ہیں، اور جیل خانہ میں اپنے دن کاٹ چکے ہیں، پر نقش فرنگ اب تک نگین دل سے محو نہیں ہوا ہے، طاغوت کی محبت وعظمت اب تک جوں کی توں ہے، فرنگیوں کا مقابلہ کرنے نکلی ہے، لیکن فرنگیوں اور فرنگیت کا ''علمی'' رعب اب تک ہاتھوں اور پیروں کو شل کیے ہوئے ہے!

خرافت کا یہ مجموعہ، لغویات کی یہ پوٹ، اگر کسی راجپال کے نام سے، کسی کالپچرن کی طرف سے شایع ہوتی، تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے، کہ ترجمہ کرنا الگ، جامعہ کا کوئی اہل قلم اسے نگاہِ التفات سے دیکھتا تک بھی نہیں، لیکن کتاب چونکہ فرنگستان سے آئی ہے، چوں کہ اس کا انتساب میونک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی جانب ہے، اس لیے لامحالہ ایک محققانہ تصنیف ہے، ان سے استناد موجبِ فخر، اس کا ترجمہ باعثِ شرف، اور اگر کوئی شامت زدہ مشرقی، کوئی عقیدتمند مسلمان اس کے خلاف کوئی آواز نکالے، تو اُس کے جواب کے لیے، اُس بے علم اور بے ادب کو سبق دینے کے لیے، ماشاء اللہ رسالہ جامعہ کے اوراق ہیں، نیازی صاحب کا قلم ہے، اور سب سے بڑھ کر، اسلم صاحب کی زبان ہے! انا للہ ثم انا للہ۔

پاکوں کی زندگی کا ناپاک مرقع، ناپاک تر ہاتھوں سے تیار کیا ہوا، آپ نے دیکھا؟ لیکن دل تھام کر تیار ہو جایئے، ابھی اس سے کہیں زیادہ سننے اور دیکھنے کو باقی ہے۔ خفاش کی آنکھوں کو اصلی اذیت چاند اور ستاروں، بجلی کے قمقموں اور گیس کے ہنڈوں سے نہیں، بلکہ آفتاب کے نور سے پہونچتی ہے۔ یاجوج کی اصلی بغض وعداوت صحابہ کرام وخلفائے راشدین رضی اللہ عنھم سے نہیں، اصلی عداوت اِن سب کے سرور وسردار مرشد وہادی سے ہے۔ اپنے حملوں کا اصلی مرکز وہ ذات مبارک ﷺ کو بنائے ہوئے ہے۔ اپنے زہر کے بجھے ہوئے تیر (خاکم بدہن) وہ اُسی نشانہ پر چلانا چاہتے ہے۔ اس کی آواز جس کسی کے نام سے اور جس کسی کے بھی حلق سے نکلتی ہے، سب کا ماحصل یہی ہوتا

ہے، کہ سیرت مبارکہ کو جی بھر کے مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، اور یہ اس خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہو، کہ منکر لوگ تو الگ رہے، خود مسلموں کو بھی اس کا پتہ نہ چلنے پائے. اور دیکھتے دیکھتے سب کے سب وہی بولی بولنے لگ جائیں، جو وہ خود بول رہا ہے.....نادان ترک اپنی عمر بھر کی کمائی، اپنی پشتہا پشت کی دولت انھیں جھوٹے معبودوں کے آستانوں پر، انھیں ''علم''، ''تحقیق'' کے دیوتاؤں کے استھانوں پر لٹا چکا ہے. مصر بھی اسی طرف بڑھ رہا ہے. ہندوستان بھی ادھر ہی قدم اٹھا رہا ہے، اور جامعہ۔۔۔۔شیخ الوقت و شیخ الہند محمود الحسن کا کھولا ہوا جامعہ، مجاہدِ ملت، محمد علی کا قائم کیا ہوا جامعہ۔۔۔۔خدا نہ کرے، خدا نہ کرے، کہ اس وبا کا شکار ہو کر رہے!

عربوں کے تمدن کا مصنف، جوزیف ہیل مینک یونیورسٹی، کسی جرمن یونیورسٹی کا ڈاکٹر، اسی مدرسہ ''علم'' و ''تحقیق'' اسی درس گاہ دجل و دجالیت کا استاد، اور دوسرے بہت سے استادوں سے بڑا استاد ہے. وہ سامنے آ کر تلوار سے حملہ کبھی نہیں کرتا، وہ راستہ کا رفیق بن کر اپنی خاطر داریوں سے اجنبی کو اپنا بنا کر، اسے ہر طرف سے غافل و مطمئن پا کر، اُس کی گردن پر رومال کا پھندا اچانک مارتا ہے. وہ میزبان کے روپ میں سامنے آتا ہے، مہمان کی خاطر کرتا ہے، عزت کرتا ہے، خدمت کرتا ہے، اور بڑے ادب کے ساتھ اُس کی طرف قند اور دودھ کے شربت کے گلاس بڑھاتا ہے، جس کی تہہ میں زہر ہلاہل ہے، جو پینے والے کو اپنی حالت کے احساس تک کی مہلت نہ دے گا. وہ اپنا ترکش لے کر بیٹھتا ہے، اور جب اُس کے تیر خطا کرنے لگتے ہیں تو اُنھیں دوڑ دوڑ کر ہنسی خوشی اٹھانے والے، جہاں دیدہ اسلم اور نوعمر نیازی ہوتے ہیں!

مسلمانوں کا دعوی ہے، اور ہر طرح صحیح و ثابت دعوی ہے، کہ قرآن تو خیر الگ رہا، حدیث تک کا ذخیرہ، جس قدر محفوظ، قطعی، اور غیر محرف حالت میں ہے، اس کا مقابلہ نہ دنیا کی کوئی الہامی کتاب کر سکتی ہے، نہ ماضی و حال کی کوئی تاریخ کسی ملک و قوم کی، اور نہ دنیا کے لٹریچر میں کوئی دوسری کتاب. جو حدیثیں غیر صحیح ہیں، اُن کا تک کا ریکارڈ موجود ہے، یہ تفصیل و تعین موجود، کہ وہ کس بنا پر نا قابل اعتماد ہیں، کس حد تک اُن میں ضعف ہے، کس منزل سے اُن کا سلسلۂ استناد ٹوٹتا ہے

وغیرہ پچھلی تاریخوں کا ذکر نہیں، اس وقت جو تاریخیں ہماری آنکھوں کے سامنے مدون ہورہی ہیں، کہ بڑے بڑے ماہرفن کے ہاتھوں مدون ہورہی ہیں، اور اخبارات میں روزانہ واقعات کا جو اندارج ہوتا رہتا ہے، کسی میں صحت کا التزام اور اہتمام اُس کا نصف بھی نہیں، جو ہمارے ہاں کے سارے ذخیرۂ احادیث کے متعلق موجود ہے، اور وہی سیرت طیبہ کا سب سے بڑا، اور سب سے مستند ماخذ ہے، یاجوج نے جب ہیل کی زبان سے بولنا شروع کیا، تو اُس نے اپنے تیشہ کی پہلی ضرب اسی چٹان پر لگائی:-

''بعض ایسی باتیں جن کو آج تک بالکل صحیح اور مستند خیال کیا جاتا تھا، جدید تحقیقات کی بناپر ناقص اور ناقابل اعتبار ثابت ہوئی ہیں. آنحضرت کی زندگی میں کبھی..... صرف بڑے بڑے واقعات صحیح ہیں، باقی محض حسنِ عقیدت کا نتیجہ ہے'' ص ۲۴

کس کی مجال ہے، جو یہ دریافت کرسکے، کہ کون سے واقعات جو آج تک مسلم تھے، ''جدید تحقیقات کی بناپر، غلط ثابت ہوئے ہیں؟ اور آپ نے صحت کا وہ کون سا جدید معیار قائم کیا ہے، جس پر سیرت طیبہ کے ''صرف بڑے بڑے واقعات'' ہی پورے اترتے ہیں؟ چند دعوے ہیں، جو بلند آہنگی کے ساتھ کردیے گئے ہیں، جن کے لیے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے، نہ ثبوت کی. ہیل صاحب کا دعوی ہے، کہ حدیث کا بہت سا حصہ غلط ہے. اور دلیل یہ ہے کہ ہیل صاحب کہتے ہیں کہ حدیث کا بہت سا حصہ غلط ہے! اس کے بعد، کسی کی شامت آئی ہے، جو کوئی مزید سوال پیش کرسکے؟ ''حسنِ عقیدت'' اگر ہیل کے دعوے بے دلیل کے ساتھ ہو، عین ''علم'' و ''کمال'' ''تحقیق''!

حضور کی جرأت و ہمت ایک ایسی شے ہے، جس کا انکار بڑے سے بڑے مخالف سے بھی اس وقت نہ ہوسکا. اور خود میور نے حضورؐ کے اعتماد علی اللہ کی داد دی ہے، لیکن اس بدزبان کی گندہ دہنی ذرا ملاحظہ ہو:-

''محمد کو خود اپنے اوپر اعتماد نہ تھا (نعوذ باللہ) وہ اس پیغام کو قریش تک پہونچانے میں جھجکتے رہے، اور انھوں نے اُس وقت تک ایسا نہیں کیا، جب تک مسلمانوں کی تعداد

چالیس کے قریب نہیں ہوگئی، بس ۲۵

گویا اللہ کے اس سچے اور سب سے بڑے رسول میں اتنی اخلاقی جرأت اور اتنی ہمت بھی نہ تھی، جتنی آج گاندھی جی میں ہے، محمد علی میں ہے، جواہر لال میں، اور خود شیخ الجامعہ میں ہے! کتاب کے مترجم اور مدیر رسالہ جامعہ دونوں سے پوچھتا ہوں، اور دین کا واسطہ نہ سہی، دیانت کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، آج اس قسم کی خرافات نگاری، اگر کوئی ڈکٹر انصاری کے متعلق کرے، حکیم اجمل خان مرحوم کی بابت کرے، جواہر لال کے لیے کرے، تو وہ اُسے اپنی اردو اکاڈیمی کی طرف سے شایع کرنا گوارا کریں گے؟ اور بالغرض چھاپیں گے بھی، تو آیا دیباچہ میں ''دقتِ نظر، اصابتِ رائے، اور وسیع الخیالی'' کا سرٹیفکٹ دیں گے، یا اسے بجز ''ہزیال سرائی'' کے کسی اور لفظ سے تعبیر کریں گے؟ اگر کل خدانخواستہ کوئی دوسرا راجپال پیدا ہو کر اپنی گندہ ذہنی کا انبار لگانے لگے، اور اپنی صفائی میں یہ پیش کرے، کہ خود مسلمانوں کا جامعہ بھی تو اپنے رسول برحق کی ذات اور سیرت پر بڑے سے بڑے حملے ہنسی خوشی کرتا رہتا ہے، تو اہل جامعہ اپنی ذمہ داری، خلق و خالق کے سامنے محسوس کر کے براہ کرم فرمائیں، کہ مسلمانوں کے پاس کیا جواب ہوگا؟

ہیل بیچارہ مجبور ہے اُس نے آنکھ کھول کر جو کچھ دیکھا یہی دیکھا کہ مُلک کی فلاح اور قوم کی اصلاح کا نام لے لے کر کیسی کیسی دغابازیاں، کیسی کیسی مکاریاں، کیسی کیسی خودغرضیاں عمل میں لائی جاتی رہتی ہیں۔ اُس غریب کے دماغ میں یہ کیوں کر آ سکتا تھا، کہ دنیا میں خودغرضیوں، نفس پرستیوں، اور افترا پردازیوں کی آلائش سے الگ ہو کر بھی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ حیرت مترجم پر ہوتی ہے، جو روشنی میں پلے، اور روشنی میں بڑھے۔ اور پھر بجائے اس کے کہ موم بتیوں اور مشعلوں، چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی سے آفتاب کے نور کا اندازہ فرمائیں، الٹے اُس نابینا کی لکڑی کے سہارے چل رہے ہیں جو اندھیرے میں پیدا ہوا، اور اندھیرے میں ہمیشہ ٹٹولتا رہا!

غلاظت کے حوض میں، گو اُس کے صاف کرنے ہی کے لیے ہو، کوئی کہاں تک غوطے لگائے! پڑھنے والے ان غلاظتوں کے ڈھیر کو دیکھ دیکھ کر اگر پریشان ہو گئے ہیں، تو لکھنے والے کے

دل پر کیا گزر رہی ہوگی! بہر حال دل پر تھوڑا سا جبر کر کے صرف چند اقتباسات کو اور دیکھ لیجیے. یہ سب رسول کریم کی اخلاقی زندگی کے ''فضائل ومناقب'' سے متعلق ہے:-

''آنحضرت جیسا کہ آپ کا قاعدہ تھا، عربوں کی ہر بات سے جو آپ کے مفید مطلب ہوتی، فائدہ اٹھا لیتے تھے، لیکن اُس کے پابند نہ ہوتے تھے، چنانچہ آپ نے ایام حرام میں بے خبر اہل مکہ پر حملہ کیا اور اُنھیں لوٹا! ص ۳۵

رسول کریم ﷺ کا سب سے بڑا دشمن عام طور پر ابوجہل اور ابولہب کو سمجھا جاتا ہے، لیکن دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ اشد شدید دشمنان رسول بھی ہرگز شان رسالت میں ایسا ہجو نامہ نہیں تصنیف کر سکے تھے. وہ لاکھ اندھے تھے، پھر بھی ''دانایانِ فرنگ'' سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے. وہ جس شی کے منکر تھے، وہ رسول اللہ کا صرف دعوی رسالت تھا، باقی اور کسی شی میں انھیں ہرگز انکار نہ تھا خرافت، جہالت اور افترا پردازی کی یہ انتہا، صرف یورپ ہی کے حصہ میں آئی ہے. اس سے پہلے کسی دشمن دین کا خیال بھی یہاں تک نہیں پہونچا تھا. ابوجہل کا خود اعتراف موجود ہے، کہ ''ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، آپ کے پیغام کو ضرور جھوٹ سمجھتے ہیں، الامین اور صادق کا لقب دوستوں نے نہیں، انھیں دشمنوں نے دے رکھا تھا حضور کی دیانت، صداقت، عصمت، امانت، پاس عہد، عدل وانصاف، جرأت، ان سب اوصاف کا زبان سے بھی اقرار تھا اور عمل سے بھی اعتراف تھا. یہ تنگ ازل سے قرآن کو اساطیر الاولین کہنے والے ابوجہل وابولہب کے لیے نہیں، بلکہ اُن کے انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے روشن خیال فرزندانِ معنوی کے لیے اٹھ رہا تھا، کہ وہ اپنی شیطانی ذہانت اور ابلیسی ذکاوت سے کام لے کر ''اساطیر الاولین'' کا ایک دفتر بے پایاں تیار کریں گے، اور اسے تاریخ اسلام کے نام سے، تمدن عرب کے نام سے، علوم اسلامیہ کے نام سے، نادان اور بھولے مشرق کے دماغ پر، جو پہلے ہی سے غلامی کے سانچے میں ڈھالا جا چکا ہے، مسلط کر دیں گے!

لیکن ایک دشمن دین اور رہزن ایمان کے سارے لفظ وعبارت ایک طرف، اور اس کے دیباچہ میں جامعہ ''اسلامیہ'' کے ایک مسلمان گریجویٹ کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ایک طرف!

''جرمنی کے ایک مستشرق ڈاکٹر جوزیف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی کی تصنیف.....
ہماری زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب موجود نہیں، جس میں پوری طرح سے عربی تمدن کا احصاء کیا گیا ہو، پروفیسر ہیل کی یہ کتاب نہ صرف اس عام ضرورت کو پورا کرے گی، بلکہ تاریخ اسلام کے طالب علموں کو مزید مطالعہ کے لیے ایک اساس کا کام دے گی.....اس میں بڑی خوبی یہ ہے، کہ سوائے ایک آدھ بات کے جسے پروفیسر موصوف مستشرقین کے عام انداز میں لکھ گئے ہیں، ساری کتاب اُن کی دقتِ نظر، اصابت رائے اور وسیع الخیالی کا ثبوت ہے، جو ایک علمی تصنیف کی سب سے قیمتی خصوصیات ہیں''.

دشمن سے لڑتے لڑتے، عین معرکۂ جنگ میں، جب اپنے سپاہی اپنی فوج سے ٹوٹ ٹوٹ کر دشمن کے اسلحہ بردار بن جائیں، حریف سے کشتی کے وقت جب خود اپنے ہی ہاتھ پیر جواب دینے لگیں، تو اُس وقت کی اذیتِ قلب کا اظہار کن انسانی الفاظ میں ممکن ہے؟

جامعہ کا افتتاح ایک بڑے عارف باللہ شیخ الوقت نے کیا تھا. جس نے تمنا یہ کی تھی، کہ اس سے جو طلبہ نکلیں، وہ پختہ کار محمدی بن کر نکلیں، اور اس کے قیام کا مقصد یہ ظاہر فرمادیا تھا، کہ جو لوگ اس تربیت گاہ میں رہیں، وہ غیروں کے اثر سے کلیۃً آزاد ہوں. اور صرف سیاست ہی میں نہیں، بلکہ علوم میں، اخلاق میں، عقائد میں، خیالات میں، زندگی کے ہر شعبے میں، فرنگیوں اور فرنگیت کے اثر سے آزاد رہیں. کیا خبر تھی، کہ چند ہی سال کے بعد جن سے سیاسی ترک موالات جاری رہے گی، اُن کے علوم وفنون کے ساتھ اس اسلامی تربیت گاہ کے بہترین فرزند، نہ صرف انتہائی موالات برتیں گے، بلکہ ان کی دماغی غلامی اور ان کی علمی پرستاری اپنے لیے موجب صد عزت اور باعثِ ہزار فخر سمجھیں گے. اور اُن کے خرافات کے دفتروں کو اپنی زبان شوق کے ساتھ منتقل کریں گے!

جامعہ کا جواں مرد بانی جو شیدائے رسول ہے، وہ یہی نہیں، کہ جامعہ کے ابتدائی نظامنامہ میں اس کی تصریح کر چکا ہے، کہ جامعہ کی تعلیم وتربیت کا سنگِ بنیاد یہی ہے، کہ یہاں سے جو پل کر نکلیں، وہ سچے مسلمانوں بن کر، اسلام کی زندہ روح اپنے اندر لے کر نکلیں، بلکہ اُس وقت سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں خدا معلوم کتنی بار اس کا اعادہ کر چکا ہے، کہ ہر مسلم کی زندگی رسول کی سیرت

طیبہ کے نمونہ پر ہونا چاہیے۔ آہ، کون جاسکتا تھا، کہ اُس کے قائم کیے ہوئے جامعہ میں وہ سیرت طیبہ اس قدر غیر طیب صورت میں پیش کی جائے گی، اور اس پر فخر کیا جائے گا!

آج نیازی بیچارہ فرنگیت سے مسحور، فرنگیوں کے نام ڈرا اور سہما ہوا سمجھ رہا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ کر کے اس نے دین و مذہب کی نہ سہی، علم و تاریخ کی کوئی اہم خدمت انجام دی ہے، حالانکہ بقول اقبال

گریہ و در جستجوئے سرمہ
واقف از چشم سیاہ خود نہ

اگر وہ خود تمدن عرب پر کتاب لکھنے کا ارادہ کرتا، تو کم از کم جہاں تک رسول اکرم اور صحابہ کرام کی زندگیوں اور پہلی صدی ہجری کے نصف اول کے تمدن کا تعلق ہے وہ ہیل کی کتاب سے کہیں بہتر و صحیح تر کتاب تیار کر سکتا تھا!

حافظ اسلم صاحب میرے بڑے ہیں، اُن کی خدمت میں ادب کے ساتھ، نیازی صاحب چھوٹے ہیں، اُن سے خفگی کے ساتھ اور دونوں سے پورے خلوص کے ساتھ عرض ہے، کہ بات کی بچ کو چھوڑ کر، جو کچھ قلم سے نکل گیا ہے، اُس کی پاس داری کو چھوڑ کر، اپنے طرز عمل پر للہ ایک بار پھر غور فرمائیں۔ اپنے عقائد کا بدل دینا اگر خودداری کے منافی ہے، تو اس پر اصرار بھی نہیں، لیکن لاکھوں کروروں مسلمانوں کی دلآزاری و دل شکنی کا خیال تو بہر حال لازمی ہے۔ ''آج'' اگر آنکھیں طلسم فرنگ نے بند کر رکھی ہیں، تو ''کل'' جب یہ سحر سامری تار تار ہو کر رہے گا، بند نہ رہ سکیں گی۔ اُس وقت آنکھیں کھلیں گی، اور وہ وقت بڑی ہی حسرت کا ہوگا!

رہے جامعہ کے دوسرے اساتذہ اور شیخ الجامعہ، جو ماشاء اللہ مذہبی بھی ہیں اور مشرقی بھی، وہ آج سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے بعد، ایک ''طرفدارانہ ناطرفداری'' کے ساتھ اپنے توازن دماغی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ دردناک تماشہ پورے سکون قلب و اطمنان خاطر کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، اور اپنی زبانیں روکے ہوئے ہیں۔ جامعہ انھیں دل سے عزیز ہے، اور جامعہ کی

محبت میں وہ غرق وہ یہ سمجھ رہے ہیں، کہ کہیں اُن کی زبان کی جنبش جامعہ کے مقاصد و مصالح کو نقصان نہ پہونچادے۔ گو اسلام کے اصول پر، اللہ کے دین پر، رسول کی عزت پر کتنے ہی ناپاک اور گندے حملے ہوتے رہیں۔ خیر، بہتر ہے، اپنے مصالح کے لحاظ سے وہ آج خاموش ہی رہیں، لیکن ''کل'' ان کا یہی سکوت ٹوٹ کر رہے گا، اُس وقت خدا نہ کرے کہ اس وقت کی خاموشیاں اور مصلحت سنجیوں کی قیمت بہت گراں دینی پڑے!

(یکم ۲۵/اکتوبر ۱۹۲۵)

ایک گندی کتاب

جوش صاحب ملیح آبادی ثم پاکستانی کا شمار وقت کے مشہور بلکہ نامور شاعروں میں ہے اور اردو زبان پر انھیں عبور ہی نہیں کہنا چاہئے کہ حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے۔ علاوہ شاعری کے لغت کا کام بھی اچھا خاصہ کرسکتے ہیں بلکہ ایک بڑی حد تک انجام دے چکے ہیں۔ اب انھوں نے خدا معلوم کن نادان مشیروں کے کہنے سننے میں آکر اپنی ایک آپ بیتی ساڑھے پانچ سو صفحہ کی ضخامت کی ''یادوں کی برات'' کے نام سے لکھ کر شائع کردی ہے۔۔۔۔۔ یہ برأت اگر ہے تو کسی شریف مہذب نستعلیق شہری کی تو نہیں البتہ اجڈ اور دیہاتی گنواروں کی ہوسکتی ہے جو ٹھہرا، دارو، مہوے کی شراب پیئے ہوئے، گالی بکتے جھکتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان کے جسم ہیں کہ بوئے فحش کے بھبکے چھوڑتے جارہے ہیں ''برأت اگر اسی کا نام ہے تو تف ہے ایسی برأت پر۔

ابواب کتاب کی ترتیب نہ تاریخی ہے نہ منطقی نہ نفسیاتی۔ بس جو واقعہ جہاں یاد پڑ گیا بس وہیں اسے ٹانک دیا ہے۔ حافظہ جوش صاحب کا کسی زمانہ میں جیسا بھی رہا ہو۔ اب اس سن میں تو شائد بادہ خواری کی برکت سے اچھا خاصہ جواب دے چکا ہے اور نام شخصیتوں کے ہوں یا مقاموں کے ان کی مٹی اچھی خاصی پلید کی ہے..... حافظہ اب بغیر خارجی سہارے کے چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔ نتیجہ دانستہ اور نادانستہ بے تحاشہ غلط بیانیوں کے باعث یہ نکلا ہے کہ تضحیک اکثر خود اپنے ہی اوپر پلٹ پڑی ہے اور دوسروں پر تھپڑ مارنے والا اور تالیاں پیٹنے والا خود ایک اخحوکہ بن گیا ہے۔

زبان بحیثیت مجموعی اچھی اور بہت اچھی ہے اور ان کے سے ادیب کی شایان شان، اور بعض بعض ٹکڑے تو بے ساختگی کے لحاظ سے بے مثل و بے مثال ۔۔۔۔لیکن ایسا ہر جگہ نہیں ہے اور جو ٹکڑے خوش وقتی کے وقت میں لکھے ہیں وہ اختلال حواس کی نذر ہو گئے ہیں جیسے کہ ہر شرابی اور نشہ باز کے ہونے بھی چاہیے۔ ان پر بے تکلف حکومت آمد و تصنع اور تکلف کی قائم ہو گئی ہے اور کہیں کہیں قافیہ کے جوش و غلو میں دب کر عبارت مہمل بن گئی ہے اور کہیں کہیں لفظ قلم سے غلط نکل گیا ہے۔ ترکیبوں اور محاوروں میں کہیں کہیں تو بے شک جدت، ندرت، تازگی، حلاوت ہے لیکن کہیں کہیں غرابت اور بھدا پن ہے ۔

فحش پسندی قلم کی ہر جنبش پر غالب ہے، شاعرانہ تشبیہ بھی سوجھتی ہے تو بھکو قسم کی پھبتی ہو کر۔ شاعروں کے معتوبوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ کیا ہندوستان اور کیا پاکستان میں۔ سب اُن سے دبے ہوئے، لچے ہوئے، ان کے سامنے جھکے ہوئے یہاں تک کہ جواہر لال نہرو کے بھی سر پر پرچم جوش صاحب کا لہرا رہا ہے۔

انانیت کے بعد دو زبردست عفریت یا کالے دیو کتاب کے صفحہ صفحہ پر مسلط ہیں۔ ایک شراب نوشی دوسرے فحش کاری۔ شراب نوشی سے بڑھ کر دوسرا عذاب جو جوش صاحب نے قوم و ملت کے سر پر نازل کیا ہے وہ حرام کاری کا ہے بے دھڑک اور بے جھجک پروپیگنڈا یا پرچار ہے۔ انانیت، شراب نوشی، حرام کاری کی افراط کے بعد پھر جو جگہ باقی رہ گئی ہے وہ کذب بیانیوں اور جھوٹی قسموں کی نذر ہوئی ہے اور جھوٹی قسموں کو اس طرح سجا کر اور اس سج دھج کے ساتھ پیش کیا ہے گویا یہ بھی کوئی دلکش اور دل پذیر فن لطیف ہے کہ نوجوانوں کو چاہیے کہ اس کی طرف اپنی جھولیاں لے کر دوڑیں۔ اور زر بہا جتنا بھی مل جائے اس سے اپنی جھولیاں بھر لیں۔ آیا یہ زیٹ زیپٹ، یہ زٹل قافیہ، یہ رجز خوانی آج کچھ بھی کام دیئے جائے "کل" جب کشفِ حقائق کا وقت ہوگا۔ کچھ جوش صاحب نے سوچ رکھا ہے اس وقت کے لئے؟ کیا جواب ہوگا اس سوال کا کہ ہزاروں بے گناہ جو تمہاری اس تحریر سے بگڑے اور اپنی زندگی اس سے تباہ کر لی اس کی ذمہ داری کس پر ہے اور کون یہ سارا وبال بھگت کر رہے گا۔

کتاب فنی اعتبار سے کچھ یوں ہی سی ہے۔ ایک جگہ طلوع فجر کی منظر کشی کرتے ہیں:-

"تارے عجیب سوءِ مشاہدت ہے۔ چڑیوں کا چہکنا، ڈالیوں کا لچکنا اور مرغ کا اذان دینا یہ سب قرصِ آفتاب کے بلند ہونے سے کہیں پہلے ہو چکتا ہے" ۔۔۔۔اور پھر مرغان

سحر کی خالص فارسی ترکیب میں ان کا "بانگ دینا" اس سے عجیب تر بانگ دینا تو اردو والے مرغ کا کام ہے، فارسی میں مرغ پرندہ کے لئے عام ہے اور اس کا ترجمہ چڑیوں سے ہوگا نہ کہ مرغوں سے۔

جوش تشبیہات کے بادشاہ ہیں لیکن وہی جب تک تشبیہ سادہ اور مفرد ہو۔ تشبیہ مرکب یا تشبیہ در تشبیہ میں وہ الجھ کر رہ جاتے ہیں اور معنویت عبارت کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

کتاب جیسی کہ وہ ہے اسے لکھ کر جوش نے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا نہ اپنی ذات کے ساتھ، نہ اپنے خاندان اور بستی والوں کے ساتھ، نہ اپنی عفت مآب خاتون کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ کم وبیش ان سب کو بدنام ہی کیا ہے نام روشن کرنے والی کتاب اس کو کسی معنی میں بھی نہیں کہہ سکتے۔ کاش یہ کتاب جوش صاحب نے اپنے شاعرانہ کمالات پر لکھی ہوتی اور اس میں اپنے جتنے مناقب چاہتے بھر دیتے۔ اپنی تعلیوں کے لئے جتنی بلند رکھتے اور "کلیم" کے سابق ایڈیٹر کی حیثیت سے جتنی چاہتے "لن ترانیاں" بگھارتے۔ وہ کتاب پسند آتی یا نہ آتی "گوارا" تو بہر حال ہو جاتی۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کی شکل دیکھتے ہی نہ صرف بیزاری اور نفرت پیدا ہو بلکہ ساتھ ہی غصہ بھی آ جائے۔

جوش صاحب میرے لئے اجنبی و بیگانہ نہیں۔ وہ عزیز لکھنوی کے شاگرد ہیں اور عزیز سے مجھ سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ وہ حضرت اکبر کے نیاز مند رہ چکے ہیں اور ان کے میرے بہت سے احباب مشترک ہیں۔ وہ مرزا محمد ہادی رسوا کے پڑھائے ہوئے ہیں اور مرزا صاحب میرے بزرگ کرم فرما تھے۔ میں جوش صاحب کی نجابت و شرافت کا ہمیشہ قائل رہا اور وہ مجھ سے بھی مدتوں بطور ایک خورد کے ملتے رہے۔ غرض کہ ان کے متعدد رشتے اور واسطے مجھ سے ہیں اور ان کے بہت سے حق حقوق ہر پہلو سے قائم ہیں۔ ان کے خلاف لکھتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے اپنا والا میں نے اس کا اہتمام رکھا ہے کہ اس انتقادی تحریر میں بھی کوئی ناانصافی ان کے ساتھ نہ ہونے پائے۔ انھیں یقیناً اپنی بے راہ روی اور اس کی اہمیت و اشدیت کا آج احساس نہیں ہے۔

مقالہ کا عنوان میں نے ایک گندی کتاب رکھا ہے آپ چاہیں تو اسے ایک ننگی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں اچھا ہوتا اگر جوش صاحب اس کا نام فحشیات جوش رکھ دیتے۔

(۱۸ر جولائی، ۲ر اگست ۱۹۷۰ء)

فصلِ سوم

شذرات ماجدی

''روزہ'' اسلام کا اہم رکن

بہار کا موسم آتے ہی چمنِ دہر میں روح پرور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، خشک درخت سبز ہوجاتے ہیں، پھول کھلنے لگتے ہیں، جسمِ انسانی کی رگوں میں تازہ خون کی گردش ہونے لگتی ہے، سوئی ہوئی اُمنگیں جاگ اٹھتی ہیں، اور چستی وتوانائی کا دور دورہ شروع ہوجاتا ہے۔ جسم وماڈہ کی کائنات میں آفتاب کا ایک پورا دورہ گزر جانے کے بعد یہ موسم آتا ہے، اور طبیبوں کا بیان ہے کہ جسم سے مادّۂ فاسد کے دفع کرنے اور مُسہل لینے کا یہ بہترین زمانہ ہے، ٹھیک اسی طرح روح وجان کی کائنات میں بھی چاند کا ایک پورا دورہ گزر جانے کے بعد موسم بہار آتا ہے، ماہتاب کو عشق کے سوداز دوں سے مناسبت ہے۔ ظاہر ہے، ماہتاب جب اپنے سالانہ سفر کا چکر ختم کرتا ہے تو عشق ومحبت کی اقلیم میں پھر شوریدگی وجنون کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، اور سال کے گیارہ مہینے کے اندر غیریت کی جو کدورتیں جم جاتی ہیں، طبیعت ان کے دفع کرنے کے لیے بیقرار ہوجاتی ہے، اسی لیے رحمتِ کاملہ ومحبوبیتِ مطلقہ نے اپنے وفاشعاروں، اپنے سرمستوں کے لیے ایک خاص مہینہ، ماسوا سے بے تعلق وبے نیاز رہنے کا مقرر کردیا۔ جس کو اصطلاح میں ماہِ رمضان سے موسوم کرتے ہیں۔ ''یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم الصیام'' اے حسنِ ازل سے پیمانِ وفا باندھنے والو! اپنے محبوب کی یکتائی کا کلمہ پڑھنے والو! اگر اپنے دعوی میں سچے ہو، آؤ، اپنے طریقِ عشق وآئینِ الفت میں، ایک مہینہ تک ماسوا پر نظر کرنا تک ناجائز سمجھو، اور اپنی تمام نفسانی لذتوں کو اس بڑی اور حقیقی لذت کے تصور پر قربان کرتے رہو، کہ یہی نفسانی لذتیں اس شاہدِ حقیقی کے وصال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔

یہ شرط محض تمہارے ساتھ مخصوص نہیں، اکیلے تم ہی اس آزمائش میں نہیں ڈالے گئے ہو بلکہ تمہارے اگلوں میں سے جس جس گروہ نے ہم سے پیمانِ وفا باندھا، جس جس جماعت نے راہِ الفت میں قدم رکھنے کا دعویٰ کیا، اُن سب کو اپنے دعوے کا کچھ ایسا ہی ثبوت پیش کرنا پڑا ہے، ان سب کو کچھ ایسی ہی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، ہراساں نہ ہو، بہتوں کی آزمائش اسی طرح ہوچکی ہے۔ ''کما کتب علی الذین من قبلکم'' ۔اوراس حکم سے غرض تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں، تمہاری جان کو ہلکا کرنا نہیں، بلکہ مقصود صرف تمہاری فلاح و بہبود ہے۔ تمہارے ہی کمالات کی نشو ونما، اور تمہاری ہی ترقی ہے۔ تمہی میں ضبطِ نفس پیدا کرنا ہے۔ تمہی کو خواہشاتِ نفسانی پر حاکم بننے کی تعلیم دینا ہے، تمہاری پاکیزگی کی چھپی ہوئی قوت کو اُبھارنا، اور تمہیں حیوانیت کے غار سے ملکوتیت کے آسمان پر پہنچانا ہے۔ تمہاری بوالہوسی جو تمہاری خودداری پر غالب آجاتی ہے، اسی کو توڑنا منظور ہے۔ تمہاری ہی راہِ عروج میں ہر طرح کی سہولت پیدا کرنی مدِّ نظر ہے، اور تمہارے ہی چھپے ہوئے اندرونی دشمنوں، یعنی بدی کی طاقتوں کو ہلاک ونابود کرنا مقصود ہے۔ لعلکم تتقون۔ اور پھر یہ آزمائش بھی دائمی نہیں، تمہاری ساری عمر نہیں۔ کسی بڑی طویل مدت کے لیے نہیں، بلکہ صرف گنتی کے چند روز یعنی گیارہ مہینہ کے بعد، رمضان کا ایک مہینہ۔ ایاما معدودات۔

پھر ان عاشقین صادقین اور مؤمنین مخلصین میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو باوجود اپنے صدق وخلوص کے، اپنی جسمانی کمزوری یا پردیس میں ہونے کی بنا پر، آسانی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل نہ کرسکیں گے، ان کے لیے یہ آزمائش زیادہ سخت ہوگی۔ ایسے معذوروں کے لیے اس کی اجازت ہے کہ انھیں جب اطمنان وفراغت نصیب ہو تو اس ماہِ مبارک کے چھوٹے ہوئے روزوں کو پورا کرلیں۔ ''بلبل بیمار'' اگر اپنے جذبۂ دل میں صادق ہے تو اُس کے لیے سال کا ہر موسم، موسمِ گل کا حکم رکھتا ہے۔ فمن کان منکم مریضا او علیٰ سفر فعدّۃ من ایام اخر۔ بعض بیچارے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو بہ سبب اپنی جسمانی کمزوری یا کسی اور مجبوری کے ماہِ مبارک کے بعد بھی روزہ رکھنے میں سخت مشقت محسوس کرتے ہیں۔ ایسوں کے لیے یہ رعایت ہے کہ وہ اپنی معذوری کے کفارہ کے طور پر کسی

صاحبِ احتیاج کو پوری طرح کھانا کھلا دیا کریں. وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین اس رخصت واجازت کے باوجود اگر کوئی شخص محنت ومشقت گوارا کر کے اس بڑی نیکی یعنی روزہ اختیار کرتا رہے، یا ایک مسکین سے زائد کو کھلاتا پلاتا رہے، تو اس کے مرتبہ کا کیا پوچھنا. ایسی نیکی جو فرض نہ رہی ہو، اگر اختیار کی جائے تو اس کے افضل وبرتر ہونے میں کیا شبہ. فمن تطوع خیرا فهو خیر له. یہ ایک عام اصول بتایا گیا. باقی اگر روزہ کی حقیقت پر نظر ہو جائے، روزہ سے جو باطنی ترقیاں مقصود ہیں. اگر ان کا علم ہو جائے تو کون ایسا ہے جو ایک روزہ کی جانب بہ شوق ورغبت نہ دوڑے۔

یہ ماہِ مبارک صرف اسی لحاظ سے مبارک نہیں کہ اس میں انسان صبر وضبط کی خدائی طاقتوں سے نوازا جاتا ہے بلکہ اس خیر وبرکت والے مہینہ کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اسی ماہ میں اول اول دنیا کے لیے بہترین کامل ترین، وجامع ترین ہدایت نامہ اتارا گیا. اسی چاند میں انسانیت کے ظلمت کدہ کو نورانیت کے بدرِ کامل سے پُر انوار بنایا گیا، اور اسی بابرکت موسم میں انسان کے کان میں پہلی بار نغمہ ازل کی سُریلی آواز، بیہوشوں کو بیدار اور ہوشیاروں کو مست کرنے والی پکار پہنچی، جس سے بڑھ کر کوئی دولت، جس سے اونچی کوئی نعمت، جس سے برتر کوئی رحمت عالمِ تصور میں بھی موجود نہیں. شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن هدی للناس وبینٰت من الهدی والفرقان قیس عامری کے پاس اگر لیلیٰ کا کوئی مکتوب یا پیام آجاتا، تو کس طرح وہ اپنی جانثاری کرنے کو تیار ہو جاتا اور اس مبارک گھڑی کو کس قدر عزیز رکھتا! حسنِ ازل کے شیدائی بھی، نامۂ یار کے ورود کے زمانہ کو کیوں کر بھول سکتے ہیں. جب جب یہ زمانہ آئے گا، اس کی یاد میں بیتاب ہو جائیں گے، اور اس پاک گھڑی کی پاک سالگرہ منانے میں اپنی بھوک پیاس تک کو بھول جائیں گے. فمن شهد منکم الشهر فلیصمه.

موسمِ بہار کی فرحتیں، طراوتیں اور نشاط انگیزیاں، بڑے سے بڑے افسردہ دلوں تک میں امنگ پیدا ہی کر دیتی ہیں اور گل وگلزار کی سَیر سے کوئی محروم رہنا نہیں چاہتا. ماہِ مبارک کی برکتوں، فضیلتوں اور نعمتوں کا ذکر سن کر بڑے سے بڑے بد ہمت اور افسردہ دل کی رگوں میں جوش پیدا ہو جانا

اور بڑے سے بڑے فرزانہ و دور اندیش میں شورش و شوریدگی کا اُبھر آنا قدرتی ہے۔ حالانکہ یہ آزمائش صرف ان کے لیے ہے جو اس کی جسمانی قوت بھی رکھتے ہیں۔ معذوروں پر خواہ مخواہ بارِ مشقت ڈالنا ہرگز مقصود نہیں۔ ان کے جذبۂ شوق کی تسکین دینے کے لیے ایک بار پھر اس ارشاد کی ضرورت ہوئی کہ معذوروں کو ان دنوں کی گنتی بعد میں پوری کر لینی چاہیے کہ مقصد آسانی راہ ہے، نہ کہ تنگی۔ اللہ کی بڑائی کرتے اور اس کا شکر ادا کرنے کا مقصد، بعد کو بھی گنتی کے دن پورے کر لینے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ومن کان مریضا او علیٰ سفر فعدّة من ایام اخر ۔یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدة ولتکبروا اللہ علیٰ ماھدٰکم ولعلکم تشکرون ۔

یہ پر بہار موسم جب کسی کے شوق و ارمان میں گزرے گا۔ یہ متبرک گھڑیاں جب کسی کی یاد میں بسر ہوں گی، یہ مبارک دن جب کسی کے اشتیاق میں بغیر بھوک پیاس کے صرف ہوں گے، یہ برکت والی راتیں جب کسی کے انتظار میں آنکھوں ہی میں کٹیں گی، تو ناممکن ہے کہ روح میں لطافت، قلب میں صفائی، اور نفس میں پاکیزگی پیدا نہ ہو جائے۔ حیوانیت دور ہوگی، ملکوتیت نزدیک آئے گی اور انسان خود اپنی ایک جدید زندگی محسوس کرے گا، ایسی حالت میں بالکل قدرتی ہے کہ سوزِ دل اور تیز ہو جائے، قُرب و وصل کی تڑپ اور بڑھ جائے، تزکیہ و مجاہدہ کے اثر سے، زنگ دور ہو کر، کسی کا عکس قبول کرنے کے لیے آئینۂ قلب بے قرار و مضطر ہونے لگے۔ ٹھیک یہی گھڑی ذوقِ طلب اور ذوقِ عطا، سوال اور اجابت، دعا اور مقبولیت، حاجت مندی اور کریمی، گدائی اور شاہی، بندگی و بندہ پروری کے درمیان ناز و نیاز کی ہوتی ہے، اس لیے قدرۃً اس منزل پر پہنچتے ہی حجلۂ غیب سے یہ صدائے بشارت کان میں آنے لگتی ہے کہ اے ہمارے پیام کے پہنچانے والے! ہمارے شیدائی، ہمارے پرستار، ہمارے بندے! اگر تم سے ہمارا پتہ پوچھیں تو اُن کو بتا دو کہ ہم اُن سے کچھ دور نہیں، ہم تو ان سے بہت ہی قریب ہیں، ہمیں دل کی تڑپ کے ساتھ پکاریں تو سہی، ہم فوراً اُن کی پکار کو سنیں گے۔ وہ صرف ہم سے اپنی لَو لگائے رہیں، اور ہم پر بھروسہ رکھیں، اس سے وہ سیدھی راہ پا کر اور منزل مقصود تک پہنچ کر رہیں گے۔ واذا سألک عبادی عنی فانی قریب ط اجیب دعوة الداع اذا دعان

فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون .

(تفسیر ماجدی جلد اول ص:۵۲۵ بحوالہ سچ ۳ر اپریل ۱۹۲۶ء)

یہ قومی دھارا

آوازیں مدت سے فضا میں بلند ہو رہی ہیں اور کبھی لہجہ میں تندی اور خشونت کی بھی آمیزش کے ساتھ کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ بے تأمل قومی دھارے میں شامل ہو جائیں کہ ان کے ہر دکھ کا علاج اسی میں ہے اور ایک معلوم و معروف سابق مرکزی وزیر نے تو اس منتر کو اٹھتے بیٹھتے اس کثرت سے پڑھا کہ لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ کہیں یہ ان کا تکیہ کلام تو نہیں ۔۔۔۔۔لیکن اس کثرت اور تکرار کے بعد بھی نہ کھلا کہ ''یہ قومی دھارا'' امرت دھارے کی طرح آخر ہے کیا بلا؟ بہتر یہ ہوگا کہ آج دو چار منٹ ذرا اس کی تشریح کی نذر کر دیئے جائیں۔

اس ''دھارے'' سے مراد اگر یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی ہندوستان سے محبت رکھیں، جیسے دوسرے لوگ کرتے رہتے ہیں. اپنے ملک کی سرزمین سے محبت اور لگاؤ ہونا تو ایک امرِ طبعی ہے. دیہاتی کا دل اپنے گاؤں کے جھونپڑے میں لگا رہتا ہے اور شہر کے رئیس کا دل اپنی کوٹھی سے، تو اس میں کسی تعلیم و تبلیغ کا کیا موقع ہے. اور یہ تو بوڑھے بچے سب ہی کرتے ہیں کیا اس سے مسلمانوں کی کسی بھی ذمہ دار جماعت نے انکار کیا ہے؟ کیا مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں کہیں یہ مسئلہ بھی بیان ہوا کہ جس ملک میں پیدا ہوئے ہو اس کا کوئی بھی حق اپنے اوپر نہ سمجھو بلکہ اس کی بدخواہی ہی کرتے رہو۔

محبت اور فطری لگاؤ کو چھوڑیئے کیا اسلام کے قانون نے اس کی اجازت دی ہے کہ مسلمان جس ملک کے قانون کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں اور امن حاصل کئے ہوئے اس کے قانون و آئین کو توڑتا رہے. چھپ کر اور کھل کر اس کے نظام کو درہم برہم کرتا رہے. اس میں بدامنی پیدا کرتا رہے. قریہ قریہ، شہر شہر فتنہ و فساد کی آگ کو ہوا دیتا رہے. اور ملک کے نام کو روشن کرنے کے بجائے اس کی بدنامی، بدخواہی، رسوائی میں لگا رہے!

لیکن اگر قومی دھارے سے مراد یہ ہے کہ مسلمان بھی گائے کی تقدیس کا کلمہ پڑھنے لگیں. اس کے گوبر اور اس کے پیشاب کے دوائی اور شفائی خواص کے معتقد ہو جائیں. گنگا ندی کا احترام ماں کی طرح کرنے لگیں. اس کے پانی کو ہاتھ میں لے کر اس پر حلفیہ بیان دینے لگیں. ہر درس اور درسگاہ کا افتتاح سرسوئی جی کی پوجا سے کرنا شروع کر دیں. ناریل توڑنا ایک مبارک افتتاحی رسم قرار دے لیں. تقریبات کی تاریخیں حساب جیوتش سے مقرر کرنے لگیں. پیپل کے درخت کو مقدس قرار دے لیں. بندر کو ہنومان جی کے روپ میں سمجھیں، سانپ کی پوجا کرنے لگیں. انسانی آبادی کے بہت بڑے حصہ کو نجس اور ناپاک سمجھ لیں. ان کے ساتھ کھانا پینا حرام سمجھ لیں. کروروں انسانوں کے اچھوت ہونے کے قائل ہو جائیں. کروروں کو حقیر اور مرتبۂ انسانیت سے کہیں فروتر نہ سمجھنے لگیں. ملک کے باہر سے آئی ہوئی ہر روحانی، تہذیبی اخلاقی تحریک کو حقارت سے بدیسی کہہ کر ٹھکرا دیں. انسانی برادری کے سرے سے منکر ہوں. اور اس میں طرح طرح کے تفرقے ڈال کر بے شمار گروہ بندیوں کے قائل ہو جائیں. سلام بجائے داہنہ ہاتھ سے کرنے کے نمستے یا نمسکار نکالیں. ہولی میں ایک دوسرے پر رنگ ڈالیں. طرح طرح کے سوانگ نکالیں اور آپس میں گالیاں بکیں. غرض کہ مسلمان اپنے ملی شعائر وخصوصیات کو ترک کر کے ہندو تہذیب ومعاشرے کی بالادستی کو تسلیم کر لیں. اپنے کو ہندو ثقافت (سنسکرتی) میں جذب کر دیں اور جہاں تک اسلامی تہذیب وتمدن کا تعلق ہے اس سے ارتداد اختیار کر لیں! تو کیا یہی وہ قومی دھارا ہے جس کی دعوت دی جا رہی ہے۔

(۱۳/اکتوبر ۷۲ء)

فرنگی جمہوریت یا اسلامی شوریت

اسلامی شوریت میں خلیفہ پر نکتہ چینی کا حق ہر فردِ امت کو ہر وقت بلا کسی قید واستثناء کے حاصل رہتا ہے. فرنگی جمہوریت کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ صدر پر نکتہ چینی کا حق کروروں میں سے صرف چند سو تک محدود رہے! اور وہ چند سو اپنے اس حق کا استعمال صرف پارلیمنٹ کے کمرہ کے اندر کر سکیں گے اور اس کے باہر کہیں نہیں اور وہ بھی جس زمانہ میں پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا ہے لمبی یا مختصر تعطیل نہ ہو۔

جن ملکوں کی جمہوریت ہر طرح آراستہ و پیراستہ ہے اور جن کا سیاسی نمبر خوب تربیت یافتہ ہے. خود انھیں کا حال کیا کم عبرت آموز ہے. نفاق و شقاق کی ہر روز ہ ترقی دیکھ کر چہ جائیکہ ایسے ملکوں کی جمہوریت جو ایک طرف نقالی کی منزل میں ہے اور جہاں الیکشن کا زمانہ بے پناہ شور و شغب، بھر پور گالم گلوچ اور پورے بغض و عداوت کا ریکارڈ قائم کر دیتا ہو. اور جہاں سنجیدگی اور دیانت کے ساتھ مسائل پر غور و فکر کے بجائے سارا زور بدزبانی اور شوریدہ سری پر ہو اور جہاں بات بات پر نئی نئی پارٹیاں گھانس پھونس کی طرح اگتی ہوں. اور جہاں یہی نہیں کہ کچھ لوگ مستقل اکثریت اور کچھ لوگ مستقل اقلیت میں ہوں بلکہ جہاں مستقل اچھوت بھی بستے ہوں اور جہاں دلائل سے زیادہ تکیہ بم اور چھرے پر ہو! ایسے ملکوں میں جمہوریت کو نعمت قرار دینا لفظ ''جمہوریت'' کی مٹی پلید کرنا ہے. ہاں جی چاہے تو ناگزیر مصیبت کے بجائے ناگزیر بے چارگی کہہ لیجئے. مغربی جمہوریت کے اولین بانیوں اور اصولی مفکرین ملؔ، بینتھم وغیرہ کی تحریریں بھی پڑھ لیجئے. پڑھنے میں دلچسپ نظر آئیں گی اور جوانوں کے خون کو گرم کر دینے والی بھی، لیکن ٹھوس حقائق کے لحاظ سے کچھ بے مغزسی!

(۲۳؍جولائی ۷۱ء)

ایک ضخیم ناول

''لہو کے پھول'' کے آخر معنی کیا ہے؟ اور معنی اگر ٹھونس ٹھانس کر پہنا بھی لیجئے تو آخر کیا یہ احساس مردہ کر لیجئے! ترکیب کی غرابت کا، بندش کی ثقالت کا، لفظ کی رکاکت کا، تلازمۂ علیگڈھ کے روزمرہ میں ''بور'' ہونے کا بھی! ظالم لکھنؤ ہی علیگ کو اپنا نام بھی نہ سوجھا!۔۔۔۔ ''فسانۂ حیات'' کیسا رہتا ہلکا پھلکا، ڈھلا ڈھلایا، ڈُھلا ڈُھلایا، سلیس، بلیغ، لطیف، لذیذ، ہر تکلف سے خالی، ہر تصنع سے ماورا!

قدح کے بعد مدح ''عیبِ مے'' کے بعد ''ہنرش نیز بگو'' دو چیزوں کا مصنف کو ملکہ ہے. ایک تو کتاب میں بار بار ذکر سرکاری شکارگاہوں شکار پارٹیوں کا آتا ہے اور مصنف نے ہر جگہ مصور بلکہ نوکِ پلک کے ساتھ عکاسی کا حق ادا کر دیا ہے. گویا پڑھنے والوں کو عین شکارگاہ کے اندر کھڑا کیا

ہے اور جنگل میں منگل کا ریکارڈ قائم کر رہا ہے۔

ایک چیز تو یہ ہوئی۔ دوسری لکھنؤ کے بعض پرانے نوابی گھرانوں کی تصویر کشی، بیگمات کے ٹھٹے، نواب صاحب کے چونچلے، مغلائی اصیلوں کی چخ چخ، خدمت گاروں کارندوں کے جوڑ توڑ، یہاں مصنف کی لکھنویت پھسپھسی اور اونگھتی ہوئی نہیں بلکہ جیتی جاگتی خصوصیت کے ساتھ وہ مزے دے جاتی ہے کہ آخر

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

اور سب سے بڑھ کر سب سے برتر ایک ذری سی ترکیبِ لفظی جس نے کتاب بھر میں جان ڈال دی ہے اور زمین کو ہم مرتبہ آسمان بنا دیا! کتاب کا انتساب اپنی رفیقِ زندگی کے نام کیا ہے لیکن دیکھئے نہ کسی لقب سے نہ کسی اور نام ونشان سے بلکہ صرف ''حاصلِ حیات، شریکِ حیات سلطانہ کے نام''

چہیتی بیوی کے لئے چھانٹ کے صرف ''حاصلِ حیات'' واہ حضرت حیات اللہ! سبحان اللہ! اس ایک ذہن کی رسائی نے سیکڑوں نارسائیوں کی تلافی کر دی! اور لکھنؤ کے بانکپن کی لاج رکھ لی! ۔۔۔۔ نہ ہوا یہ دہقانی تبصرہ نویس کسی راج کا راجواڑہ، کسی ملک کا اعلیٰ حضرت قدر قدرت، ورنہ درباری شاعروں، منشیوں، بذلہ سنجوں کی طرح اس سوشلسٹ اہلِ قلم کا منہ موتیوں سے بھر دیتا۔

(۸ جنوری ۱۹۷۱ء)

ایک اصولی بحث

ایک مسلمان ریاستی وزیر کی تقریر ایک مقام پر ہوئی ہے اس میں بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا

''اگر پاکستان کے سر میں درد ہوتا ہے تو آپ کے سر میں کیوں درد ہونے لگتا ہے؟''

جواب مختصر، سادہ اور صحیح یہ ہے کہ صرف اس لئے کہ.....وہ بھی ہماری طرح کے مسلمان ہی ہیں''۔ اس جواب پر نہ شرمایئے نہ جھجکئے۔اس کو دہرایئے۔سوال اس کے خاطی وغیر خاطی ہونے، حق ناحق پر ہونے کا ہرگز نہیں صرف بھائی پن کے رشتہ کا ہے!

بھائی اور بیٹے کی محبت تو طبعی ہے اور ان کی ہر تکلیف پر ہمارا دل دکھے گا یہ احساس فطری ہے۔ مسلمان کہیں کا بھی ہو اور کیسا ہی ہو بہر حال ہمارا بھائی ہے۔یہ کسی فقیہ کی رائے نہیں۔کسی حدیث پر اس کی بنیاد نہیں کہ اس کے استناد واسناد پر بحث چل سکے۔تو بلا کسی قید وشرط کے قرآن کی صریح نص ہے۔ انما المؤمنون اخوۃ مسلمان تو بس بھائی بھائی ہے

لڑکا اگر مجرم ہے اور باپ حاکم عدالت تو باپ خواہ خون کے آنسو روئے گا مگر فیصلہ وہی کرے گا جو قانون وعدل کے مطابق ہو۔ملک پر اگر کوئی حملہ آور ہوگا تو مسلمان بھی اس کے دفاع میں برابر کے حصہ لے گا خواہ اس کے دل پر جو کچھ بھی گزرتی گزر جائے۔منسٹر صاحب کو وہ لغو سوال چھیڑنے سے قبل یہ دل میں سوچ لینا تھا۔دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں۔

(۲۶؍نومبر ۷۱ء)

شوقِ مرگ

حدیث کے مختلف مجموعوں میں (اور انھیں میں مسند احمد بھی ہے) یہ روایت نظر سے گزری ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا جب وقت موعود آیا تو حضرت عزرائیل اپنا فرض منصبی انجام دینے کو آموجود ہوئے۔حضرت خلیل اللہ نے فرمایا کہ میری طرف سے یہ عرض کردینا کہ کیا خلیل، خلیل کی جان لے لیتا ہے۔فرشتۂ موت نے جاکر یہ عرض رسانی کردی۔ادھر سے جواب یہ ارشاد ہوا کہ کیا خلیل جب خلیل کو بلائے تو وہ آنے سے پہلو تہی کرتا ہے ظاہر ہے کہ اب کسی مزید پیام کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور خلیل نے خوشی خوشی فوراً گردن تسلیم خم کردی۔۔۔۔۔حدیث بہ لحاظ اسناد جس درجہ کی ہو اسے محدثین جانیں لیکن یہ جورس اور مٹھاس اپنے اندر رکھتی ہے۔وہ دونوں وجد آفریں ہیں۔موت کی یہی حقیقت اگر انسان کی سمجھ میں آجائے تو خدا گواہ ہے کہ موت سے بڑھ کر لذیذ چیز کوئی دنیا میں رہ ہی کیوں جائے!

(۷؍جنوری ۷۲ء)

بیماری کی حلاوتیں

عنوان سے یہ شبہ نہ ہو کہ بیماری میں تکلیف نہیں ہوتی ہے، تکلیف کیا معنیٰ تکلیفیں بہ صیغۂ جمع ہوتی ہیں اور خوب ہی ہوتی ہیں کبھی ہاتھ چلنے لگتے ہیں، کبھی پیر بالکل ٹھنڈے، یہ بہر صورت تکالیف ہیں۔ غذا الگ نہیں ہو پاتی۔ بھوک لگنا الگ رہا، غذا سے الٹی بے رغبتی اور بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔ کھانے کے خیال سے شل ہونے لگتی ہے۔ ہر قسم کے مشروب یہاں تک کہ پانی سے بیزاری ہو جاتی ہے۔ پیشاب، پائخانہ کسی چیز پر قابو نہیں رہتا۔ نیند اڑ جاتی ہے۔ جسم کے ہر ہر حصہ میں درد ہو جاتا ہے۔ چین نہ چت لیٹنے میں، نہ پٹ لیٹنے میں، نہ کسی کروٹ میں، بیٹھنا لیٹنا ہر چیز ایک مجاہدہ معلوم ہوتی ہے۔ بات کرنے بلکہ آنکھ کھولنے کا جی نہیں چاہتا۔ ملنا جلنا بھی سخت ناگوار ہو کر رہتا ہے۔ اور یہ تو عام اور نمونے کی طرح کی چند چیزیں ہوئیں کُل تکلیفوں اور بے چینیوں کا شمار ہی کون کر سکتا ہے۔

کہنا صرف یہ ہے کہ ان بے شمار جسمانی تکلیفوں آزاروں کے ساتھ ہی ہر مؤمن کو ایک بے پناہ حلاوت بھی نصیب ہوتی ہے اور اس حلاوتِ وجدانی وقلبی کا احساس درجۂ ایمانی سے ہے۔ جس کا درجۂ ایمان جتنا قوی ہے اسی نسبت سے اس کی عبدیت بھی بڑھتی رہتی ہے۔ اللہ اللہ! اس بے بسی کا کیا ٹھکانہ کہ کروٹ بھی اپنے اختیار سے نہیں لی جاتی۔ نہ کسی گندگی کی روک تھام پر ذرا بھی قدرت، ہم واقعی اس درجہ بے بس ہیں۔ جس کا کوئی سا بھی عضو اپنے اختیار واقتدار میں نہیں۔ ہم اس درجہ کے بے قدرت، بے ثبات، بے زور ہیں! اے اللہ! سانس تک پر اپنا بس نہیں ابھی منظم ومنضبط رہی تھی، ابھی بے قاعدہ ہو گئی رُک رُک کر چلنے لگی اور دیکھتے دیکھتے بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئی۔ عبدیت کا احساس ہر مؤمن کا کامل سے کامل تر ہوتا رہتا ہے۔ فنا سے قبل ہی فنائیت طاری! حقیقت کا اس درجہ کھلا احساس! ۔۔۔۔ اور اپنے مالک ومولیٰ کی طرف سے مطلق کوئی بے التفاتی نہیں، بلکہ شفقت وتوجہ ہر قدم پر ساتھ دینے والی۔

(۱۵ر ستمبر ۷۲ء)

لذتِ غم نہ رہی.....

یکم جون کا قومی آواز جب موصول ہوا تو دیکھتے کیا ہیں کہ لوح پر نام بجائے حیات اللہ انصاری صاحب کے ایک دوسرے صاحب کا درج ہے۔ ارے تو کیا انصاری صاحب اپنے دیرینہ روزنامے سے رخصت ہو گئے! نہ کوئی اس کا اعلان اور نہ کوئی وداعی پیام۔ اکثر نے تو لوح پر درج نئے نام کو پڑھا بھی نہ ہوگا حالانکہ کوئی ۲۶، ۲۷ سال سے تو حیات اللہ انصاری اور قومی آواز لازم وملزوم تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی ایک کا تصور کرتا اور دوسرے کو تصور میں نہ لاتا۔۔۔۔ آہ! یہ دنیا اور اس کے سارے تعلقات، سارے رشتوں اور سارے بندھنوں کی بے ثباتی!

انصاری صاحب جو کچھ تھے اور جیسے کچھ تھے یہاں اس پر تبصرہ مقصود نہیں، صدق کے تعلق سے وہ جیسے کچھ تھے اس پر تو بے اختیار ایک شعر مرزا محمد ہادی رسوا کا یاد آجاتا ہے ؎

جیتے جی اس کے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں
لذتِ غم نہ رہی غیر کے مر جانے سے

(ایضاً)

بے برکتی

۳۰، ۳۵ سال پہلے آپ کی قوم کے بڑے بڑے عاقلوں اور دانشوروں نے رائے یہ قائم کی کہ ساری خرابیوں، بدحالیوں فسادوں کی جڑ یہ ہے کہ ملک کی حکومت غیر ملکی انگریزوں غاصبوں کی ہے۔ اگر یہ حکومت اپنی ہو جائے تو خزاں بہار میں تبدیل ہو جائے۔ کانٹوں کی جگہ پھول کھل جائیں۔ سب نے مل کر زور لگایا اور آرزو پوری ہوگئی۔ حکومت اپنی ہوگئی۔ فرنگی لٹیرے ۱۹۴۷ء میں واپس چلے گئے اور بڑے بڑے عہدہ پر بجائے ولایتی کے دیسی چہرہ نظر آنے لگے۔۔۔۔ جھگڑے اور فساد بجائے ختم ہونے کے کم بھی نہ ہوئے بلکہ ان بلوؤں، فسادوں اور خونریزیوں میں دوگنے چوگنے کا نہیں بیسیوں بلکہ پچاسوں گنے کا اضافہ ہو گیا۔ گھر گھر، شہر شہر خون کی ندیاں بہہ گئیں!

ریل، ڈاک، پولیس سب اپنے ہاتھ میں آ گئے۔ ریل کے وقت کی پابندی ایک خواب وخیال ہوگئی۔ اتوار کی ڈاک کی چھٹی کے باوجود ڈاک کی کارکردگی اور کارگزاری ایک افسانہ بن گئی۔ ڈکیتیوں، چوریوں، مار پیٹ، ضرر رسانی، آتش زنی، حرام کاریوں، مقدمہ بازیوں کی ایک رو چل گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کس غضب کا عناد پڑوسیوں کے دلوں میں برسوں بلکہ پشتوں سے بھرا چلا آتا تھا۔ جواب اکبارگی اُبل پڑا۔ ہر ریاست دوسری ریاست سے ٹکرانے لگی۔ گجرات، مہاراشٹر کا دشمن جان نکلا، میسور اور مہاراشٹر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نکلے۔ بنگال اور بہار پشتینی حریف نکلے۔ پنجاب اور ہریانہ خون سے ہولی کھیلنے پر تیار نکلے۔ ایک ہی ریاست کا مشرقی حصہ مغربی سے الجھ پڑا اور جو بے زبان تھے وہ بدزبانی اور زبان درازی کے جوالا مکھی نکلے!

دودھ، دہی، گھی، بالائی کا قحط پڑ گیا۔ کیسے کیسے مصنوعی یا جعلی گھی نکل پڑے۔ شہد جیسے اس دیس میں بوتا ہی نہ تھا۔ غلہ بھی باوجود بارش کے ہر روز گراں سے گراں تر۔ نان، پلاؤ، بسکٹ، شیرمال، کلچے، سونے کے مول۔ سونے کی شرح، اور ولایتی میوے بادام، پستہ، اخروٹ اور چلغوزہ کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ پیاز، لہسن، ہلدی، کتھا، چونے کے نرخ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے۔ شکر اور مٹی کا تیل بازار سے سرے سے غائب اور کپڑے کی قیمت کی پہلے سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔ بجلی نام کی ایک ایک شہر اور قصبہ میں عملاً ۲۴ گھنٹہ میں ۱۸، ۱۸ گھنٹے غائب اور جب دیکھیے تو بجلی گھروں میں اندھیرا گھپ!

ہائی اسکول بلکہ کالج ہر بڑے قصبہ میں یونیورسٹیاں تک آدھے شہروں میں موجود لیکن پرائیویٹ ٹیوٹر کوئی ڈھونڈنے نکلے تو ایک بھی پایئے! تنخواہیں اور اجرتیں کیسی کیسی دلآویز اور دلفریب موجود لیکن کسی شعبۂ معاشرت ومعیشت میں بجائے سہولتوں کے دشواریاں بڑھتی پایئے۔ ڈاک میں ایک پیسہ میں کارڈ سارے ملک کا سفر طے کر آتا تھا اب دس گنا محصول لگنے لگا اور ڈاک کتنی دیر میں پہونچ پاتی ہے اور ہڑتال کا سا معذوری حربہ کیسا ایجاد ہوگیا ہے۔ جسرات الارض میں دیمک اور ٹڈی دل کا پورا جواب انسانوں نے تیار کرلیا ہے۔ ڈاک وتار، ریلوے، ڈاکٹروں، ریل کے قلیوں، رکشاوالوں، تانگہ والوں بس والوں سب ہی کی ہڑتالیں اور اب ریلوں پر قزاقی اور ڈکیتی سے سفر چھوٹا بڑا کتنا خطرناک تر ہوگیا ہے!

مڈیکل کالج یونیورسٹی ہی کی طرح ہر بڑے شہر میں عام ہوتے جارہے ہیں۔ایک یوپی ہی میں لکھنؤ اور آگرہ کی طرح کان پور،علی گڈھ، بنارس وغیرہ سب کہیں ڈاکٹروں کی کھیپ تیار ہورہی ہے لیکن علاج میں دشواریاں اور پیچیدگیاں برابر بڑھتی جارہی ہیں۔اردو کی مستقل اکیڈمی ریاست میں قائم ہوگئی ہے لیکن رسم الخط کا عام چلن نہ ہونے کے برابر ہے۔اور تختیوں پر اردو کے غائب ہونے اردو سے اردو والوں کو اپنے ہی صوبہ میں اندھا ہوکر رہنا پڑرہا ہے۔۔۔۔۔ان ساری محرومیوں اور حرماں نصیبوں کے لئے ایک عام لفظ ''بے برکتی'' نہ استعمال کیجئے تو اور کیا کیجیے۔اپنے بچپن کے زمانہ میں ہر زبان پر یہی لفظ تھا۔اور اب قلتِ استعمال سے یہ لفظ لغت سے خارج ہو چکا ہے اور تعصب اور بے تعصبی کی طرح برکت اور بے برکتی کے معنی اٹھ گئے ہیں۔

(صدق جدید ۲۲ر فروری ۷۲ء)

بیٹی سے خطاب

ہاں تو سن اے لڑکی! آج جو تو باپ اور چچا کے ہاتھوں اپنی آزادی کو قید میں تبدیل ہوتے دیکھ رہی ہے، اور اپنا گھر اجاڑ کر دوسرے کا گھر آباد کرنے جارہی ہے، یہ صحیح ہے کہ بے فکری کی جو نیندیں اب تک سوئی وہ آج ختم ہورہی ہے، جسے آنکھ کھول کر اپنا گھر سمجھا تھا چھوٹ رہے ہیں وہ در و دیوار جہاں پیدا ہوئی، پلی بڑھی۔الگ ہورہا ہے وہ مکان جہاں عمر کی اتنی منزلیں گزاریں ہنس ہنس کر اور کھیل کھیل کر۔جدا ہورہا ہے وہ گھروندا جسے گرمیوں، چھاؤں اور جاڑوں کی دھوپ میں سینکڑوں بار سجایا سنوارا۔جہاں بیٹھ بیٹھ کر بارہا اپنی گڑیوں اور گڈوں کو مانگا اور بیاہا۔پرایا ہورہا ہے وہ صحن جس میں مدتوں دوڑی، کھیلی، گری۔بے وفا نکل رہا ہے وہ دالان، جن میں بارہا ضدیں کیں، مچلی، روئی۔ چھوٹ رہا اس گھر کا کونا کونا، جہاں بھائیوں سے لڑی، بہنوں سے بگڑی، ماں سے روٹھی۔آنکھیں ترسیں گی ساری عمر ساتھ کی جھولا جھولنے والیوں کو۔دل ڈھونڈے گا زندگی بھر، پاس بیٹھ بیٹھ کر اور لیٹ لیٹ کر کہانی سننے والیوں کو!

ہاں تو سن اے بچھڑنے والی اللہ کی بندی، اور خود رو رو کر گھر بھر کو رلانے والی آماجِ الٰہی۔

سن اور سمجھ اپنی اور سب کی ماں عائشہ صدیقہؓ کی حکایت کو! اس وقت سے بچنے کی کوئی صورت ممکن ہوتی، تو امت کی لڑکیوں میں اس کی حقدار سب سے بڑھ کر ابوبکرؓ ہی کی بیٹی ہو سکتی تھیں، اور یا پھر ان سے بھی بڑھ کر آقائے ابوبکرؓ کی صاحبزادی. اور پھر جب عائشہ اور فاطمہ کو اسی راہ پر چلنا پڑا، تو دنیا کی کسی اور لڑکی کی بساط کیا ہے؟ ان کی کنیزی تیرے لیے باعثِ فخر، اور جو قدم ان کی پیروی میں اٹھ سکے تیرے لیے سرمایۂ نجات! آنسو، رنج کے نہیں، خوشی کے بہا، کہ آج پیروی کس کی نصیب ہو رہی ہے! صدیقہ کہاں سے کس مرتبہ پر پہنچیں! عالم نسوانیت کی سرتاج بن کر رہیں! مبارک ہیں امت کی وہ لڑکیاں، جن پر ان کا اور خاتونِ جنت کا سایہ بھی پڑ جائے! اور پھر تیری قسمت میں تو مہینہ بھی وہی آیا، جو سنہ عیسوی میں حضرت صدیقہؓ کے لیے تھا. مبارک تر ہے وہ لڑکی، جس کی زندگی کا نیا دور اس خوشحالی کے ساتھ شروع ہو رہا ہو۔

جدا ہونے والی صبر و شکر کی پتلی! آج جس سادگی اور خاموشی سے یہ بزم نکاح ترتیب پا رہی ہے عجب نہیں کہ اس پر خود غربت و مسکنت کو ترس آ گیا ہو، شادی کی محفل اور اتنی سونی! بیاہ کا گھر اور اتنا سناٹا! دروازہ پر نہ موٹروں کا ہجوم، نہ ہاتھی گھوڑوں کی دھوم. نہ ''ایٹ ہوم'' کا سامان، نہ دعوتوں کے خوان. نہ ہوم ممبر، نہ صوبہ کے منسٹر، نہ ضلع کے کوئی اعلیٰ عہدہ دار، نہ قرب و جوار کے کوئی رئیس تعلقدار. ڈپٹی کلکٹر کی لڑکی اور ڈپٹی کلکٹر کی پوتی، تو خیر بڑی چیز ہے. چپراسیوں اور پیادوں کی لڑکیاں بھی شاید اس طرح چپ چپاتے سونپ نہ دی جاتی ہوں گی! تجھے حق ہے کہ دل میں اپنی ناقدری کا خیال لائے اور جائز ہے کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر بھی آ جائے. لیکن اک ذرا صبر کر عجب نہیں کہ کسی کی رحمتِ بے حساب کے انوار کی بارش اس سادی مختصر سی مجلس پر ہو رہی ہو، اور اس کی قدر اس وقت جا کر کھلے جب دنیا کی ساری روشنیاں گل ہو چکیں، گیس کے ہنڈے، اور بجلی کے قمقمے سارے کے سارے بجھ چکیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ موٹر نشینوں کے نام و نشان بھی باقی نہ رہ جائیں!

شریف بچیوں کو پہلا سبق اطاعت کا ملتا ہے، خدمت گزاری کا ملتا ہے، اپنے دل کو مار کر، کچل کر دوسرے کا جی خوش کرنے کا ملتا ہے. شریف لڑکی! سبق کے امتحان کا وقت آ گیا. ادھر نکاح

کے دو بول منہ سے نکلے، ادھر وہ امتحان شروع ہو گیا. بھلا دے، آج سے، کہ پرورش کن نازوں میں ہوئی، بھول جا کہ آج سے دنیا میں کوئی ناز بردار باقی ہے وقف سمجھ لے آج سے اپنی زندگی، خدمت کے لیے، اطاعت کے لیے، صبر کے لیے. زہر میں قند کا مزہ حاصل کرنا سیکھ، سوکھی روٹی کے ٹکڑے ملیں، تو جنت کے خوان سمجھ. پھٹے پرانے کپڑے پہننے میں آئیں، تو زر و جواہر خیال کر، زبان درازیاں ہوں تو اپنے کانوں کو بہرا بنا لے. آوازے کسے جائیں تو زبان پر مہر لگا لے. کلیجہ میں نشتر بن کر ہر چبھنے والے طعنے کو ماں کا پیار سمجھ اور ہر چڑھی ہوئی تیوری میں اپنے مقدر کی مسکراہٹ کا جلوہ دیکھ! صبر وضبط کے ساتھ شکر واطمینان کے ساتھ زندگی ساری کی ساری گزار دے اور دنیا کو دکھا جا کہ اپنے بڑوں کے نام کی لاج رکھنے والیاں، خدائے واحد کی بندیاں، رسول برحق کی باندیاں، عائشہؓ و فاطمہؓ کے قدموں پر نثار ہو جانے والیاں. اس چودھویں صدی میں بھی کیسی ہوتی ہیں۔

(خطبات ماجد یا بہ زوبین ص: ۱۰)

بچپن میں جب کسی کی ہونے والی شادی کا نام سننے میں آتا تھا تو ذہن کے سامنے تصویر یہ آتی تھی کہ کھانے خوب کھانے میں آئیں گے. کپڑے نئے نئے اور چمک دار پہننے کو ملیں گے. پڑھنے سے چھٹی رہے گی. دو چار دن خوب کھیل کود، مزیداری میں گزریں گے. بچپن کا خواب جوانی تک قائم رہا گو شکل بدل گئی، نکاح کی حقیقت اب تک مخفی رہی. اور جب اپنی شادی کا خیال آیا تو اس کے معنی چند تفریحوں اور چند دلچسپیوں تک محدود رہے. بارات یوں روانہ ہوگی، محفل یوں جمے گی، رخصتی یوں ہوگی دعوت یوں ہوگی، سیر و تفریح، لطف و دلچسپی کے سامان یوں رہیں گے. گویا ازدواجی زندگی اپنی عظیم الشان وسعتوں اور بے انتہا پیمائشوں کے ساتھ سمٹ آئی تھی، دھوم دھام کی چند گھڑیوں میں، عیش و عشرت کے چند گھنٹوں میں، شروع کی چند پُر لطف راتوں میں، آہ، بچپن کی نادانیاں اور نوعمر کی نافہمیاں! بات بالکل صاف اور واضح تھی. لیکن اس وقت سمجھ میں نہ آئی کہ ''آج'' کے خدا معلوم کتنے ''کل'' آنے والے ہیں. نرم بھی اور گرم بھی، اور اس شام کی، خدا جانے کتنی صبحیں طلوع ہونے والی ہیں، دلکش و رنگین بھی اور اداس و غمگین بھی، آنکھوں سے پردے رفتہ رفتہ ہٹے، دنیا

نام ہے حقائق کا تلخ سے تلخ حقائق کا شاعری وخیال آرائی نہیں اور واقعات کی دنیا میں پڑ کر معلوم ہوا کہ افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی دنیا سے الگ، بالکل الگ ہے۔ معاش کا سوال چھڑا، اولاد کا سلسلہ چلا مایوسیاں بھی راہ میں آئیں، معذوریاں بھی، بیماریوں کی دکھن بھی پیش آئی، ناکامیوں کی چبھن بھی۔۔۔۔ یہ منزلیں وہ ہیں جن سے ہر راہ رو کو گزرنا ناگزیر ہے جو یاد رکھے ان سب موقعوں پر اپنی ذمہ داریوں کو، خالق کے سامنے اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل کی پیشی کو، یہ راز ہے اتقوا اللہ کی تکرار کا۔ یہ معنی ومفہوم ہیں محفل نکاح میں ایجاب وقبول کے! شوہر نے دعوت دوست احباب کی بڑی دھوم سے کی۔ بیوی کی ذرا سی بے توجہی سے عین وقت پر کھانا بالکل خراب ہو کر رہا۔ اب طبیعت ہے کہ غصہ سے بیخود ہو جاتی ہے، اور نفس مضطرب ہے کہ زیادہ سے زیادہ سزا ممکن ہو گھر کی مالکہ کو دی جائے۔ یہ موقع ہے اتقوا اللہ پر عمل کا!۔۔۔۔ شوہر مدت کے بعد پردیس سے گھر آتا ہے، راستہ بھر خواب دیکھتا ہوا کہ بیوی سے یوں مزے مزے کی باتیں ہوں گی، گھر پہونچا تو دیکھا کہ بیوی بیمار پڑی ہے، معمولی بات بھی مشکل۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ کیسی کچھ پیدا ہو کر رہی یہ وقت ہے اتقوا اللہ کے یاد کرنے کا! میاں بیوی میں بات چیت معمولی ہنسی دل لگی سے شروع ہوئی۔ بیوی کی زبان سے بات کوئی ایسی نکل گئی کہ میاں کے دل میں چبھ گئی۔ قوت اسے حاصل، حکومت اس کی، اختیارات اس کے ہاتھ میں، بالکل بس میں کہ جو چاہے سزا دے ڈالے۔ یہ گھڑی ہے اتقوا اللہ کے قدر کرنے کی۔

آج محفل کا نوشہ سن لے کہ یہ وقت عملی زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں داخلہ کا وقت ہے۔ نفس خوش نہ ہو کہ عمر بھر کے لیے خدمت کو ایک باندی ہاتھ آ گئی، یہ تخیل اور جہاں کہیں کا بھی ہو، اسلام کا تخیل نہیں۔ وقت، غفلت کے قہقہوں کا عیش ومسرت کی تالیوں کا نہیں، مقام قلب سلیم کے ڈرنے اور لرز جانے کا ہے کہ ایک عظیم الشان امانت سونپی جا رہی ہے۔ اور ایک اپنے برابر کی انسانی ہستی کی خبر گیری کا بار سر آ پڑنے کو ہے! ع

امتحان گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ

اب تک صرف کھانا تھا، اب کھلانا بھی ہوگا۔ جیسا خود کھایا ویسا ہی کھلانا ہوگا! ان تطعمھا

اذا طعمت اب تک صرف پہننا تھا، اب پہنانا بھی ہوگا جب اور جس وقت خود پہنا، اس وقت اور اس طرح پہنانا بھی وتکسوھا اذا اکتسیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اعتراض وعیب جوئی سے نکتہ چینی سے دل شکنی سے زبان روکنی ہوگی. ولا تقبح. ارشاد یہ نہیں ہوا کہ جھوٹے عیب نکالے جائیں عیب، سچے یا جھوٹے کسی طرح کے بھی نہ نکالیں جائیں. اور پھر نکتہ یہ کہ کھلانا پہنانا جو کچھ بھی ہو، خیرات کی مد میں نہ ہو. بیوی کا حق اور اپنا فرض سمجھ کر ہو. اور ان معاملات کے برتنے کا طریقہ بہتر سے بہتر اور شائستہ سے شائستہ ہو.

(ص:۴۳)

جنتِ الٰہی ہے اور اس کی یہی دلآویزی ملائکہ قدس اور ان کی یہی زمزمہ سنجیاں، باغ بہشت کا چپہ چپہ انوارِ الٰہی سے معمور، الطافِ کبریائی کا قدم قدم پر ظہور، تخلیق ابوالبشر کی ہوتی ہے تشریف آوری رونقِ بزم کائنات حضرت خلیفۃ اللہ کی ہوتی ہے. آپ آتے ہیں. جنت میں کس لطف ومسرت کی کمی؟ ہر سو نعمتوں کی بارش، ہر طرف انوار کی تابش، اس پر بھی اپنے دل کا ایک گوشہ خالی پاتے ہیں محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اب بھی کوئی خلا ہے. اتمامِ نعمت کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ جنت کی لذت مادی میں کچھ بڑھا دیا جائے، سرورِ روحانی کے سامان میں کچھ اضافہ کر دیا جائے. بلکہ تخلیق ہوتی ہے آدم ہی سے ملتی جلتی لیکن پھر بھی اس سے ذرا الگ ایک اور مخلوق کی خلق منھا زوجھا. آدم کا دل تسکین اب جا کر پاتا ہے. تکمیل اپنے وجود کی اب محسوس کرتا ہے. لیسکن الیھا. سوچیے اور پھر سوچیے کہ جنت میں کمی ہو کس چیز کی سکتی تھی؟ لیکن ممکن لذت خدمت کو حاضر ہر ممکن مسرت چاکری کو کمر بستہ. لیکن نوازشوں اور بخششوں کی تکمیل جبھی جا کر ہوئی. آدم کے حق میں جنت جبھی حقیقی معنی میں جنت ثابت ہوئی جب مرد کے لیے عورت شوہر کے لیے بیوی وجود میں آئی۔

بچہ پل کر جوان ہوا اور جسے کل انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا جا رہا تھا، آج وہ اس قابل ہو گیا کہ چلے، دوڑے اور خودی ہی نہیں، دوسروں کو بھی اپنے ساتھ چلائے. پڑھ لکھ کر ہوشیار ہوا اور اس لائق کہ نہ صرف اپنی ذمہ داری اپنے سر لے بلکہ قول دے دوسروں کی کفالت کا، حفاظت کا، ذمہ داری کا، خبر گیری

کا، سرپرستی کا۔۔۔۔رخصت بچپن کی بے فکریاں اور ختم معصومیت کی فارغ البالیاں!

اور جو کل تک گھر کی چہکتی مَینا تھی وہ مطالبہ کرنے لگی باپ سے اپنے حق کا، مطالبہ اپنی زبان سے نہیں جس پر قفل شرم وحیا کے چڑھے ہوئے پردے ادب ولحاظ کے پڑے ہوئے۔ مطالبہ اس کی زبان سے جو بڑوں اور چھوٹوں سب کی رہنمائی کے لیے آیا، جس نے ایک ایک کو اس کا فرض یاد دلایا، ایک ایک کو اُس کا حق جتلایا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ النکاح من سنتی نکاح تو میرا طریقہ ہے، میرا لایا ہوا دین ہے اور میرا پھیلایا ہوا آئین۔ نہ ہو کہ اس کو کوئی فضول دلا یعنی رسم سمجھ بیٹھو یا خواہ مخواہ کی قید۔ دنیا شروع سے بار بار غلط تجربہ کرتی آئی ہے اور آخر تک کرتی رہے گی۔ کوئی شرک وارواح پرستی کے چنگل میں پھنسا ہوا، تجرد ورہبانیت کی طرف لے جائے گا اور کوئی الحاد ومادہ پرستی کی دلدل میں دھنسا ہوا Free Love اور حیوانیت کے رخ پر چلائے گا۔ دنیا کے ہاتھ میں صحیح قانون دینے میں آیا ہوں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ سارے راستے جہل ونادانی کے بدنظمی وفتنہ سامانی کے اور صحیح راستہ وہی ہے جماعت کے لیے اور فرد کے لیے، عورت کے اور مرد کے لیے، صحت کے لیے اور عافیت کے لیے، عصمت کے لیے اور عاقبت کے لیے، جو میرا سمجھایا ہوا میرا بتایا ہوا اور میرا چاہا ہوا ہے۔ فمن رغب عن سنتی۔ اب اس پر بھی جو بدنصیب میرا طریق چھوڑ، اِدھر اُدھر بھٹکتا ہے اور حکیم حاذق کے مطب سے منہ موڑ چوراہہ کے کسی عطائی اشتہاری دوا فروش کا دامن پکڑتا ہے۔ وہ جان لے اور سن رکھے کہ فلیس منی وہ میرا ہرگز نہیں میں اس کی شامتِ اعمال سے بَری، اب وہ جانے اور اس کی کج روی! باپ کی امانت کا زمانہ ختم ہوا جس موم کی پتلی کو بچپن سے آج تک آنکھ کی پتلی بنا کر رکھا، پالا، پڑھایا، لکھایا، سکھایا، کھلایا، برسوں جس سے دل نے سرور حاصل کیا اور آنکھوں نے نور، جب وہ کسی قابل ہوئی، جب وہ خود اس لائق ہوئی کہ خدمت کر سکے اپنے ہنر اور سلیقہ کی شمع سے اندھیرے کو اجالا بنا دے تو حکم ملتا ہے کہ وداع کر دو اسے! منتقل کر دو امانت کو دوسرے کے ہاتھ میں! آج سے اس کی نئی زمین ہوگی اور نیا آسمان نئی زندگی اور نیا سامان!

مسافر کا سفر کامیاب اس وقت کہا جائے گا جب وہ سارے مرحلوں کو طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک بہ خیریت وبہ عافیت پہنچ جائے محفل کا نوشہ اور پسِ پردہ لڑکی، دونوں سن لیں، کہ آج کی

گھڑی عملی زندگی کے بڑے اور کڑے امتحان میں داخلہ کی ہے. ایک عظیم الشان و پر پیچ سفر حیات کے آغاز کی ہے. وقت نہیں ہے غفلت کے شادیانوں کا موسم نہیں ہے، مدہوشی کے ترانوں کا. یہ گھڑی ہے احساسِ ذمہ داری کی پوری بیداری کی اور یہی راز ہے اس کا کہ نکاح کا زمانہ بلوغ کے بعد ٹھہرا گیا ہے اور رضامندی معتبر بالغ ہی کی مانی گئی ہے کہ خود بلوغ کے معنی ہی یہ ہیں، کہ روح بھی اور جسم بھی اور قلب ایک عظیم الشان ذمہ داری کا بار اٹھانے کو تیار ہو گئے!

اچھی بیوی اور اچھی عورت وہ نہیں، جو بے جھجک مردوں سے ملے اور بے جھجک ہال میں رقص کرے. بیشک شرک کے مذہبوں اور جاہلیت کی تہذیبوں نے معیار اسی کو ٹھہرایا ہے. اور آج سحرِ فرنگ سے مرعوب ''تجدد'' بھی اسی پر ریجھا ہوا ہے. لیکن دنیا کے سب سے بڑے معلم کے لائے ہوئے دینِ فطرت اور پھیلائے ہوئے آئینِ حکمت میں گنجائش ان آزادیوں، بیباکیوں، آوارگیوں کی کہاں؟ یہاں تو نکاح خود ایک ''قید'' ہے اور اپنے ساتھ بہت سی قیدوں کا بڑھانے والا بہت سی پابندیوں کا لانے والا، پس سن لے مسلمان لڑکی، کہ زمانہ بے فکریوں کا ختم ہوا اور دور شروع ہوا، نئی فکروں اور پابندیوں کا نئی قیدوں اور ذمہ داریوں کا! اب تک سہلیوں کے ساتھ کھیل کھیلی، بہنوں کے ساتھ ہنسی بولی، ہمجولیوں کیساتھ جھولا جھولی، اب کل سے زندگی وقف ہوگی دوسروں کی خدمت کے لیے، نہ کھانا اپنے لیے ہوگا، نہ پہننا اپنے لیے نہ اپنے وقت سونا نہ اپنے وقت جاگنا. خود بعد کو کھائے گی پہلے دوسروں کو کھلائے گی. بیشک پہنے گی اور اوڑھے گی مگر اس لیے کہ شوہر کو بھلی لگے اپنے کو سنوارے گی نکھارے گی مگر اس لیے کہ شوہر کی نظر میں جچے. راتوں پر راتیں جاگے گی، ٹہل ٹہل کر کاٹے گی اس لیے کہ نئی نسل کو بڑھائے پھیلائے صحت و زندگی کی شاہراہ پر چلائے. دوسروں کی سیرت کی تشکیل کرے، ان کی نشو ونما کی تکمیل کرے! منزل بیشک کڑی ہے اور ذمہ داریاں سخت، لیکن جو اس کو نباہ لے گئی اور شوہر کا دل ہاتھ میں لیے دنیا سے اٹھی، بشارت ہے اس کے لیے دنیا کے سب بڑے راست باز کے کلام میں، کہ اس کے اور جنت کے درمیان کوئی روک نہیں! یہ آخری چیز نظر کے سامنے ہو اور یہ دستور العمل ہاتھ میں رہا تو صحرائے ہستی کا ہر کانٹا انشاء اللہ پھول بن کر کھلے گا. اور راہ کا پتھر پانی ہو کر بہے گا!

دو مسافر ہیں، جو ایک لمبا سفر ایک اجنبی ملک کا شروع کرنے والے ہیں ایک ان میں سے

ٹائم ٹیبل گائڈ بک خریدتا ہے۔ پرانے مسافروں سے مل کر، مسافت کا جغرافیہ کا موسم کا آب وہوا کا، طرز معاشرت کا، ایک ایک چیز کا حال پوچھتا ہے کرایہ کیا پڑے گا، راستہ کون سا اختیار کرنا ہوگا۔ زبان کی اجنبیت کیسے حل ہوگی، وغیرہ وغیرہ ہر چیز جان لیتا ہے۔ دوسرے صاحب ہیں جو آغاز سفر کے وقت صاحبِ تجربہ سے مشورہ کرنا اپنے عزم آزادی سفر کی توہین سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب میں چاہوں گا، جس سمت چاہوں گا سامان کے ساتھ جس حالت میں ہوں گا چل کھڑا ہوں گا۔۔۔۔عورت کے نادان دوست، جو آج نوجوان، کمسن ناتجربہ کار لڑکوں لڑکیوں کے درمیان یہ پروپیگنڈہ کرنے اٹھے ہیں کہ جو جس سے چاہے، بلا والدین کی وساطت ومشاورت کے شادی رچائے، ٹھیک اس قسم کی آزادی کے مبلغ ہیں ان ''خود پسندیدہ'' شادیوں کے جو نتیجے فرنگیوں کے ملک میں نکل رہے ہیں اور طلاق وتفریق کے جو جو فیصلے وہاں کی عدالتوں اور اخبارات کے صفحات کی رونق بنے رہتے ہیں۔ ان کے مختصر اعادہ کے لیے بھی اس محفل میں گنجائش کہاں سے نکالی جائے؟

یہ حقیقت صرف شریعتِ اسلام نے پیش نظر رکھی ہے کہ نکاح نام ہے حتی الامکان عمر بھر کے لیے ایک معاہدہ کا، ہر وقت کے ہر قسم کے سابقہ کا، بچہ جس طرح ہمیشہ بچہ نہیں رہتا نوجوان اسی طرح نوجوان ہی نہیں بنا رہتا۔ شادی کی رات بہر حال چند گھنٹوں کی عمر لے کر آتی ہے اور شادی کا دن بہر حال دن ہی بھر کا ہوتا ہے۔ ہر سن اور دن نئے نئے مسائل سامنے لائے گا۔ اور خود نوجوانی میں بھی ایک ہی قسم کے نہیں بیسیوں مختلف ومتضاد جذبات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لازمی ہے کہ اپنی پسند وانتخاب کے ساتھ اپنے مخلص ترین وتجربہ کار بزرگوں کے مشوروں کو شریک رکھا جائے اور یہی راز ہے ہماری شریعت میں نکاح کے لیے ولی کی اہمیت کا! آج جنھیں جوانی سے اترا ہوا بوڑھاپے کی طرف جھکا ہوا دیکھا جا رہا ہے، آج نہ سہی کل وہ بھی نوجوان ہی تھے اور نوعمری کے جذبات سے پوری طرح لذت آشنا وسرشار!

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی!

واقف اس کوچہ کے قدم قدم سے آگاہ اس وادی کے ایک ایک پیچ وخم سے۔

معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

(ص:۵۵)

فصل چہارم

طنزیاتِ ماجدی

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں مری مان جایئے

لکھنؤ ۴؍جولائی .وزیر اعلیٰ یوپی نے سرکاری ملازموں کے سارے طبقوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے اخلاق وکردار اور پابندیٔ نظم وضبط سے رہیں .سماج کے ہر طبقہ میں قانون کے لئے احترام پیدا کریں"

یہ خوب بات ہے کہ پہلے خود ہی ہر ممکن اور زوردار ذریعہ سے ملک میں قانون شکنی کی تحریک پیدا کی جائے .اور قانون شکنی کو بجائے جرم کے ایک بلند کرداری اور اعلیٰ اخلاقی ہنر قرار دیا جائے .اور جب نفس اس کا خوب عادی ہو جائے اور شیر کے منہ کو انسانی خون کا مزہ لگ جائے اور اس لاقانونیت کی زد خود اپنے اوپر پڑنے لگے .تو الٹے اس ہنر کی ہجو وملامت میں وعظ وپند ہونے لگے!

---تیر کو کمان سے چھوٹ کر کمان میں واپس آتے ہوئے کس نے دیکھا؟

(۱۷؍جولائی ۶۹ء)

پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے ابھی بہار کے

نئی دہلی ۲۱؍اگست ۔مرکزی وزیر داخلہ شری چوہان نے آج وزارتِ داخلہ کی مشاورتی کمیٹی کو بتایا کہ پچھلے ۱۵، ۱۶ سال کے درمیان سنٹرل ریزرو پولیس میں ۱۵ سو مسلمان بھرتی کئے گئے ہیں اور اب سی آر پی کا ڈائرکٹر جنرل مسلمان ہی رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے کیونکہ ریاستوں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنا سنٹرلی ریزرو پولیس ہی کا اصلی نصب العین ہے".

خبر جتنی حیرت انگیز ہے اس سے زیادہ مسرت انگیز ہے وزیر داخلہ اور وزیر اعلیٰ دونوں اس فیصلہ پر قابل مبارکباد ہیں۔ انصاف بہر حال قابل داد ہے۔ چاہے ۲۱، ۲۲ سال پچھڑ ہی کر ہوا۔ گو یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ پورا علاج نہیں ہے بلکہ تمامتر ادھورا ہے۔ پورے علاج کے لئے ضروری تھا کہ ہر ریاست میں معمولاً جو پولیس رہتی ہے اس میں بھی مسلمانوں کو معقول تعداد میں جگہ ملتی۔

(۵ ستمبر ۶۹ء)

آپس کی گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں

ملک کے غیر مسلم مشہور انگریزی روزنامہ اسٹیٹمین (۲۶ اگست) کے اڈیٹوریل زیر عنوان ''لکھنؤ میں پاگل پن'' سے:۔

''تین ماہ کے اندر یہ دوسری بار ہے کہ مسلمانوں کے دو فرقوں شیعہ سنی قدیمی دشمنی لکھنؤ میں ہنگامہ اور آتش زنی کی صورت میں پھوٹ پڑی جس پر پولیس کو سخت کارروائی کرنی پڑی اور جان و مان سب کا نقصان خواہ مخواہ ہو کر رہا..... اب کی بار تو بہانے کے بھی ضرورت نہ پڑی جمعرات کے دن ایک فریق نے دوسرے فریق کی مسجد پر حملہ کر دیا جب کہ اس کے اندر لوگ جمع تھے''

واقعات و اسباب کی جزئی تفصیل جو کچھ بھی ہو۔ بہر حال اتحاد اسلامی کی رسوائی و تفضیح کل دنیا کے سامنے جی بھر کر ہو کے رہی اور بیگانوں نے اپنوں کی خانہ جنگی باہمی سر پھٹول بلکہ خودکشی کا تماشہ خوب دیکھ لیا۔۔۔۔ روزنامہ مذکور نے فریقین کی دشمنی کے لئے لفظ Tradtonal استعمال کیا ہے جس کا لفظی ترجمہ ''روایتی'' ہو گا مراد اس سے قدیمی، پشتینی اور موروثی دشمنی ہے۔ صدیوں کی عداوت آخر بیرونی دنیا سے کیونکر مخفی رہ سکتی تھی۔ اور یہ مخفی طنز اب ہمدردوں کی زبان پر بھی غیر مخفی ہو کر آ گیا۔

(۱۲ ستمبر ۶۹ء)

ماں کی برہنگی کا نظارہ

لندن ۲۱ مئی۔ حقیقت نگاری اور حقیقت نمائی نے یورپ میں آج ایک غضب کا اقدام کر

رکھا ہے۔ برطانیہ کے نیشنل تھیٹر نے آج جارج برنرڈ شا کے لکھے ہوئے ڈرامہ ''آدم وحوا'' کو اسٹیج پر پیش کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس میں آدم اور حوا ۴۰ منٹ تک اسٹیج پر کامل برہنگی کی حالت میں رہیں گے۔ اور جو روایتیں ان کی جنت کے اندر برہنہ گھومنے کی ہیں وہ صرف تھیٹر کے اسٹیج پر مشکل ہو کر رہیں گی''۔

شاباش فرزندانِ حوا شاباش!۔۔۔۔ بیسویں صدی کے ثلث آخر سے قبل اتنی جسارت اور ذہنی اُپج کس کی ہوئی تھی، کہ اور تو اور، اپنی ماں کی برہنگی کا نظارہ یوں تماشہ گھروں میں لطف ولذت کے ساتھ کرے!۔۔۔۔ یہ تھیٹری ماں جو یقیناً کوئی جوان جہاں کھیلی کھائی ہوئی ہوگی۔ ان کی تقدس برہنگی کا نظارہ صرف ایک تھیٹر تک کب محدود رہے گا۔ یہ تو صرف پہلا قدم ترقی کا تھا اب دوسرا قدم یہ ہوگا کہ پہلے دنیا کے سینما اور ٹیلی ویژن اس سے مستفید ہوں گے اور پھر اس کے فوٹو گھر گھر پہنچیں گے! ۔۔۔۔غریب مسلمان! دنیا کہاں سے کہاں پہنچی اور تو اب تک حجاب نقاب ہی کی بحث میں الجھا ہوا ہے۔

(۶/جون ۶۹ء)

ایک انوکھا ملک

منیلا ۲۲/اکتوبر۔ فلپائن حکومت نے تمام جنس زدہ فلمیں تیار کرنے والے بدیسی پروڈیوسروں اور ایکٹروں اور منیلا کے شبینہ کلبوں میں عریاں ناچ کرنے والوں اور والیوں کو گرفتار کر کے ملک در بدر کر دینے کا حکم صادر کر دیا ہے''

خبر میں یہ کچھ درج نہیں کہ ملک نے اس تاریک خیالی کو برداشت کیونکر کیا۔ کتنی ہڑتالیں، کتنے بلوے، کتنی بغاوتیں اس ظالمانہ حکم کے خلاف ہوئیں ۔۔۔۔ پاکستان وترکی، ایران وافغانستان، مصر وشام میں سے کاش کوئی بھی اس جرأت سے سبق لیتا ع

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔

(صدق جدید ۱۱/جولائی ۷۲ء)

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

نائب وزیر داخلہ کے پیش کردہ کاغذ کے مطابق لوک سبھا میں ۱۳/دسمبر کو:۔

ہندوستان میں انگریزی کو اپنی مادری زبان لکھانے والے ۱۹۱۵۷۹

عربی ۲۳۳۱۸

سنسکرت ۲۳۱۲

سنسکرت جس کی یونیورسیٹیاں بن چکی ہیں اور جن کی خاطر گورنمنٹ کیا کچھ کرنے کو تیار نہیں ہے اپنی مادری زبان کہلانے والوں کی تعداد بھی آپ نے دیکھ لی! کرورہا کرور کی آبادی میں دو ہزار سے کم!۔۔۔۔ موقع ہے کہ اقبال کا مشہور مصرعہ ایک بار پھر دہرا لیجیے ع

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

اور شعر کے دوسرے مصرعہ کو بالکل ہی بھلائے رکھئے ع

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

(ایضاً)

جامۂ تہذیب کی عریانیاں

عریانی کا مذہب تیزی سے ترقی پر ہے اس کا آغاز جرمنی میں ۱۹۰۰ء میں ہوا اس وقت حکام نے بڑی سختیاں کیں۔ بایں ہمہ اس وقت جرمنی میں اس فرقہ کی آبادی ۶۰ ہزار سے زائد کی ہے۔ یہ لوگ بالکل برہنہ مادرزاد ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ پانی میں پیرتے ہیں۔ ورزشیں کرتے ہیں اور اس حالت میں کہ جسم پر ایک دھجی بھی نہیں ہوتی جلسوں میں شرکت کرتے پھرتے ہیں'' (ہائنز آف انڈیا ۱۵/جولائی ۳۱ء)

مرض کا علاج اس وقت تک ممکن ہے جب تک اسے مرض سمجھا جائے لیکن مریض کی نظر میں مرض خود صحت بن جائے تو ایسے مریض کا علاج کس طبیب کے بس کی بات ہے؟ حیا و غیرت کا احساس اگر باقی ہے تو احساس خفتہ کو بیدار کرنا ممکن ہے لیکن جب احساس ہی سرے سے فنا ہو جائے تو بے غیرتوں کو کیا کہہ کر غیرت دلائی جاسکتی ہے؟ سنکھیا کو بالقصد جزو غذا بنالیا گیا ہے تو حاذق سے حاذق طبیب بھی بجز اپنی بے بسی کے اعتراف کے اور کیا کرسکتا ہے۔

(سچ ۱۱/جولائی ۳۱ء)

اقتدار کی دھوپ چھاؤں

۲۶ر فروری ۱۸۶۶ء کو نظام دکن نواب افضل الدولہ بہادر کا انتقال ہوا اور اسی دن انگریزی ریزیڈنٹ مسٹر سانڈرس نے وزیر اعظم حیدرآباد کو مطلع کر دیا کہ جب وہ طفل خورد سال نئے نظام میر محبوب علی خان کے پاس تعزیت میں آئیں گے تو اس قدیم توہین آمیز دستور کی پابندی نہ کروں گا کہ جوتا اتار کر آؤں اور فرش زمین پر آ کر بیٹھوں بلکہ باقاعدہ دربار کی سی نشست ہونی چاہیئے" (اسلامک کلچر حیدرآباد جنوری ۱۹۶۹ء ص:۳۹)

چنانچہ معاً اس پر عمل درآمد ہوا اور توہین آمیز قدیم دستور بات کی بات میں مٹ گیا ۔۔۔۔لیکن اب یہ کون جانتا ہے کہ آج سے ٹھیک ایک صدی پیشتر جلالت مآب برطانیہ کے نائب ونمائندہ کو خسرو دکن کے دربار میں تحقیر وتوہین کی ان منزلوں سے بھی ہو کر گزرنا ہوتا تھا!

(۱۴ر اپریل ۱۹۶۹ء)

خوں خوار سیاست

کلکتہ ۳۰ر دسمبر جادو پور یونی ورسٹی کے وائس چانسلر دیال سین کو چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا گیا۔

[illegible] وہ یونی ورسٹی سے اپنی کوٹھی کو واپس آ رہے تھے حملہ آور ان پر

[illegible] لت پت پڑی ہوئی تھی"

.....خاکِ وطن کفن میں

پرانے اخبار بینوں کو یاد ہوگا کہ آج سے ۴۰، ۴۵ سال قبل انقلابیوں میں ایک مشہور شخصیت اشفاق اللہ خان شاہجہاں پوری کی گزری ہے. کاکوری کے ڈکیتی کیس میں بعلت قتل گرفتار ہوئے اور بالآخر پھانسی کی سزا پائی. ایک معاصر میں ان کا یہ کارنامہ طمطراق سے اور ایک سیاسی مقرر کی زبان سے شائع ہوا ہے کہ بالکل آخر میں جب انگریز حاکم نے اس مجاہد وطن سے حسب قاعدہ سوال کیا کہ اپنی آخری خواہش پیش کرو تو انھوں نے ''قلم دوات کاغذ منگا کر اپنا یہ برجستہ شعر لکھ دیا۔

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاک وطن کفن میں

اس شعر سے اندازہ ہوگا کہ اس مردِ مجاہد کے ایک ایک قطرۂ خون میں حب الوطنی کا کیسا سمندر جوش مار رہا تھا..... پروانہ وار شمع وطن پر فدا ہونے کے لئے کس قدر بے چین تھا''

یہ روداد اگر تمام تر صحیح ہے تو ایک مسلمان کے حق میں بجائے خوش ہونے کے افسردہ ہونے کے قابل ہے. وطن سے محبت رکھنا، یا وطن دوستی اور چیز ہے، وطن پرستی یعنی وطن کو مقصود زندگی بنانا اور وطن کی بلندی کی خاطر جان دینا بالکل اور. ملک کی محبت تو انسان کے لئے ایک امر طبعی ہے. جیسے اپنے شہر کی ہوتی ہے..... ان چیزوں کی محبت بھی ہونا چاہیے. اور ان سے انس بھی. ان کی غیرت اور عزت بھی دل میں ہونا قدرتی ہے. ان کی حفاظت میں دادِ شجاعت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ محمود و مستحسن ہے یہ سب چیزیں اپنی جگہ پر بالکل درست، لیکن ان میں سے کسی کو زندگی کا نصب العین بنا لینے، ان میں سے کسی کو معبودیت یا نیم معبودیت کے درجے میں رکھ دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے. دوسری قومیں جو کچھ بھی چاہیں کریں ان کی پست نظریں ان سے جو چاہے کرالیں لیکن مسلمان کی منزل بالکل دوسری ہے. اس کے ہاں تو بزرگ اور خدا رسیدہ اسلاف یہاں تک کہ فرشتوں اور پیمبروں کو معبودیت بلکہ نیم معبودیت کے درجہ پر بھی رکھنا جائز نہیں. دل کو بڑا دکھ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ مسلمان بھی دوسروں کی ریس میں بار بار بھٹک کر خدمت وطن و حب وطن کے بجائے وطن پرستی تک پہونچ جاتے ہیں!۔۔۔۔ اقبال

یہی منظر دیکھ کر تو یہاں تک فرما گئے ہیں ع

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔

(۱۱ر مارچ ۱۹۷۱ء)

نئی آمد نیا خرچ

گورکھپور کی خبر ہے کہ سول سرجن آفس کی پشت پر پانچ آدمی جوا کھیلتے ہوئے گرفتار ہوئے انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے اپنا خون بیچ کر جو رقم اسپتال سے حاصل کی تھی. اس کو جوا میں لگاتے رہے یعنی خون فروشی کی کمائی قمار بازی میں اڑائی ۔۔۔۔ سبحان اللہ! کیا پاک کمائی اور کیسا نیک مصرف ۔۔۔۔ غالب بیچارے کی شاعری بھی یہیں تک رہی تھی کہ آلات مے کشی بیچ کر شراب کی خریداری پر صرف کر دیئے ع

تھے دو ہی کل حساب سو وہ بھی پاک ہو گئے

اتنی بلندی پروازی انھیں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ زندگی ہی کو ایک جوا بنا ڈالتے. واہ رے جواریو! زندہ دلی کا سبق کوئی تم سے سیکھے!

(۶ر اگست ۱۹۷۱ء)

بدنصیب کی خوش نصیبی

بدنصیب میر لائق علی سابق وزیر اعظم جن کے عہد میں حیدر آباد کی مسلم سلطنت مٹی. اور یہ وزیرِ معزول، دکن سے پاکستان چلے گئے تھے. اب امریکا سے خبر آئی ہے کہ موصوف کسی وفد میں شریک ہو کر امریکا گئے ہوئے تھے کہ اس رمضان کے پہلے عشرہ میں کسی دن نماز مغرب پڑھ رہے تھے کہ عین اسی حالت میں پیامِ اجل آ گیا اور روح اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گئی. یہ وصیت کر گئے تھے کہ دفن کے لئے جگہ مکہ معظمہ میں حاصل کی جائے. اللہ نے یہ تمنا بھی پوری کرا دی ۔۔۔۔ رمضان کا مبارک مہینہ حالتِ سفر میں اور پردیس میں موت، عین حالت نماز میں موت اور

تدفین ارضِ حرم میں، کعبۃ اللہ کے جوار میں! بدنصیب کو کیسی کیسی خوش نصیبیاں قابل رشک خوش نصیبیاں حاصل ہوگئیں!

(۵ نومبر ۱۹۷۱ء)

''کوئی حد بھی ہے''

اس عنوان سے قدیم صدق نواز حیدرآباد کے ڈاکٹر غلام دستگیر رشید ایم اے پی ایچ ڈی نے ذیل کی تحریر روانہ کی ہے:۔

''فلاں ہندو ایکٹر نے فلاں ہندو ایکٹرس کو ''دیدی'' کہہ کر ساری زندگی اس پاک رشتہ کو نباہا اور اس کے مقابل میں ہیرو بننے سے انکار دیا''

ان سطور کو پڑھتے وقت فلم ''ہوڑہ برج'' کا وہ سین گھوم گیا جس میں مسلمان ایکٹر ناچتے ہوئے فلاں مسلمان ایکٹرس کو دھکے مارتا ہے اور ایکٹرس اس ایکٹر کو جو اس کا حقیقی بھائی ہے آنکھ مارتی ہے۔ فوراً خیال گزرا کہ صدق کے عبرت آموز نوٹ سچی باتوں کے لئے اس کو نوٹ کر کے بھیج دوں۔ اس کا عنوان آپ ہی تجویز فرمائیں گے مگر مجھے خیال آیا کہ ''کوئی حد بھی ہے'' پھر روشنی کی ایک کرن دکھائی دی کہ انسانی ضمیر فلمی دنیا میں بھی بیداری کا کوئی نہ کوئی ثبوت دیتا ہے''

مگر اپنی ملت کی اس نگوں بختی کو کیا کیجئے کہ انسانی ضمیر کی بیداری کا کچھ پتہ نشان بھی ملا تو آپ ہاں کے نہیں دوسروں کے ہاں! بھائی بہن کے رشتہ کے احترام کی چنگاری اگر ملی بھی تو برہمن کے ہاں نہ کہ شیخ کے ہاں۔۔۔۔ شرافت کا یہ تمغہ ہمارے ہی نصیب کے امتیاز میں آیا!

(۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

تجدد میں کہنگی

اسٹیٹمین میں چندی گڈھ کے ایک بینک کی روداد کا خلاصہ:۔

''یونائیٹڈ کمرشیل بینک کے جدت طراز مینیجر اپنے بینک کی ایک شاخ زنانہ کھول رہے ہیں

بلکہ ایک حد تک کھول چکے ہیں۔

(۱) اس میں کھاتے صرف عورتوں کے کھل سکیں گے۔

(۲) اس کے خزانچی سیاہ نویس وغیرہ سب عورتیں ہی ہونگی۔

(۳) اس کے حدود میں صرف عورتیں داخل ہوسکیں گی۔

(۴) اس کا راستہ بھی مردوں کی عام گزرگاہ سے الگ پردہ دار ہوگا۔

(۵) اس کے کاروبار کے اوقات بھی بجائے دن کے شام کے رہیں گے

(۶) نوسو عورتوں نے ۱۵ لاکھ کی رقم اس نئے بینک میں جمع کردیں ہے۔

لیکن طبیعت بڑی ہی بے لطف ہوکر رہی جب یہ معلوم ہوا کہ تجدد نوازی کے سارے پینتروں کے باوجود ایک پیونداب تک کہنگی کا لگا ہوا باقی رہ گیا یعنی پہرہ دار بندوقچی اب بھی مرد ہی مرد۔

(۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

بے اثر یقین دہانی

نئی دہلی ۱۱ اگست۔ آج آئین کے ترمیمی بل کی راجیہ سبھا میں منظوری پر وزیر اعظم صاحبہ نے جو تقریر کی اس میں انھوں نے اقلیتوں کو اطمینان دلایا اور مسلمانوں کا نام لے کر انھیں یقین دلایا کہ ہمارے ذہن میں اس کا شائبہ دور دور تک نہیں کہ ہم ان کے لئے مشکلات پیدا کریں یا ان کے حقوق میں کوئی کمی کریں"

اور کس بدبخت کو یہ بدگمانی ان کی ذات سے یا خاندان سے یا ان کے والد ماجد سے تھی لیکن اس کے باوجود ہوتا کیا رہا؟ ایک طرف بلوے اور خون ریزیاں، جان و مال و عزت سب پر حملے، زمستوں کا قحط، اردو کا حشر، ذبیحہ گاؤ کی ممانعت غرض کون سی ناشدنی شدنی ہوکر نہ رہی۔ یا صاحبزادی کا کمال ہے کہ وہ اپنے والد ماجد سے زیادہ قوت وعزم اور تدبر کی مالک ہیں ۔

کھانے بھی خوب کھائے اُڑیں دعوتیں بھی خوب
لیکن ہوا یہی کہ بڑھے آپ ہم گھٹے

(۲۰ اگست ۱۹۷۱ء)

شنید سے دید تک

ایک انگریزی اخبار کی اطلاع کے مطابق ایران کے ڈھائی ہزار سالہ قومی جشن جو اسی اکتوبر میں ہورہا ہے۔ وہ مہران سے ۴۰ میل دور ایک بڑے وسیع میدان میں ہوگا اس میں دنیا کے آدھے سے زیادہ بادشاہ اور صدر وغیرہ آئیں گے۔ صرف رات کے سرکاری ڈنر پر ایک کرور ڈالر خرچ ہوں گے۔ کھانا کھلانے والے ملازمین میں سے ہر ایک کی وردی کو ایک سیر سونے کے تاروں سے مطلا کیا جارہا ہے۔ سامان زیبائش وآراستگی سے لے کر ہر ہفتہ پیرس سے دو جٹ ہوائی جہاز اور ۲۰ لاریاں ایران روانہ ہورہی ہیں۔ ناچ، رنگ، شراب، قمار اور دوسرے تعیشات وتکلفات پر کتنی دولت لٹائی جائے گی۔ اس کی کوئی تفصیل نہیں آئی ہے۔۔۔ اچھا ہے جمشید اور کیکاؤس، دارا اور کیخسرو کے زمانے کے جو افسانے سننے میں آتے تھے وہ اب کچھ دیکھنے میں بھی آجائیں گے۔ شنیدہ کے بود مانند بودہ۔

(۲۳ر ستمبر ۱۹۷۱ء)

ذہانت کا ایک عجیب استعمال

بلند شہر سے ۳۰ر مارچ کی خبر ہے کہ وہاں ہائی اسکول کے امتحان میں جب ایک صاحبزادے امتحان کے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک کبوتر بغل میں دابے ہوئے تھے۔ کبوتر سدھا ہوا تھا، پرچہ ملا۔ ان بلند اقبال نے جھٹ سے کبوتر کے پر میں باندھ دیا اسے اڑا دیا، نامہ بر ہوا ہوگیا۔ اور کھٹ سے پرچہ کا حل لے کر آ گیا۔ خفیہ پولیس کی بلی گھات میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے معاً کبوتر اور کبوتر باز دونوں کو دبوچ لیا اور امتحان دینے والے برخوردار کے ارمان پھڑپھڑاتے رہ گئے ۔۔۔۔ نہ ہوئی اودھ کی نوابی سلطنت عجب کیا جو صاحبزادہ کو بھی ذہانت کی اس پرواز پر خلعت مل جاتا ۔۔۔۔ اس میں پھر ایک مشرقیت اور لکھنویت کی جھلک تھی۔ نہ ہوا ''ماڈرن'' سینما بینی سے آلودہ لت پت کوئی طالب علم چاقو، چھرے سے مسلح، ماسٹر یا گارڈ پر قاتلانہ حملہ ہی کر بیٹھتا۔

(۱۴ر اپریل ۱۹۷۲ء)

یہ سیکولر دیس

۱۶/اپریل کے ریڈینس میں خبر ہندوستان ٹائمز (۲۶/مارچ) کے حوالہ سے شائع ہوئی ہے کہ

''بے شمار سادھو ہماری قومی ریلوں پر سفر بلا ٹکٹ کر رہے ہیں اور بعض سوالیوں کو تو اعزازی ریلوے ٹکٹ سرکار کی طرف سے ملے ہوئے ہیں'' اور ایک سرکاری بیان کے مطابق انھیں میں سیوا آشرم سنگھ کے تین نمائندے بھی ہیں''

فیاضی اور گنج بخشی کی اگر یہ خبر صحیح ہے تو شاباش سیکولرزم کے مدعیو! قسم ہے سیکولرزم کا حق ادا کر دیا اسلامی جماعت تبلیغ کے ارکانو، چرچ کے مشنریو! اپنی قسمت میں اس شرف و اعزاز سے محروم ہونے پر کم از کم فیاض سرکار کے سامنے ہاتھ پھیلا کر یہ مصرعہ تو گنگنا ہی سکتے ہو ع

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

(۵/مئی ۷۲ء)

الٹی گنگا

ایک روشن خیال زنانہ جلسہ کے سوال و جواب:۔

کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کے شوہر ایک سوکن لا کر آپ پر مسلط کر دیں اور آپ کو ذلیل کر کے رکھ دیں''

''بے شک ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے''

تو حکومت آپ ہی کے جذبات کا احترام کر کے تو یکساں سول کوڈ نافذ کرنا چاہتی ہے''

لیکن حیرت ہے کہ کسی بی بی کی زبان پر یہ کھلا ہوا جواب کیوں نہیں آیا کہ ہمارے شوہر گھر گھر جا کر منہ کالا کرتے پھریں۔ بے نکاحی، دو دو چار چار آشنائیں رکھ کر اپنے گھر سے رات رات بھر غائب رہیں یا گھر آئیں بھی تو بہت دیر کر کے۔ اور ساری زندگی حرام کے ماحول میں بسر کرتے رہیں۔

سرکار کو اگر ہم سے کوئی ہمدردی ہے تو پہلے اس عذاب سے چھڑانے کے لئے کوئی قانون بنائے۔

(۲؍فروری ۶۹ء)

ایک ہجو ملیح

ایک کانگریسی، سوشلسٹ روزنامہ کی شاہ سرخی:۔

''صدر کانگرس کا شاہانہ جلوس۔ فضا جے کاروں سے گونج اٹھی''

اف ری شاہی اور بادشاہی کی سخت جانی اور سلطان اور ملوکیت کی خوش نصیبی! یعنی تحریک عوامیت اور جمہوریت کے صدر اور ملوکیت شکنی کے علمبردار کی توقیر و تعظیم لفظ ''شاہانہ'' سے! ۔۔۔۔ یہ اگر داد و تحسین ہوئی تو پھر ہجو ملیح کے لئے عنوان کہاں سے تلاش کر کے لائیے!

(۹؍مئی ۶۹ء)

گردن کشوں کی سجدہ ریزی

پشاور سے خبر آئی ہے کہ سابق صدر پاکستان جنرل یحیٰ خان نے صوبہ سرحد کی گورنمنٹ کے حضور میں درخواست کی ہے کہ انھیں خانہ قیدی سے رہائی دی جائے ۔۔۔۔ اور عبرت کی آنکھیں کھول دینے کو اتنی ہی خبر کافی ہے۔ چند ہی مہینے پہلے کوئی خیال بھی کر سکتا تھا کہ ایسے گردن کش کا سر اپنے ایسے ماتحتوں اور زیر دستوں کے آگے جھکے گا۔ آج کے صدر بھٹو تک خود ان کے سامنے کیا تھے۔ انھیں کے آگے جھکنا ان کو کس طرح گوارا ہوتا۔ اور پھر یہ درخواست تو خود صدر کے نام ہے بھی نہیں ان کی تحتی حکومت صوبہ کے نام ہے۔

بڑائی اور سربلندی ہے بھی کس بندے کے لئے؟ وہ تو صرف خدائے واحد کی ہے **ولہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض** کسی کی آنکھیں آج کھلیں کسی کی کل۔

(۲۳؍ستمبر ۷۲ء)

غریبی کے ٹھاٹھ

چھرا مئو ضلع فتح گڈھ (یوپی) کی خبر ہے کہ وہاں کے میونسپل بورڈ نے یہ طے کیا ہے کہ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کو چاندی میں تولا جائے گا اور اس کام پر ۳۸ ہزار روپے خرچ ہوں گے"

خبر میں یہ درج نہیں کہ تقریب کے وقت نعرے "غریبی ہٹاؤ" کے بھی لگ رہے ہوں گے یا نہیں۔

(۸ ستمبر ۷۲ء)

مثالی ستم ظریفی

ان سطور کو ان لوگوں کے لیے انتباہ کا کام دینا چاہیے، جو میرا بُت نصب کرنا چاہتے ہیں یا میری تصویریں آویزاں کرنا چاہتے ہیں اس قسم کی نمائشیں مجھے دل سے ناپسند ہیں"

گاندھی جی کی ایسی صریح و واضح ہدایتوں کے ہوتے ہوئے یقین ہوتا ہوگا کہ ان کا کہیں کوئی بُت قائم نہ ہوگا اور نہ کوئی تصویر کہیں آویزاں ہوگی ۔۔۔۔۔ایک سنجیدہ روزنامہ کے حسبِ روایت یہ مقولہ پچاسوں جُوں، سیکڑوں نمائشوں اور بے شمار تصویروں کے بعد عین اس کوہ پیکر نمائش اعظم کے دروازے پر ثبت ہے۔ جو "درشن اعظم" کے نام سے اور "میرا گھرانا ہے" کہ زیر عنوان ۱۴۰ ایکڑ زمین پر واقع ہے اور جس پر ایک کرور روپیہ سے زیادہ خرچ آچکا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ع

یاروں نے بُت شکن کو بُت ہی بنا کے چھوڑا

(صدق جدید ۲۰ فروری ۷۰ء)

زہریلی ترقیاں

السٹریڈ ویکلی آف انڈیا مؤرخہ ۶ ستمبر کا خوشگوار تذکرہ پچھلے نمبر میں آچکا ہے۔ نمبر مذکور پاکستان کے حق میں ہمدردی سے لبریز تھا۔ لیکن اس میں محض دودھ کا شربت ہی نہ تھا، کچھ قطرے زہر کے بھی ملے ہوئے تھے، یعنی جہاں پاکستانیوں کی سائنسی اور صنعتی ترقیوں کا تذکرہ تھا وہیں ذکر نسوانی

ترقیوں کا بھی تھا۔ بے حجابی اور فنونِ لطیفہ (ناچ گانے) میں ترقیوں کا! اور صفحوں کے صفحے ان رنگین تصویروں کے نذر تھے شاعری کی زبان میں محبوب کی آمد رقیب کے ساتھ ع

ہمراہ عدو آئے وہ یاں، ہائے قیامت!

ایک اور بھی ساتھ اپنے لگالائے قیامت!

(ایضاً ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

پرچم آصفی کی رحلت

حیدرآباد مرحوم کی خبر ۱۶ ستمبر کی ہے کہ مرکزی حکومت ہند کے حسبِ ہدایت آج پرچم آصفی کنگ کوٹھی سے اتار دیا گیا۔ اور ساتھ ہی وہ جھنڈی بھی جو میر برکت علی خان نظام حیدرآباد کی کار پر لگی رہتی تھی۔۔۔۔ سلطنتِ آصفیہ کا چراغ تو اس وقت گُل ہوگیا تھا، جب آج سے ۲۲ سال بیشتر اسی ستمبر میں آصف جاہ سابع معزول کردئے گئے تھے۔ اور اس شمع سوختہ کے پروانوں کی خاک تھی جسے آج بادِ صبا کا جھونکا یوں اڑا لے گیا۔ اور یہ پرانا شعر آج نئے روپ میں جلوہ گر ہوگیا ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا

یادگار رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک!

(ایضاً)

ہمارے گھرانے

حکایت فرضی وافسانوی نہیں واقعی ہے۔ ایک عرب فاضل مغربیات، مجاہد صواف، فصیح وبلیغ انگریزی ہندو روزہ لیسیکٹ (لندن) میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۶۷ء میں آکسفورڈ میں آیا تو سولہ مسلمان لڑکوں میں سے جن کی عمریں ۱۳، اور ۱۶ سال کے درمیان ہوں گی میں نے پوچھ دیا کہ ہم مسلمانوں کا ایمان کیا ہے؟ جواب ٹھیک آکسفورڈین لب ولہجہ میں یہ دیا کہ ''اسلامی تثلیث''۔ میں نے پھر سوال کیا کہ اسلامی تثلیث کیا چیز ہے؟ تو وہ بولا ''اللہ، محمد اور قرآن'' اور یہ تین خدا ایک ہی ہیں اور ایک خدا

تین ہیں' لڑکا بے وقوف نہیں اچھا خاصا سمجھدار تھا لیکن اسے یہی معلوم تھا''۔۔۔۔۔فرمایئے یہ قصہ پڑھ کر آپ کو ہنسی آئی یا رونا آیا؟ عجب نہیں کہ دونوں ایک ساتھ محسوس ہوئے ہوں۔

لیکن یہ گناہ کس کا ہے بجز اپنوں کے۔۔۔۔۔کبھی خود اپنی غلطی محسوس کیجئے! سارا الزام ہندوؤں پر عیسائیوں پر رکھ دینے کی عادت ترک کیجئے! مثال تنہا ایک نہیں خدا جانے کتنے خوش حال مسلم گھرانوں کے یہی رنگ ہیں۔

(۲۹/۸/۷۳ء)

خوش درخشندہ.....

دیوبند کے مولانا محمد طیب صاحب جو ذہانت وذکاوت میں اپنے جدِّ امجد مولانا قاسمؒ کے قدم بقدم ہیں اور ثقاہت میں اپنے مرشد حضرت تھانویؒ کے جانشین وخلیفہ ہیں۔شاہ گنج سے لکھنؤ جاتے ہوئے ۲/جولائی کو دوڈھائی گھنٹہ کے لئے دریابادا پنے اس نیاز مند کی مزاج پرسی کے لئے اترے۔۔۔۔بیماری بھی خوب جس کے لئے ایسے طبیب نصیب ہوں بقول حسرت موہانی ۔

صحتیں لاکھوں مری اس بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

(۱۸/جولائی ۷۵ء)

جنت رندی کی تلاش میں

کمتر لوگوں کو علم ہوگا کہ ملک میں دوسری یونیورسیٹیوں کے علاوہ ایک مستقل یونیورسیٹی گانے بجانے یا شریف فن موسیقی کی تعلیم کی بھی قائم ہے اور اس سے طبلچی اور سرنگیے ڈگری لے کر نکلتے ہیں۔اس کا مقام وقوع لکھنؤ ہے جو نوابان وشاہان اودھ کی جانشینی اور قدردانی لہو وغنا کا حق اب تک ادا کئے جارہا ہے۔ادارہ کی بنیاد ۱۹۲۸ء میں پڑی تھی اس کے طلبہ اور طالبات کی تعداد دوڈھائی سو سے

بڑھ کر چھ سو تک پہونچ گئی ہے۔ اور اب اسٹیمین (۲۱ راگست) کی دی ہوئی خبر یہ ہے کہ لکھنؤ کی ایک معروف بیگم صاحب اس کی وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہونے والی ہیں اور ان کی نگرانی میں اس کا ایک اور شعبہ کھلے گا۔۔۔۔ یہ خاتون ایک معزز و عالی خاندان صاحب کے حرمِ محترم میں داخل ہیں اور ماشاء اللہ دو دو حج کر چکی ہیں۔۔۔۔ عمل شاید اس چلے ہوئے مصرعہ پر ہے ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اکبر کا ذہن بہت گیا تھا تو یہاں تک کہ ع

مے بھی ہوٹل میں پیو، چندہ بھی دو مسجد میں

لیکن یہاں تک ان کے ذہن کی بھی رسائی نہیں ہوئی تھی۔

(۱۴ ستمبر ۷۳ء)

ترقی کا نشان

یونان کی خبر ہے کہ ایک ہندی فلم میں چوری کا ایک سین دیکھنے کے بعد ..... نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ رات میں ایک جوہری کی دوکان سے ۶۷ ہزار کی مالیت کا سونا اور زیور لوٹ لیا ملزم نے اقبال کر لیا ہے کہ فلم دیکھنے کے بعد اس نے دوکان کا سوئچ گرا دیا اور دستانے پہن کر ایک کھمبہ پر چڑھ گئے روشندان کا شیشہ توڑا اور اس میں رسی باندھ کر دوکان میں اتر گئے اور سونے اور زیورات کی چوری کے بعد رسی کی مدد سے واپس نکل آئے"۔

آپ ایسی خبروں کو سن کر ان سُنی کر دیجئے اور اپنے مشاہدات کو برابر جھٹلاتے رہیے اور خود اور اپنے گھر والوں کو خوب سینما دکھاتے رہیے اور اپنی سرکار سے بھی کہلواتے رہیے کہ سینما گھر پر سینما گھر کھلتے رہنے میں ترقی کی اصل علامت ہے۔

(۲۶ اکتوبر ۷۳ء)

ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر.....

خوشیاں منائی جارہی ہیں اور ایک دوسرے کو مبارکبادی دی جارہی ہیں کہ ہندو پاکستان

میں ایک نیا عہد نامہ ہوگیا ہے۔۔۔۔بادشاہوں میں جنگیں بھی ہوتی رہتی ہیں اور معاہدے بھی ہوتے رہتے ہیں۔عام پبلک کو ان رنگ رلیوں سے کیا واسطہ اور شاہانہ حیثیتوں سے کیا غرض۔جب تک کہ کوئی بات انھیں کی سطح میں اتر کر نہ کی جائے اور عوام کے دل کو نہ گرمایا جائے۔۔۔۔مہینوں نہیں برسوں گزر گئے ہیں کہ یہاں کے عزیز وہاں کے عزیزوں کی خیریت کو ترس رہے ہیں، نہ باپ کی خبر بیٹے کو اور نہ بھائی کی خیریت بہن کے علم میں۔اور جب خبر کے ملنے کا یہ حال ہے تو ایک دوسرے کو دیکھنے کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں۔ماں بچوں کی ممتا سے تڑپ رہی ہے اور بچے ماں کے نام پر بلبلا رہے ہیں۔عوام کو تو خوشی اس دن ہوگی جب ریل کھلے گی۔ڈاک کھلے گی۔خط اور تار آنے لگیں گے، منی آڈر ملنے لگے گی۔وی پی کی آمد و رفت ہونے لگی گی اتنا صبر آزما امتحان شاید ہی کسی ملک کا اس دورِ تہذیب میں لیا گیا ہو۔اور جب تک وہ گھڑی نہ آئے گی مسکراہٹیں کیونکر ہونٹوں پر آئیں گی۔

یہ نویدا اوروں کو جا سنا ہم اسیر دام ہیں اے صبا
ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر، ہمیں کیا جو فصل بہار ہے

(۱۴ر ستمبر ۷۳ء)

انٹرنیشنل نونہال

شرعی نقطۂ نظر سے جو بالکل ناجائز اولاد ہوئی اس کا حشر بدنصیب ماں کی زبان سے:۔

''میرا ایک لڑکا ہے نجے، اسکی عمر اب اٹھارہ سال کی ہے.....وہ عید کے روز خاص طور پر علیگڈھ جا کر نماز پڑھتا ہے اور کلکتہ جا کر دُرگا پوجا میں شامل ہوتا ہے''۔

اس خاندان کی جب سے تاریخ ہے کسی جد امجد کو ایسا نونہال خواب میں بھی کیوں نصیب ہوا ہوگا۔ جیسا کہ نجے ہے۔نماز عید علیگڈھ میں پڑھنے والا اور درگا پوجا کے لئے کلکتہ کا یاتری بن جانے والا!۔۔۔۔اکبر کے دین الٰہی کے خواب کی تعبیر ان بزرگ کو مبارک ہو۔

(۶ر جولائی ۷۳ء)

تحفۂ تہذیب

سائیگون یکم جنوری۔ایک کلیسائی ادارہ نے اپنے سروے میں یہ بتایا ہے کہ جنوبی ویت میں اس وقت تین لاکھ کی تعداد میں ویت نامی لڑکیاں ایسی ہیں جو ساقی گری اور عصمت فروشی کا کام کرتی ہیں اور ان میں بہت سی ایسی ہیں جو امریکنوں کے پاس بطور عارضی داشتاؤں کے رہ رہی ہیں. جنگ کے خاتمہ پر ان کا اہم مسئلہ پیش ہوگا. اکثر ان میں سے دیہات سے آئی ہیں اس وقت وہ چار پانچ ڈالر روزانہ کمارہی ہیں دیہات میں واپس ہوکر انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں"۔

لیکن اس میں عیب ہی کیا ہے. عیب تو اس میں تھا کہ یہ گرفتار ہوکر آتیں اور باعزت اور شرعی کنیز بن کر کسی شریف خاندان کا جزو بن کر رہتیں۔۔۔۔ چراغ خانہ بن جانے میں وہ لطف کہاں جو شمع محفل بننے میں ہے۔

(۱۶ر جنوری ۷۰ء)

ایک دلکش نظارہ

وہ دیکھیے نا، وہ سامنے ایک انسان کس طرح بے حس وحرکت کھڑا ہوا ہے جیسے پتھر کے مجسمہ کی طرح جامد اور منہ مغرب کی طرف کئے ہوئے. اب دیکھیے وہ کمر سے جھکا اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے ہے اور لیجیے اب اس نے ایک اور ہیئت اختیار کی. پیر سمیٹ کر اس نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور پھر دوزانو بیٹھا اور پھر کھڑا ہوگیا اور اس دوران میں وہ خاموش نہیں مسلسل کچھ کچھ پڑھے ہی گیا۔۔۔۔ یہ مسلم ہے جو جامع مسجد دہلی میں اپنے پروردگار کو یاد کررہا ہے. یہ اس کی نماز ہے. عبادت ہے۔۔۔۔۔ اور دیکھیے مسجد کے وسیع صحن کے وسیع حوض کے گرد لوگوں کا کیسا مجمع ہے. کچھ بیٹھے کچھ کھڑے، کوئی اپنا چہرہ دھورہا ہے اور کوئی اپنے ہاتھ پیر کی صفائی میں مشغول ہے. یہ سب نماز کے لئے تیار ہورہے ہیں. یہ سارا روح پرور نظارہ خود ہی ایک طرح کی عبادت ہے!

یہ ہے اپنایا ہوا خلاصہ ایک طویل مضمون کا جو اسٹیٹمین کے اسی نمبر کے ایک پرچہ میں خاصی

تفصیل وسط کے ''جامع مسجد'' دہلی پر نکلا ہے۔۔۔۔۔بد بخت مسلمان اب اپنی نماز وعبادت سے بھی .....شرمانے، جھینپنے لگا ہے۔غریب کو کیا خبر کہ نماز کی معنویت اور اس کا خشوع وخضوع الگ رہا اس کی اَڑی پڑی اور خستہ حال ہیئت تک غیر مسلموں کی نظر میں کس قدر جاذبیت اور دلکشی رکھتی ہے۔

(۲۴ر اکتوبر ۲۹ء)

اہل ناز کا نیاز

نیویارک سے خبر آئی ہے کہ اہل شکاگو کی مے نوشی، بدمستی، قمار بازی، اور ہر وقت کی خون ریزی سے تنگ آ کر وہاں کی انجمن کلیسا (چرچ فیڈریشن) نے بالآخر خدا سے دعا مانگنے کی ٹھہرائی، چنانچہ ایک لاکھ پروٹسٹنٹ مسیحیوں نے دعا مانگی، کہ بدمعاش اور سیاسی خائن غارت ہوں (ڈیلی ٹیلیگراف لندن ۹ر مارچ ۲۸ء)

یہ دعائیں مانگنا، مسجدوں میں جا جا کر، مصلے پر بیٹھ بیٹھ کر، سجدہ میں گر گر کر، پروردگار کے سامنے گڑگڑانا، تو مشرق کی ایک تاریک خیال قوم کا شعار تھا، یہ کیا ہوا، کہ مہذب قوم کی مہذب آبادیاں بھی اسی دقیانوسیت میں مبتلا ہوگئی؟ اب تک تو ہم تہیدست وتہی دماغ یہ سمجھے ہوئے تھے، کہ خدا کے قائل وہی ہوتے ہیں، جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا، لیکن ''صاحب'' کے پاس تو سب کچھ ہے، پولیس ہے، خفیہ پولیس ہے، علانیہ پولیس ہے، فوج ہے، خزانہ ہے، توپخانہ ہے، بم کے گولے ہیں، لشکر جرار ہے، موٹریں ہیں، ہوائی جہاز ہیں، ہتکڑیاں ہیں، بیڑیاں ہیں، بڑے بڑے ہیبت ناک پھاٹکوں والے جیل خانے اور بڑے بڑے ہیبت ناک برقنداز ہیں، پھانسی گھر ہیں، جلاد ہیں، تفتیش جرائم کے سائنٹیفک طریقے ہیں، اور ان طریقوں کے ماہرین خصوصی ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ماننے کی ضرورت، اس سارے سامان کے باوجود بھی پڑ جاتی ہے! اب تک تو اس عقیدہ کو ایک توہم اور ڈھکوسلا ہی سمجھتے رہے، پر کیا کیجیے، کہ ''صاحب'' کو کبھی کبھی اس وہم میں گرفتار ہونے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

(۱۱ر اپریل ۲۸ء)

منکروں کا اقرار

''اس وقت جب کہ مغربی دماغ حرکت وتغیر میں ہے، مذہب اسلام مغربیوں کی روز افزوں

تعداد کے لیے بہت زبردست کشش رکھتا ہے۔ ووکنگ اور ساؤتھ فیلڈس کی مسجدوں میں جماعت کے وقت ہمیشہ مغربی نمازیوں کی ایک تعداد موجود رہتی ہے'' (سنڈے سن، ۱۰ر جون ۲۸ء)

یہ الفاظ کسی مسلم مبلغ کی زبان سے نہیں، ایک مخالف مسٹر ہیڈن نائٹ کے قلم سے، ایک برطانوی ہفتہ وار میں نکلے ہیں، جس نے یہ ثابت کرنے کو قلم اٹھایا ہے، کہ جو انگریز ''مشرقی مذاہب کو قبول کرتے جارہے ہیں، وہ تحقیق حق کی بنا پر نہیں کرتے، بلکہ محض شوق جدت کی بنا پر، اور کل جدید لذیذ کے ماتحت کررہے ہیں۔ اسلام کی مقبولیت وکشش کا یہ اعتراف کسی ہمدرد کی زبان سے نہیں، مخالف کی زبان سے ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ، کہ آیا آج بھی اسلام کے ہاتھ میں کوئی تلوار موجود ہے، جو سیکڑوں، ہزاروں فرنگیوں کو ڈرا دھمکا کر مسجدوں میں لارہی ہے؟ آج بھی مسلمانوں میں کوئی محمود غزنوی، کوئی اورنگ زیب عالمگیر زندہ ہے جو منکروں سے بجبر اسلام قبول کرا رہا ہے؟

(سچ، ۳۰ر اگست ۲۸ء)

شادی میں غم

امریکہ میں ''یوم آزادی'' ہر سال جس طرح منایا جاتا ہے اب کے بھی منایا گیا۔ امریکی اخبارات مسرت واطمنان کے ساتھ لکھ رہے ہیں، کہ اب کی اس جشن کے حادثوں کی تعداد ہر سال کے مقابلہ میں بہت کم رہی، اور یہ ''شادی'' گویا ''غم'' کی آمیزش سے گویا پاک رہی، اس اصلاح حال کے باوجود چند اعداد ملاحظہ ہوں:-

صرف	۱۰۶	اشخاص ڈوب کر ہلاک ہوئے۔
فقط	۵۶	نفوس موٹروں سے کچل کر مرے۔
محض	۱۱	افراد کی جانیں آتشبازی کی نذر ہوئیں۔

گویا کل ملا کر ۱۷۰ جانیں ضائع ہوئیں۔ اور چار ہزار انسان زخمی ہوئے! قومی جشن اور مذہبی تہوار ہمارے ملک میں بھی آتے رہتے ہیں۔ ''عید'' بھی آتی ہے اور ''بقرعید'' بھی۔ ''محرم'' کے باجے بھی آتے رہتے ہیں اور ''شب برأت'' کی چھچھوندریں بھی۔ اور ہمارے ہمسایوں کے

ہاں ''ہولی'' بھی ہوتی ہے، اور ''دیوالی'' بھی. ''دسہرہ'' بھی اور ''جنم اشٹمی'' بھی. ہندوستان کی آبادی، امریکہ کی تین گنی ہے، کیا ہمارے ہاں بھی ہر سال جشن منانے والوں میں پانچ پانچ چھ چھ سو مرتے رہتے اور بارہ بارہ ہزار زخمی ہوتے رہتے ہیں؟ لیکن ہندوستان بہرحال پست وذلیل، جاہل و ناخواندہ، غیر مہذب وتاریک خیال ہے، وہ روشن خیالی، تعلیم یافتہ امریکہ کی ترقی کمالات سے مقابلہ کا آخر حوصلہ ہی کیوں رکھتا ہے؟

(سچ ۲۴/اگست ۲۸ء)

اہل ''عقل'' کا کمالِ ''نقل''

(۱) انگورہ اسمبلی کے صدر، کاظم پاشاہ کے ایک تازہ ارشاد کا خلاصہ ہے، کہ آزاد ترکی کی خواتین کا اپنے بالوں کو کٹا کر پھر اُن کے بڑھانے کی کوشش کرنا زوال وتنزلی کی ایسی ہی کھلی ہوئی علامت ہے، جیسے نقاب کو پھر سے استعمال کرنے لگنا! اسی طرح نیچی چولیوں کی قمیص پہننا عورت کے لیے نہایت مکروہ اور بدزیب ہے، اور خواہ مخواہ اپنے کو مہذب دنیا کی نگاہوں میں فضیحت کرانا ہے. ٹانگوں اور بازوؤں کو بدقطع کپڑوں کے اندر قید کرنا بے معنیٰ اور ان اعضاء کے حسن وجمال پر ظلم کرنا ہے'' (ٹائمز گارڈین، ۱۷/اگست ۲۸ء)

(۲) ایک مشہور ترکی واہل قلم ومدبر، رشید صقوت بے اپنے ایک طویل مقالہ میں فخریہ ارشاد فرماتے ہیں، کہ ''آیندہ ٹرکی کی حیثیت ایشیاء میں مغربی تمدن کے علمبردار کی ہوگی (آئرش ٹائمس بڈلین، ۱۲/اگست)

(۳) شاہ ایران کا تازہ فرمان یہ ہے کہ ہر ایرانی کو کوٹ پتلون، اور وردی کی ٹوپی پہننا چاہیے. مجلس بھی عنقریب تجدد کی تائید کرنے والی ہے. عورتوں کی بے نقابی ترقی پر ہے. اور مردوں عورتوں کو پبلک میں ایک ساتھ چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی ہے. (ڈیلی میل، مڈنگ پوسٹ، ۱۲/ستمبر)

(۴) شاہ افغانستان کے ارادہ نے کہ افغانیوں کا آیندہ لباس یوروپی رہے گا، کلکتہ میں اچھی خاصی حرکت پیدا کردی ہے. تیار شدہ انگریزی لباس کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے، اور انگریزی طرز کے وزیروں کی ایک پوری نوآبادی گارڈن ریچ کلکتہ میں قائم ہوگئی ہے'' (ایضاً)

''ترقی'' کی ان چاروں خبروں کا ماحصل یہ نکلا، کہ اگر ترقی منظور ہے، تو تمامتر اہل فرنگ کی نقالی شروع کردی جائے۔ گویا ''عقل'' کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ سراپا ''نقل'' بن جائے! دنیا اپنی روش پر چل رہی ہے، رفتارِ کائنات کو اپنی مرضی کے مطابق لے آنا کسی بشر کی بات نہیں۔ قلب مومن کو اس قسم کے واقعات سے صدمہ پہونچنا یقینی ہے، لیکن مایوس اور شکستہ دلی کی مسلمان کے لیے کوئی وجہ نہیں۔ مسلمان کا فرض، دنیا کو اپنی راہ پر لے آنا نہیں، صرف کوشش کرتے رہنا ہے۔ جنگ میں اگر قسمت یاور نہیں، بڑے بڑے افسر کام آچکے ہیں، اور فوج میں بے ترتیبی کے ساتھ بھاگڑ پڑ چلی ہے، تو جاں باز و فرض شناس سپاہی کا کام اِس ہلّو میں شریک ہوکر بھاگنا نہیں، مایوس ہوکر خودکشی کرلینا نہیں، بلکہ صبر واستقلال کے ساتھ مورچہ پر ثابت قدم رہنا ہے۔ تسلی کے لیے ضرورت فتحمندی کی نہیں، بلکہ صرف ادائے فرض کی ہے۔ مکہ کی مظلومیت وبیکسی ہو یا مدینہ کی خودمختاری و بادشاہی، فاروق اعظم کا کوکبۂ جلال ہو یا شہید کربلا کی تشنہ لبی، اہل ایمان کو تسکین قلب دونوں صورتوں میں نصیب رہتی ہے۔ اطمنان قلب کا تعلق بندوں کی رفاقت سے نہیں، بندوں کے پروردگار کی معیت سے ہے۔ اکبر مرحوم کی زبان میں ؎

دین خدا ہے حق کی تجلّی کے واسطے
دنیا اٹھی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ
اللہ ہی ہے اُن کی تسلی کے واسطے

(۱۹/ اکتوبر ۲۸ء)

فطرت سے بغاوت

ماہ اکتوبر میں انگلستانی اخبارات میں ایک مقدمہ کی مفصل روداد شائع ہوئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے، کہ نومبر میں ایک جوان عورت، مس براؤن نے مردانہ لباس پہن کر اور اپنے کو مرد ظاہر کرکے ایک دوسری نوعمر عورت سے، گرجا میں جاکر باضابطہ نکاح کرلیا، اور اسے اب تک برابر اپنی بیوی

کی طرح اپنے ہمراہ رکھا دلہن کے والدین حیران و پریشان، بالآخر باپ کو تہ لگ گیا۔ دعوی دائر کر دیا۔ راز فاش ہوا اور ''شوہر'' کو عدالت سے ایک مہینہ دس دن کی سزائے قید ہوئی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں سب سے زیادہ اپنی حیرت کا اظہار کیا، اور لکھا ہے کہ اس عجیب وغریب جرم کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، سوا اس کے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے، کہ براؤن کسی وقت بھی اس دوسری عورت سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی۔

مجسٹریٹ کو تو خیر، جرم پر حیرت ہوئی، لیکن فیصلہ پڑھنے والوں کو خود اس حیرت پر حیرت ہے۔ کیا بھولے مجسٹریٹ کو اتنا نہیں معلوم، کہ فرنگستان کی بیٹیوں میں جو جنون تعیش پیدا ہو چکا ہے، اُس کے لازمی نتائج کیا نکلتے ہیں؟ کیا حد سے بڑھی ہوئی آزادیوں، بے قیدیوں اور بیباکیوں کے بعد، نفس کی خواہشوں کا فطری طریقوں کے اندر محدود رہنا کسی طرح ممکن ہے؟ کیا لباس و وضع میں، اطوار میں، اور تا بہ امکان جسم کی ساخت اور بناوٹ میں، عورت کا، اپنی تمام نسوانی خصوصیات کو مٹا دینا، اور فخر و مسرت کے ساتھ مردانہ پن اختیار کر لینا، جب بالکل جائز اور عام ہو گیا، تو یہ جنون یہیں تک پہونچکر رک جائے گا، اور اس سے آگے بڑھ کر مردانگی کے تمام لوازم کے اختیار کرنے کی کوشش چھوڑ دی جائے گی۔ ''چاہ تنہائی'' Well Of Loneliness اور اسی مضمون کی دوسری کتابیں، جن کا موضوع عورت کا عشق عورت کے ساتھ ہے، جو برطانیہ میں بار بار لکھی جا رہی ہیں، اور بار بار بحق سرکار ضبط ہو رہی ہیں، کیا بغیر ملک کے عام رجحان کا اندازہ کیے، یوں ہی بلا وجہ لکھی جا رہی ہیں؟ قرآن سے اگر بے خبری ہے، تو کیا بائبل کو بھی بالکل بھلا دیا گیا ہے، جس نشۂ تمدن سے جھومتی ہوئی، بعض پچھلی قوموں کے واقعات کیا کچھ، اور کیسے کھلے ہوئے لفظوں میں طشت از بام نہیں کیے گئے ہیں؟ یہ خوب ذہنیت ہے، کہ پہلے تو خود ہی شرم و حیا، عصمت و عفت کی قیدوں کو توڑا جائے، اور جب اس تربیت و معاشرت کے قدرتی نتائج ہونے لگیں، تو ایک معصومیت کی ادا، اور بھولے پن کے انداز سے اِدھر اُدھر دیکھا جانے لگے!

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن، ہشیار باش!

(۱۵ر نومبر ۲۹ء)

جہاں پناہ کا غسلِ صحت

یاد ہوگا، کہ شروع سال میں، شاہ جارج پنجم، بیمار پڑے تھے، اور پھر شدید وخطرناک علالت کے بعد اچھے ہوئے تھے۔ جہاں پناہ کے صحت یاب ہونے پر ہندوستان کی وفادار رعایا نے ایک ''شکریہ فنڈ'' کھولا تھا، اور وائسرائے بہادر اس فنڈ کے سرپرست قرار پائے تھے۔ ۳۱ر دسمبر، فنڈ کے کھلے رہنے کی آخری تاریخ ہے۔ تخمینہ تھا کہ ۲۵، ۳۰ لاکھ ضرور فراہم ہوجائے گا، لیکن ان سطور کی تحریر کے وقت تک فنڈ کی میزان اس رقم کی ایک ثلث بھی نہیں ہوتی ہے۔ اخبارات اس پر طرح طرح کی رائے زنی کررہے ہیں۔ اور جو اخبارات انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں، وہ تو خاص طور پر حسن توجیہ ولطفِ تعلیل کے پُر لطف نمونے پیش کررہے ہیں، لیکن فنڈ کی کامیابی وناکامی سے بالکل قطع نظر کرکے اصلی داد کے قابل شی، فنڈ کی جدّتِ نوعیت ہے۔ بیمار (نصیب دشمناں) جہاں پناہ ہوتے ہیں، غسلِ صحت جہاں پناہ فرماتے ہیں، لیکن خوشی کے شادیانے جہاں پناہ کے قصرِ معلّٰی میں نہیں، بلکہ رعایا کے جھوپڑوں میں بجتے ہیں! بادشاہ سلامت خود رعایا کو انعام واکرام سے مالا مال نہیں کرتے، کنگلوں کو غلّہ، ننگوں کو کمبل، اور معصوم بچوں کو شیرینی تقسیم نہیں فرماتے، بلکہ رعایا اپنی جیب سے عقیدت کے نذرانے نکال نکال کر پیش کررہی ہے! مشرقی تاجداروں کے دماغ بھلا یہاں تک کہاں پہونچ سکتے تھے، کہ جشن مسرت کے یہ موقعے، رعایا کو کچھ دینے کے لیے نہیں، بلکہ اُن سے لینے کے لیے ہوا کرتے ہیں! دانایانِ فرنگ آخر دانا کہے کیوں گئے ہیں!

(۱۳ر دسمبر ۲۹ء)

ساتواں باب

انشائے ماجدی

''انشائے ماجد'' یا ''لطائفِ ادب'' صاحبِ طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مختلف ادبی موضوعات پر لکھے گئے مقالات ومضامین کا مجموعہ ہے۔ جوانشائے ماجدی کا حقیقی ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب میں ایک قابل فخر ذخیرہ ہے۔

کتاب کے ابتداء ہی میں ایک مفصل مقالہ ''پیام اکبر'' کے عنوان سے ہے۔ جواس کتاب کی روح ہے۔ مولانا دریابادیؒ نے اس میں اکبریات کے چاروں موضوع (۱) ظرافت وزندہ دلی (۲) سیاسیات (۳) عشق وتغزل (۴) اخلاق ومعاشرت پر پُرمغز اور جامع انداز میں گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مقالات میں ''الفاظ کا جادو'' ''جھوٹ میں سچ'' ''بہار کی بہار'' ''موت میں زندگی'' اور ''خیر مقدم لکھنوی زبان سے'' قابل دید وداد ہیں۔

مقالات کے علاوہ چند مقدمے، چند تبصرے، چند نثر یئے، اور چند مرثیے بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ اخیر کے دو عنوان اپنی اہمیت کے پیش نظر مستقل باب کے مستحق تھے۔ اس لیے ہم نے ان کو علحدہ باب کی شکل دی ہے۔

اس کتاب کے شروع میں ''عرضِ حال'' جو مولانا دریابادیؒ کے قلم کا رقم فرمودہ ہے۔ کچھ کچھ حذف وتلخیص کے ساتھ بعینہٖ ملاحظہ فرمائیے۔

> ''خدا کی شان، ایک کم سواد، کم استعداد، قصباتی، دیہاتی کو بھی اس کا حوصلہ کہ اپنا نام ادیبوں، انشاء پردازوں کی فہرست میں لکھائے اور دل میں ولولہ کہ زبان وادب کی خدمت کرنے والوں کی صف (صفِ آخر ہی سہی) میں جگہ پائے۔

''اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے''

اسرائیلیوں کی زبان میں لو اور سنو، میاں طالوت کا شمار بھی پیمبروں میں ہونے لگا۔ مصر کی غریب ضعیفہ کو شوق یوسفؑ کی خریداری کا چرایا۔ اہل کرم کی ذرّہ نوازی، دوستوں کی بے جا مدح و حوصلہ افزائی اور پھر اپنا ذوقِ نمائش، یہ سب مل ملا کر جو بھی کر گزریں، تھوڑا ہے۔

پُرانے اور نئے ایسے مضمون جنھیں کچھ نہ کچھ مناسبت ادب و زبان سے ہو۔ رائے یہ ٹھہری کہ یکجا کر لئے جائیں۔ بعض ان میں کے نسبۃً حال کے ہیں اور بعض ۳۰، ۳۵ سال قبل کے، اتنے عرصہ میں قلم کا مذاق کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس لیے نظر ثانی، اور وہ بھی جزئیات کی حد تک ان قدیم تحریروں پر بھی کر لی گئی، کہ طرز و عبارت میں یکسانی کسی درجہ میں پیدا ہی ہو جائے۔

جو باکمال اس میٹھی پھیکی غذا پر منھ بنائیں گے، وہ محض اپنی خوش ذوقی اور حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے اور جو پردہ پوشی سے کام لیں گے وہ کرم فرمائی اور صفت ستاری کا نقش بٹھا دیں گے مقام عدل و مقامِ فضل دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دوسرا پہلے سے خوب تر ہے اور اُس سے اعلیٰ و برتر۔''

پیام اکبر

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانہ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جن کا مثل ونظیر کہیں مدتوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔ان کی ذات ایک طرف شوخی وزندہ دلی ،اور دوسری طرف حکمت وروحانیت کا حیرت انگیز مجموعہ تھی یا یوں کہئے کہ ایک طرفہ معجون۔آخر آخر ان کی شاعری نہ شاعری رہی تھی۔نہ ان کا فلسفہ فلسفہ۔ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود مجسم حکمت ومعرفت کے سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ان کی گفتگو جامع تھی حکمت وظرافت کی ،ان کی صحبت ایک زندہ درس گاہ تھی۔تصوف ومعرفت کی روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کر جاتے کہ دوسروں کو غور وفکر کے بعد بھی نہ سوجھتے ،اور باتوں باتوں میں ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے ،جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی نہ حل ہو پاتے۔ خوش نصیب تھے وہ جنہیں ان کی خدمت میں نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔جن کی رسائی اس چشمہ حیات تک نہ ہو سکی ،انہیں آج اپنی نارسائی ومحرومی پر حسرت ہے،اور جن کی ہو چکی تھی انہیں یہ حسرت ہے کہ وہ اور زیادہ سیراب کیوں نہ ہوئے۔

اکبر ظریف اور بہت بڑے ظریف تھے۔جب تک خود جوان رہے شوخ طبعی بھی جوان رہی۔عمر کا آفتاب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔بالوں میں سفیدی آئی۔صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی تو حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا ،سوز عشق نے سینہ کو گرمایا ،ذوق عرفاں نے دل کو تڑپایا اور نور معرفت کی شعائیں خود ان کے مطلع قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھیں قریب تھا کہ چکا چوند میں پڑ جائیں

(ص:۱۹، ۲۰)

اس وقت ملت پر فرنگی تہذیب ومعاشرت کا جن مسلط ہے۔اس نے نوبت یہاں تک

پہنچادی ہے کہ علم، ہنر، اخلاق کے ساتھ حسن وعشق عیش وعشرت سب کا معیار بدل گیا ہے. اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں تک میں پابند روز بروز مغربی معیار کے ہوتے جاتے ہیں. یہ کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں ادا ہوگئی ہے ۔

فکر ساری کی ہے نہ کنگن کی
اب تو دھن ہے انھیں فرنگن کی

اور خیر اِدھر عاشقوں کا حال تو بدلا ہی تھا، غضب یہ ہوا کہ ادھر محبوبوں کی جماعت بھی ''انقلاب زندہ باد'' کی نذر ہوگئی. ادھر کی وضعداری میں فرق آیا تو ادہر کی بھی طرحداریاں کب اپنے رنگ پر قائم رہیں. بازارِ حسن میں چلن نئے سکّوں کا ہوگیا. پرانے سکّے ٹکسال باہر ہوگئے. اب تک مشرق اور مشرقی شاعری میں حسن کا سب سے بڑا زیور شرم وحیا، تمکین وحجاب کو سمجھا تا تھا لیکن اب جو جا کر دیکھا تو محفلِ ناز کا رنگ ہی بدلا ہوا، کہاں کی کم سخنی اور کیسی بے زبانی؟ مشق اب خطابت کی ہو رہی ہے. نہ اب نگاہ شرمگیں نہ چشم سرمگیں. اٹھی ہوئی نگاہیں چڑھی ہوئی آنکھیں اب خود محو نظارہ، چہرہ پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور سنہری کمانیاں! حجلۂ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹ مٹا کر ڈرائنگ روم میں ٹھاٹھ محفل طرازی وبزم نوازی کے جم رہے ہیں. عاشق بے چارہ اس قلب ماہیت پر دنگ رہ جاتا ہے اور کہتا ہے ۔

خامشی سے ہے تعلق نہ ہے تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں
(ص : ۲۵)

ندرت تشبیہات، اکبر کے نسخۂ ظرافت کا جزو اعظم ہیں. ایسی ایسی اچھوتی، نادر ولطیف

تشبیہیں اور کہیں کہیں پھبتیاں انھیں خود بخود سوجھ جاتیں، جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار کے بعد بھی نہ آتیں. یہ ہم آپ سب جانتے ہیں، روزمرہ دیکھتے ہی رہتے ہیں کہ ایک طرف تو شوق صاحبیت کا سوار رہتا ہے. دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ، کچھ ذات برادری والوں کا ڈر، کچھ وضع کا پاس. غرض ''نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے'' ایک تذبذب، گومگو، اور دوعملی کا عالم قائم. چار قدم آگے بڑھے تو چھ قدم پھر پیچھے ہٹ گئے. کتر بیونت کچھ ادھر سے کی، کچھ ادھر سے. جوڑ پھر بھی ٹھیک نہ بیٹھا. نہ خدا کی یافت ہوئی، نہ صنم کا وصال نصیب ہوا. ہنسے گئے، بنائے گئے، قہقہے ادھر سے بلند ہوئے۔ تالیاں ادھر سے بجیں، واقعیت کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبر کی گلکاری ملاحظہ ہو ۔

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر چڑھ کر تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

(ص :۲۹)

زمانہ کی ناقدری، شاعری کی دنیا کا بڑا پُرانا مضمون ہے. شاعر سدا سے سامعین کی بدمذاقی اور ناقدرشناسی کا رونا روتے چلے آئیں ہیں. لیکن یہی صدائے درد، جب چمنستان ظرافت کے اس عندلیب کی زبان سے نکلتی ہے تو نغمۂ لطیف بن کر کان میں آتی ہے رُلاتی نہیں ہنساتی ہے، اور چٹکی، گدگدی میں تبدیل ہوکر رہتی ہے ۔

قدردانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج
بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ اُلو نہ ہوئے

اردو دانوں، اردو خوانوں، اردو نویسوں کی بزم میں مرحبا اور سبحان اللہ کی کیا کمی. تحسین کے وہ غلغلے، آفریں کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل کی محفل گونج جائے. در و دیوار ہل ہل جائیں. لیکن لفاظی کے اس شور و ہنگامہ کے آگے؟ بس خلا ہی خلا. بڑی بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپایئے. اس کے بعد خود ہی اپنے ہاتھ سے مسودہ کو صاف کیجئے. مطبع والوں کے دروازہ پر دستک دیجئے. ان کے

سارے شترغمزے برداشت کیجئے..وعدے وہ صبر آزما کہ پریس کے شکنجہ میں کتاب کے صفحوں کے ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی دبوایئے .اور جب خدا خدا کر کے کتاب پریس سے باہر آئے تو خود ہی اشتہار لکھیے اور پھر مدتوں خود ہی پڑھتے رہیے. کتابیں یا تو دوستوں کو ہدیۃً تقسیم کر دیجئے ورنہ ڈھیر اپنے سامنے لگا دیکھ کر بس خوش ہوتے رہیے. یہ خشک حقیقت اردو اہل قلم کے لئے کیسی ہی یاس انگیز، دل شکن، ہمت توڑ سہی لیکن ظرافت کی مسیحائی نے اس بے جان لاشہ میں کیسی جان ڈال دی ؎

کھلا دیواں مرا تو شور تحسین بزم سے اٹھا
مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

(ص: ۳۶)

اعتراض بہت پرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزور شمشیر کی. ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے. فرماتے ہیں کہ ہماری شمشیر کی تو یہ دھوم دھام ہے لیکن اپنی ''توپ'' پر بھی کبھی نظر کی ہے؟ ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی، مذہب کی تو کی، توحید و رسالت ہی کے لئے تو کی. گردنیں اس لئے ماریں کہ دوزخ کے دائمی عذاب سے بچائیں، جنت کی دائمی راہ دکھائیں، مے فروشی سود خواری، بے حجابی حرام کاری، زر پرستی کی اشاعت کے لئے نہیں کی، توپ دم قوموں کو قبیلوں کو اس لئے تو نہیں کر دیا کہ قبضہ ان کے گھروں پر، ان کی جائیدادوں پر ان کی دولت پر کریں اور ان کی جانوں کو ان کی اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں! سارے مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی کچھ فکر ہے نہ کچھ پروا ہے
غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے؟

(ص: ۳۸)

آج انھیں اپنی طاقت وتوانائی پر غرّہ ہے، کیا انھوں نے کبھی خیال کیا نہیں کیا، کہ شمع دم بھر میں سیکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالی، لیکن خود صرصر فنا کے ایک طمانچہ کے سامنے معاً بے نور تھی. ہاتھی نے ایک قدم رکتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا لیکن قضائے الٰہی کے پیل تن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے خود تودۂ خاک تھا. طاقتوروں نے کمزوروں کو، زبردستوں نے زیردستوں کو، سرمایہ داروں نے ناداروں کو تختۂ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اس کا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں، روما کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر، اسیریا کے ویرانے مذبوح ومقتول زار روس کے جسم کی تڑپ، اور زندہ در گور قیصر جرمنی کے دل کی حسرتیں دیں گی. اکبر کا مرقع سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ؎

شک اس میں کیا ہے کہ ساری دنیا ہے آج ان کی رفل کی زد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ، اجل کی زد پر

(ص: ۵۹)

اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے، وہ اگر زندہ ہوتے تو مغلوبیت کی یہ نوبت ہی کیوں آتی. ثروت وخوشحالی اول تو باقی ہی کہاں تھی. جائیدادیں بارِ قرض سے دبی ہوئی اور زیور، مہاجنوں، ساہوکاروں کے یہاں رہن اور پھر جو کچھ روپیہ پیسہ رہا وہ بھی ناچ رنگ کھیل تماشے، ٹیم ٹام کی نذر. نہ اعلیٰ تعلیم وتربیت، نہ کوئی ملی اتحاد وتنظیم، نہ ہمت وخودداری، نہ جوشِ توحید وولولۂ دینی، نہ قناعت وایثار. عقیدے مشرکانہ، اخلاق جاہلانہ، معاشرت مسرفانہ، آپس میں بغض، ایک کی تاک میں ایک لگا ہوا، عجمیت اور ہندیت کے حملے تو سیکڑوں سال سے جاری تھے، اب آخری زبردست ٹکر، فرنگیت سے ہوئی، اور اس نے کہنا چاہیے کہ پُرانے سفینۂ عرب کو پاش پاش ہی کر دیا. ادھر مغرب کی اس زیرک وزمانہ شناس اقبال مندی کے لحاظ سے پرشباب قوم انگریز نے تیر وتبر، توپ وتفنگ سے کہیں زیادہ بے پناہ حربہ تعلیم اور پروپیگنڈا کا استعمال کرنا شروع کر دیا. اور اپنے ایجنٹوں، گماشتوں کارندوں کو اسکول اور کالج کے قالب میں لا کھڑا کیا! نتیجہ یہ

ہوا کہ ہر دل پر عظمت فرنگ کا نقش. ہر زبان پر اقبال سرکار کا کلمہ!.....دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں، زبردست جب کمزوروں پر غلبہ پاجاتے ہیں، تو بس یہی ہونے لگتا ہے، ہر چیز حاکموں کی عینک سے محکوم بھی خود دیکھنے لگتے ہیں، اور نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی ہے، نہ اپنی نظر. اور تاریخ کا ہے کہ قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آرہا ہے ۔

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل سے یوں ہی مرے یار ہوتی آئی ہے

تو یہ تھی وہ فضا جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں، یہ تھا وہ ماحول جس میں انہیں اپنا پیام پہونچانا تھا. رسمی شاعر نہ تھے، ہوتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی. جس طرح ان کے ہمعصر اچھے اچھے خوش فکر شاعر، زینت مشاعرہ بنے ہوئے تھے، یہ بھی آراستہ پیراستہ طرحی غزل کہتے رہتے. یا بے طرح قافیہ پیمائی میں لگے رہتے. لیکن مشکل یہ تھی کہ صاحب نظر تھے، ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے، ایک خاص مقصدِ حیات لے کر آئے تھے، ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بار ان کے نشانہ پر تھا، یوں کہیے فطرت کی جانب سے ایک ''رسول'' ہو کر آئے تھے، صاحب کتاب حقیقی رسولوں کے جانشین اور ادنیٰ خادم. دل کڑھا، دماغ متأثر ہوا، آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا، جو دوسروں کی نظر سے اوجھل تھا، ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردِ عمل تھا، ان کی شاعری اول سے آخر تک، اس مادیت و فرنگیت کا جواب ہے، ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانہ پر آکر لگتا ہے

(ص: ۸۱، ۸۲)

ہمارے ہاں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ شروع سے دبی لچی رہے. خانہ داری کے طور طریقے سیکھے، کہ آگے چل کر اسے گھر کی ملکہ بننا ہے، بچپن میں والدین کی اطاعت اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانہ جنت خیال کرے، خانگی شیرازہ اس کی ذات سے بندھا ہوا رہے، خاندان کی مسرتیں اس کے دم سے قائم رہیں، صحیح معنیٰ میں ''اہل خانہ'' ثابت ہو. اولاد کو تربیت کے بہترین راستہ پر ڈال سکے، شوہر کی عزت و محبت، بڑوں کی تعظیم و خدمت گزاری اور چھوٹوں کی الفت

وشفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے اور انھیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو، فرنگیوں کے یہاں عورت کی عزت کا معیار ہی کچھ دوسرا ہے، ان کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لئے باعثِ توہین ہے، موجب تحقیر ہے. ان کی فرہنگ میں ادب وتعظیم، اطاعت وخدمت گزاری مرادف ہیں محکومی کے، غلامی کے، ان کا قول ہے کہ عورت اپنے کو چھپانے کے لئے نہیں، دکھانے کے لئے آئی ہے، اس کا کام یہ نہیں کہ جب دیکھیے گھر ہی کے اندر، شوہر کے، یا ساس نند کے پہلو سے لگی بیٹھی رہے، وہ عورت ہی کیا جس کے حسن گفتار حسنِ رفتار، حسنِ صورت، زیب وزینت، خوش لباسی، گلے بازی، رقاصی، کے چرچے سوسائٹی میں عام نہ ہوں؟ اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں، اس کا نام زبانوں پر لذت کے ساتھ آئے. اس کا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کردے، اور اس کا تصور دلوں میں شوق! بہترین عورت وہ نہیں جو بہترین بیوی ہو یا بہترین ماں، بلکہ وہ ہے، جس کی ذات، دوست احباب کی خوش وقتیوں کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو. اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی ودل ربائی کے نقش ثبت ہوں، کلب کے در ودیوار پر، پارک کے سبزہ زار پر. ہوٹل کے کوچ اور صوفے پر۔

''ہمارے'' اور ''ان'' کے تخیل کے اس بعد المشرقین کو اقلیم لفظ ومعنٰی کا یہ تاجدار دو لفظوں میں جس جامعیت اور جس ندرت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے یہ اسی کا حصہ تھا ؎

حامدہ چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

''چمکی'' میں وہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ لوٹ جائے، یہ ''چمک'' مخصوص ہے ''نئی روشنی'' کی چمنیوں کے ساتھ. پرانے فانوسوں میں ڈیوٹ والے چراغوں میں چمک دمک بھلا کہاں! شرم وحیا سے آزادی، دنیا کی دل ستانی کے لئے ناز وانداز، قابلیت کے جوہر کی جلا، یہ سب کچھ اس ننھے سے لفظ ''چمکی'' سے ظاہر وآشکار. اور یہ ''شمع انجمن'' اور ''چراغِ خانہ'' کی مثال کس قدر روشن کیسی ضیا بار۔۔۔ تشبیہ کی تشبیہ اور پھبتی کی پھبتی! شعر کیا ہے بیسویں صدی کی ''کالج گرل'' کی قد آدم تصویر۔

(ص: ۸۶، ۸۷)

حسن و ناز کی دنیا میں قابلِ داد اب تک کم سخنی، کم گوئی و بے زبانی تھی۔ مشرقی شوہر "چاندی دلہن" بیاہ کر اس لئے لاتا تھا، کہ وہ اسے اپنے اندھیرے گھر کا چراغ بنائے۔ اور "تخیل" خانہ آبادی کا غالب رہتا۔ اب جو جا کر دیکھتے ہیں تو محفل کے طور ہی کچھ اور ہیں۔ نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ ٹھاٹھ بزم آرائی کے جمے ہوئے، حجاب کی جگہ بے حجابی، سکوت کی جگہ طوفانِ تکلم، مستوری کی جگہ نمائش، عاشق بے چارہ، اس کا یا پلٹ پر دنگ و حیراں، گم صم کل تک جو نقشِ تصویر تھا، وہ آج گراموفون نظر آ رہا تھا۔

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں اسٹیج کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھا مصرعہ، اپنی لطافت کے، جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب آپ! تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے کہ جو کچھ ہوا قدرتی نتیجہ ہے تغیر ماحول کا۔ جب فضا میں آسائش کی جگہ آرائش نے لے لی، راحت پر لذت مقدم ہوگئی، شوہروں کا مطمحِ نظر بجائے تسکینِ قلب کے ہیجانِ نفس قرار پا گیا، تو قدرتاً عورت نے بھی اپنی محبوبیت کے انداز بدل دیئے۔ مردوں کے دل میں جگہ پانے کے طریقے بھی اب دوسرے ہوگئے۔ اکبر کے اسی مرقع کا ایک منظر ؎

اعزاز بڑھ گیا ہے۔ آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں ہے لیزی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر
شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

"شوہر پرست بیوی" اور "پبلک پسند لیڈی" ان دو لفظوں کے کوزہ میں کیسا مشرق و مغرب کا سمندر سمو دیا ہے! مشرق کا منتہائے نظر تو خدمت تھا۔ زچہ خانہ تھا اور باورچی خانہ تھا۔ مغرب کے ہاں معیار ناچ ہے، بال روم ہے، کنسرٹ ہے، اور اب عورت بھی کیا کرے، نظامِ تعلیم ہی اس

ڈھنگ کا ہے شروع سے سکھایا یہی جاتا ہے، دل میں بٹھایا یہی جاتا ہے۔

(ص: ۸۷، ۸۸)

سنتے آئے ہیں، کہ ہر درد کی دَوا علم ہے، خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے، بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے، کہیں اور کبھی بے شک یہی ہوتا ہوگا! لیکن اپنے نصیب کو کیا کہہ کر روئیے کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے، ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے وہی تو امراض کا مورث ہے، مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کا منبع جسے شربت کا نام دیا گیا، وہی جام زہر نکلا، جسے رہبر کہہ کر پکارا گیا وہی رہزن ثابت ہوا۔ جس نظام کو ہم نے نام ''علم و تعلیم'' کا دے رکھا ہے، وہی تو عین جہل ہے۔ یہ تو عین وہی علم ہے جس کا مقصود دلوں میں حب دنیا اور پختہ وراسخ کرنا، خیالِ عقبیٰ و آخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں۔ نصاب تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسول کے اعتقاد سے ناآشنا۔ اس کا سائنس مادیات کے اوپر کچھ دیکھنے سے اندھا۔ اس کی حکمت میں جنت و دوزخ، حور و ملک کا وجود عنقاء، اس پڑھائی لکھائی کے نتیجے جو نکلتے تھے، نکل کر رہے۔ ان پر برہم ہونا اور ساتھ ہی اس نظام کی تائید کیے جانا، تو گویا یہ چاہنا ہے کہ آگ پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوت نہ ہو، پانی کا وجود ہو، لیکن وہ کسی شے کو تر نہ کر سکے۔ آفتاب نکل آئے لیکن کوئی شے اس سے منور نہ ہونے پائے! اکبر کی تشخیص میں یہی! نظام تعلیم تو ہے جس نے ابتری ہمارے اخلاق، میں معاشرت میں، مذہب میں پیدا کر رکھی ہے

اک علم تو ہے بت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اس علم کی سب دیتے ہیں سند، اس علم میں ماہر کون کرے
جب علم کی عاشق دنیا ہو ، پھر کون بتائے راہِ خدا !
جب خضر اقامت پر ہوں فدا، تائید مسافر کون کرے

(ص: ۹۸، ۹۹)

نظام کائنات میں اذیت وتکلیف کا وجود رکھا ہی اس غرض سے گیا ہے، کہ اس سے نفس میں شکستگی وتضرع پیدا ہو۔ دُھن بجائے ''اسباب'' کے مسبب الاسباب کی پیدا ہو، مخلوق اپنے ہم جنسوں سے بے آس ہوکر خلوص وخضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرلے۔ چنانچہ دنیا میں جو عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہی ہے۔ فطرتِ سلیم ایسے موقعوں پر راہِ ہدایت پاجاتی ہے لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جو الٹا اثر لیتی ہے، اس کی شقاوت قساوت کے لیے یہ تمام تازیانے بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشانِ غیبی، ہر جدید آیتِ الٰہی، ہر تنبیہِ فطرت غفلت وجمود، الحاد واعراض میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ جو تریاق ہونا چاہیے تھا وہ اس کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے۔ ہجوم مصائب میں بھی اسے تکیہ مادی اسباب پر، اور بھروسہ دنیوی وسائل پر رہتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کرتا رہتا ہے۔ ہر امیر ہر وزیر، ہر بڑا افسر امیدوں کا مرکز، حاجتوں کا قبلہ بنا رہتا ہے۔ اللہ سے بے تعلقی مصیبتوں کے ہجوم کے وقت بجائے گھٹنے کے کچھ اور بڑھ ہی جاتا ہے۔ اکبر اپنے گردوپیش یہ منظر دیکھ، اپنی زبان حقیقت ترجمان سے اس پر نوحہ خوانی کرتے ہیں لیکن خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ یارانِ مجلس کو دردوعبرت کے تذکروں سے واسطہ کیا۔ یہ تو اس کے نام ہی سے وحشت کرتے ہیں، بزم میں قدم اس شان سے رکھتے ہیں، کہ چہرہ پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوا ہے نشاط وزندہ دلی کا ساز ہمراہ ہے، لیکن منہ سے صدائیں دردوعبرت کی نکل رہی ہیں۔ اور زیرِ لب آواز فغاں ہی کے سروں میں آرہی ہے۔ بزم میں تماشائی زیادہ ہیں اہل نظر چند۔ تماشائی یہ سوانگ دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں اور اہل نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ ایک جھلک دیکھتے چلیے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسمان نکلیں
میاں مسجد سے نکلے حرم سے بیویاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

(کل: ۱۰۰)

خدا فراموش نظام معیشت اور خود پرست آئین معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ امن وعافیت کا نشان نہ رہا۔ انبساطِ قلب وسکونِ خاطر کے الفاظ بے معنیٰ رہ گئے، آئینِ ہمدردی کے بجائے فلسفہ ''تنازع'' للبقا اور ''کارزار'' حیات کا رائج ہو گیا۔ زندگی کی ضرورتیں گراں ہوئیں، بدکاریاں ارزاں ہوئیں، ہلاکتیں بڑھیں، عمریں گھٹیں، ہیجان میں بیشی، اطمنان میں کمی آئی، محبتیں مٹیں، خصوصیتیں اُبھریں خدا فراموشی کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے۔ ''تمدن وتہذیب'' کی اس زندگی سے عُقلیٰ جیسی سنورتی ہے اسے تو ''کل'' پر اٹھا رکھیے۔ آج کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیا برباد ہوئی جاتی ہے۔

گلشنِ مشرق کا باغبان اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے، اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکے۔ ہاں اپنے اوپر تو کسی حد تک اختیار اب بھی باقی ہے زبان پر مرثیہ ہے۔ لب پر آہ ہے۔ آستین آنکھوں پر ہے اسے ہٹا کر دیکھیے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، ممکن ہے مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی قیمت لگا سکے

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں
باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
سطح زمین سے پوچھو کیا مل رہا ہے اس کو
نظروں میں پھلجڑی ہے گو پھول جھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی
لیکن امید کیا ہو جب دل اُجڑ رہے ہیں

(ص: ۱۰۳)

''مشرق ومغرب'' کا جو فرق ہے وہ مشرق ومغرب کا فرق ہے بعد المشرقین ہے جزئیات میں نہیں، کلیات میں ہے فروع میں نہیں اصول میں ہے، عرض میں نہیں جبلت وسرشت میں ہے، وہ مادیت میں مست ہے، ہم روحانیت میں غرق۔ وہ تجارت وثروت کے گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ ہم

صبر وقناعت کے حجرہ میں فقر کی کملی لپیٹے ہوئے ہیں. وہ دنیا کے چپہ چپہ سے واقفیت کی دُھن میں ہیں ۔ ہمیں اپنے عرفانِ نفس کی کوششوں سے کہاں فرصت. وہ اس پر تلے ہوئے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں. وہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کر کے اچھل پڑتے ہیں، کہ ''انسان کی اصل بندر ہے'' ہم بدمستی وبیہوشی میں بھی نعرہ لگاتے ہیں تو یہ کہ ''انسان خدا میں گم ہے'' اکبر اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کر کے پیش کرتے ہیں۔

مشرقی کو ہے ذوقِ روحانی مغربی میں میل جسمانی!
کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست ''فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست''
(ص: ۱۰۴)

اکبر نرے واعظ نہ تھے. حکیم اخلاق بھی تھے. راہ راست کی جانب اشارہ کر کے خاموش ہو جانے والے نہ تھے. راستہ کی پیچیدگیوں راہ کی دقتوں سے بھی واقف تھے اس لئے مسافروں کو راہ کے پیچ وخم، منزل کی مشکلات کی بابت بھی ہدایتیں دیتے جاتے ہیں۔

اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ واقع ہوئے ہیں، حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ آنکھ بند کر کے رٹ ڈالے. جذبات کی کشش ایک سمت ہوتی ہے، عاقبت اندیشی کا فتوی دوسری جانب. اور پھر جذبات کے اندر بھی باہمی آویزش وکشمکش. اکبر کہیں کہیں ان گتھیوں کو بھی سلجھاتے گئے ہیں، جابجا ان کی حکیمانہ فکر وعارفانہ نظر یئے نے اخلاق ومعاشرت کے محض جزئیات کو نہیں، بلکہ فلسفۂ اخلاق کے اصول کو لیا ہے، اور بنیادی مسائل کو کھول کر رکھ دیا ہے.

شباب کی بدمستیاں وبے احتیاطیاں کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں. ساتھ ہی مذہب واخلاق کی عدالت کا فیصلہ بھی سب پر روشن ہے. اکبر کا کمال یہ ہے کہ کل چار مصرعوں کے اندر پہلے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، آپ ابھی اسی کو دیکھتے ہوتے ہیں کہ وہ مرض کی ایک ایک

علامت بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ اس کی داد ابھی دینے نہیں پاتے کہ چٹ پٹ وہ ایک نسخۂ شفا بھی تجویز کر ڈالتے ہیں مکمل تشخیص اور علاج کل چار مصرعوں میں ؎

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ بُرا، اور خوفِ خدا ہے اس کی دوا

(ص: ۱۰۵)

اُردو کا ایک بدنام شاعر

یا

گنہگار شریف زادی

لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ "جان عالم" کا لکھنؤ۔ زمانہ یہی انیسوی صدی عیسوی کے وسط کا آج سے کوئی ستر پچھتر سال قبل۔ ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ۔ ہر سر میں عشق کا سودا، دل ہر سینہ میں جوشِ تمنا۔ ہر شام میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم۔ یہاں رہس کا جلسہ، وہاں اندر سبھا کی پریوں کا پرا۔ ادھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں، ادھر گلے سے نکلی ہوئی تانیں اور ہاتھوں سے بجتی ہوئی تالیاں۔ گلی گلی "جنت نگاہ فردوس گوش" چپہ چپہ "دامان باغبان و کف گل فروش"۔ بڑے بڑے متین اور ثقہ گویوں اور سازندوں کی سنگیت میں اچھے اچھے مہذب اور مقطع بھانڈوں اور ڈھاریوں کی صحبت میں۔ سفید پوشوں کے دامن عبیر اور گلال کی پچکاریوں سے لالوں لال، جبے اور عمامے والے، پیشوازوں کی گردش پر نثار، غرض یہ کہ آج کی اصطلاح میں ہر طرف "آرٹ" اور "فائن آرٹ" کا دور دورہ، عشق کا چرچا، حسن کا شہرہ۔ اس فضا میں ایک حکیم صاحب تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں،

کوئی عالم دین نہیں، صوفی درویش نہیں، واعظ و مصلح نہیں چونچلوں کے آدمی، یار باش زندہ دل، رند مشرب، اہل بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لے کر بیٹھتے تو انگلیاں انھیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے کانوں میں رچے ہوئے تھے اور منہ سے بول نکلتے تو وہی، جن کے نقش دلوں میں جمے ہوئے تھے۔

غزلیں شاید زیادہ نہیں کہیں، کہیں ہوں گی بھی، تو اس وقت کسی کی زبان پر نہیں تھوڑا بہت جو کچھ کہا اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

کہنے میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے
پھرتے ہیں انھیں غیر ابھارے کئی دن سے
پھر شوقؔ سے کیا بت عیار سے بگڑی
ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے

حکیم صاحب کی حکمت و طبابت سے یہاں غرض نہیں۔ شاعری کی دنیا میں حکیم صاحب کا نام نواب مرزا اور تخلص شوقؔ۔ اور ان کے نام کو قائم رکھنے والی، ان کی غزلیں نہیں مثنویاں ہیں تذکروں میں ہے کہ خواجہ آتشؔ کے شاگرد تھے۔ ہوں گے، لیکن یہ یقیناً یا تو استاد کے بعد کی ہیں۔ یا ان کی زندگی میں ان سے چُرا چھپا کر کہی ہیں، ورنہ آتشؔ کی نظر پڑنے کے بعد عجب نہیں کہ نذرِ آتش ہو جاتیں، خواجہ آتش کی متانت کب اس کی روادار ہوتی کہ سعادت مند شاگرد آوارگی اور تماشہ بینی کی بولی ٹھولی میں وہ نام پیدا کر جائیں کہ تہذیب کی آنکھیں ان کا نام آتے ہی نیچی ہو جائیں، اور عریاں نگاری کے وہ شرارے چھوڑ جائیں کہ ان کی یاد کی چمک دمک قائم رہے بھی تو اسی روشنی میں!

بہر حال مثنویاں منسوب تو اس کی جانب کئی ایک ہیں، لیکن لذت عشق کی زبان قطعاً شوقؔ کی زبان نہیں۔ اور فریب عشق مشکل ہی سے ان کی تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ نومشقی کے زمانہ کی کوئی ابتدائی کوشش ہو۔ یقین کے ساتھ جن دو مثنویوں کو ان کی تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک کا نام بہارِ عشق ہے اور دوسری کا زہرِ عشق۔ اور ان دونوں میں شہرت زہرِ عشق ہی کے نصیب

میں آئی۔ دونوں میں نہ کوئی پلاٹ ہے اور نہ کوئی طلسم کشائی، نہ شاعر منبر پر بیٹھ کر اخلاق کا وعظ کہہ رہا ہے۔ نہ کالج کے لکچر روم میں تحلیل نفسیاتی کر رہا ہے۔ اسے محض اپنی ہوسنا کی کی کہانی سنانی ہے اور یہی وہ خوب مزہ لے لے کر سنا رہا ہے پھر چونکہ محض ''آپ بیتی'' ہی سنانی ہے۔ اس لیے ''جگ بیتی'' سنانے والوں کی طرح کسی دوسرے کو عاشق فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آتی ہے۔

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک روز لب بام ایک ماہ لقائی دکھائی دیتی ہے، اس کے سراپائے حسن و جمال کا عکس اس آئینہ میں ملاحظہ ہو:-

بام روشن ہے طور کی صورت	سر سے پا تک تھی نور کی صورت
حسن یوسف بھی جس کے آگے ماند	چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن !	گات جس طرح قمقمے روشن
ناک میں نیم کا فقط تنکا !	شوخی و چالاکی مقتضا سن کا
آستینوں کی وہ پھنسی کرتی	جسم میں وہ شباب کی پھرتی!
قد میں آثار سب قیامت کے	گوری گردن میں طوق منت کے
عکس رخ موتیوں کے دانوں میں	بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگ گل سی کمر مچکتی ہوئی	چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

یہ منظر دیکھتے ہی حکیم صاحب اپنی ساری حکمت بھول بھال سوجان سے عاشق ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر تک واپسی مشکل ہو جاتی ہے اور جب کسی طرح گرتے پڑتے پہنچتے ہیں تو اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جاتے ہیں غش پر غش آنے لگتے ہیں۔ زندگی سے یاس ہو جاتی ہے۔ ماں باپ بھائی، بہن، دوست، احباب سب گھبرا جاتے ہیں، اور طرح طرح کا دوا علاج کر کے جب اسے بے اثر پاتے ہیں تو رونے دھونے لگتے ہیں۔ ان مرحلوں کے بعد ایک روز ایک راز دار دوست آ کر حکیم صاحب کے دل کی نبض ٹٹول ان کے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، اور اس مقدس مشن پر روانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے گھائل کرنے والی ستمگر پری پیکر کے گھر کا پتہ لگائیں گے اور کسی دم دلاسے سے اسے گھیر گھار ان

سے لاملائیں گے۔ دربار پر پہنچ کر پہلے گھر کی مہری کو گانٹھتے ہیں۔

جیسی روح ویسے ہی فرشتے۔ اگر یہ عاشق صاحب تماش بینی میں شہرہ آفاق تھے، تو ان کے دوست صاحب بھی کٹنا پے میں طاق۔ زنانی ڈیوڑھی تک رسائی پیدا کر کرا، ان نام کی بیگم صاحبہ پر کچھ ایسا افسوں پڑھا۔ اور ''عاشق صادق'' پر حالتِ نزع کے طاری ہونے کا کچھ اس طرح کا سماباندھا، کہ آخر وہ ان کے بھرے میں آ گئیں، یہ بیگم صاحبہ بھی خیر سے کچھ ننھی نادان نہ تھیں، کھیلی کھائی ہوئی تھیں، لیکن پھر آخر ناقص العقل ایک شریف بدمعاش کی قسما قسمی اور خدا اور سول کے واسطوں پر یقین کر بیٹھیں، اور دربارِ حضرت عباس کی حاضری کا بہانہ بنا کر، گھر سے سوار ہو گئیں۔ کہاروں کو پہلے ہی سے پٹی پٹادی گئی تھی۔ سواری آ کر لب مرگ ''عاشق بیمار'' کے دروازہ پر رُکی۔ خدمت گار خبر دینے آتا ہے کہ ڈیوڑھی پر ایک سواری آئی ہے۔ سواری اترتی ہے۔ تخلیہ میں یکجائی ہوتی ہے۔ شہد پن کو گھل کر کھیلنے کا موقع ملتا ہے، شرم وحیا کے حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور بے حیائی و نفس پرستی کے پردے ہر طرف چھوڑ دیے جاتے ہیں، ایک طرف ہوسنا کی کی تمنائیں ہیں، دوسری طرف انکار کی ادائیں ہیں، منت وسماجت کی دھیمی آوازیں تو خلوت گاہ کی دیواروں کے اندر گونج کر رہ جاتی ہیں۔ البتہ ڈانٹ پھٹکار کی گرما گرم صدائیں پردہ کے باہر بھی صاف سنائی دے رہی ہے ۔

لوگ کہتے تھے ہے لبوں پر جان — مکر کے صدقے جھوٹ کے قرباں
کون کہتا ہے زہر کھایا ہے — یہ بھی اک شعبدہ بنایا ہے
توبہ کس درجہ بے حیائی ہے — واہ کیا دیدہ صفائی ہے
کیا کہوں اور بے حیا تجھکو — پھٹے منھ لعنت خدا تجھکو
میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس — جو ترے جل میں آ گئی افسوس

لیجیے اب تو آواز اور بلند ہو گئی، اور لہجہ میں غصہ کی تھرتھراہٹ اور صاف ہو گئی ۔

موذی، بدذات، بے حیا بے شرم — جانتا ہے کہ ہم ہیں گرما گرم!
میں اگر بولنے پہ آؤں گی — لاکھوں دھرے ترے اڑاؤں گی

گالیاں کیسی ،کوسنے دوں گی میں بھی اک اپنے نام کی ہوں گی
رحم کر نا ہے تجھ پہ نادانی ! وہاں ماروں جہاں نہ ہو پانی
تیری پیہ پہ بوٹیاں کاٹوں چیل کوؤں کو بیٹھ کے باٹوں

یہ جو شعر آپ نے سنے پھر بہت صاف اور سنجیدہ ہیں. باقی ایک بڑی تعداد نقل کے قابل کسی طرح بھی نہیں. جلوت کو کوئی آئینۂ خلوت آخر کس طرح بنادے. ظالم نے مصوری کی یہ خدا داد قابلیت کاش کسی شریفانہ نظم میں صرف کی ہوتی! شاعر جس ماحول میں تھا اس میں اخلاق کی پستی، جذبات کی فرومائگی ورکاکت، بے حیائی وعریاں نگاری کی کمی نہ تھی ،حمام میں سب ہی ننگے تھے. آخری دربار اودھ کے شعرائے باکمال اور سخن گویانِ شیریں مقال میں کون اس میدان کا مرد نہ تھا؟ باایں ہمہ ان کاملوں کی سرداری کا تاج شوق ہی کے سر پر رکھا گیا.

محاورات پر یہ عبور بیگمات کے روزمرہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحت، بیان کی یہ سلاست، جذبات نگاری کی یہ قوت، کیا ہر شاعر کے نصیب میں آتی ہے، ان تمام حیثیات سے، شوق کا کلام اردو کے کسی شاعر سے فروتر ہے؟ پھر آخر اس بے التفاتی کی وجہ؟ شوق کی کس پرسی کا سبب؟ وجہ ظاہر اور سبب واضح ہے مشرق، کم از کم اسلامی مشرق، اپنی جبلت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ قدر شرم وحیا کے جذبات کی کرے؟ عزت کی مسند پر جگہ شرافت کے لئے خالی کرے اور اپنا سر عصمت وعفت کی تصویروں کے آگے خم کردے. بے حیائی عریاں نگاری اور تحریری شہد پن کی عزت ووقعت اس کی سرشت کے مخالف ہے. جس طرح ہر فرد ایک مخصوص طبیعت اور خاص مزاج رکھتا ہے، ہر قوم کا بھی ایک خاص مزاج ہوتا ہے ، ہر تمدن کی بھی ایک مخصوص سرشت ہوتی ہے قومی زندگی کی جو کارروائیاں اس عام مزاج وسرشت سے الگ ہوتی ہیں، وہ کبھی قوم کے قوام میں نہیں داخل ہونے پاتیں قومی تمدن کا مستقل نظام انہیں اپنے میں جذب کرنے قبول کرنے اور جزو بنانے سے انکار کردیتا ہے اور نظام تمدن کا ایک بڑا مظہر ہر قوم کا شعروادب ہوتا ہے شوق کی کھلی عریاں نگاری، مشرق کے ذوق سلیم کے مخالف تھی ،بگڑی اور اجڑی ہوئی تہذیب اسلامی کے منافی تھی، اس لئے اسلامی

مشرق نے شوق کی ساری شاعرانہ خوبیوں کے باوجود ان کے لئے اپنی فہرست مشاہیر میں کوئی جگہ نہ رکھی۔اور نام کو بالکل ''گمنام'' ہونے سے بچا کر رکھا بھی تو ''بدنام'' کر کے زندہ رکھا۔

غرض تو اب مرزا کو اپنی پست مذاقی اور مبتذل نگاری کی سزا، مشرق کی معدلت گاہ سے ملی اور بجا طور پر ملی، لیکن وہ خود بھی آخر مشرقی ہی تھا، باوجود انتہائی بے حیائی کے یہ ناممکن ہوا کہ چوری کے جرم پر سینہ زوری کا بھی اضافہ کرے۔لارڈ بائرن اور آسکر اوائلڈ کی سی یہ جرأت و جسارت کہاں سے لاسکتا تھا، کہ گندہ نظم اور گندہ تر نثر شعر و ادب کا بہترین نمونہ کہہ کر پیش کرتا! غریب مشرقی کا تخیل بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا عمل میں کیسی ہی شرمناک کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوں، لیکن عقیدے میں فحش و بے حیائی کا جواز داخل نہ تھا۔اپنے شہد بَن کی کہانی سنانے کو تو سنا ڈالی، لیکن معاً خیال بھی سامنے آ گیا کہ خود تو خیر رسوا ہو چکے ایسا نہ ہو کہ داستان فسق دوسروں کے لیے سامان تباہ کاری بن جائے۔آخر مشرقی تھے، بات کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے خود اپنے انجام کا بھی خیال آ گیا۔اٹھے تھے شیطان پورہ کی دلالی کرنے، رخ خود بخود خانقاہ کی جانب پھر گیا۔

ذرا کان لگا کر تو سنیے یہ ایوان حسن و عشق میں داستان فسق بیان ہو رہی ہے یا کسی حلقۂ ذکر میں تسبیح و تہلیل ہو رہی ہے؟ ؎

اب سنیں صاحبان عقل و شعور ہے یہ دنیا تمام مکر اور زور!
شہد ظاہر میں زہر اندر ہے جس قدر اس سے بھاگے بہتر ہے
صاحب عقل کو نہیں ہے زیب کہ اٹھائے جہاں میں رہ کے فریب
سب یہ دنیا سرائے فانی ہے عشق معبودِ جاودانی ہے

ہائیں! یہ کیا سے کیا ہوگا! ابھی شرافت اور متانت کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے تھی، اور اب ہے کہ آنکھیں بچھا دینے کو تیار! کہاں ابھی گلفام و سبز پری کا سوانگ جما ہوا تھا، اور کہاں رومی و غزالی کا دفتر موعظت کھل گیا ؎

عشق اللہ کا جو مائل ہو ترک دنیا کرے تو حاصل ہو

کوئی الفت نہ بے وفا سے کرے عشق کرنا ہے خدا سے کرے

چار دن کی یہ زندگانی ہے جو ہے اس کے سوا وہ فانی ہے

یہ کس کا کلام ہے؟ کسی صوفیٔ خرقہ پوش کا؟ یا اسی حیا دشمن کا جو ابھی ابھی سیہ کاری کی داستان مزے لے لے کر سنا رہا تھا؟

اس بدنام مشرق کے مقابلہ میں مغرب کے نیک ناموں کے پاس کیا ہے! یہ ننگِ مشرق تھا، جو فخرِ مغرب ہیں سوال ان کی بابت ہے۔ یہ مشرقی تخیل کا اسفل سافلین تھا لیکن جو مغربی تخیل کا اعلیٰ علیین ہے اس کے صحن چمن میں گلگشت کے بعد، پند و موعظت، سلوک و معرفت، عبرت و اخلاق کے کتنے گلدستے تیار ہو سکتے ہیں! ذکر مستثنیات کا نہیں، عمومی اور اکثری حالات کا ہے۔

(ص:۱۱۵تا۱۲۴)

نواب مرزا کا شاہکار بہارِ عشق نہیں، زہرِ عشق ہے ان کے نام کو بُری بھلی جو کچھ شہرت حاصل ہے اسی زہرِ عشق کے طفیل میں ہے۔ یہ مثنوی بہارِ عشق سے چھوٹی ہے۔ کوئی پانچ سو شعر ہوں گے، بحر وہی، زبان وہی، طرز بیان وہی، لیکن درد و اثر کے اعتبار سے اس سے بڑھ چڑھ کر، بہارِ عشق کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوا تھا۔ زہرِ عشق کا انجام ہیروئن کی خودکشی اور عاشق کے اقدام خودکشی پر ہوتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ نظم، بہارِ عشق کے مقابلہ بہت مہذب اور سنجیدہ ہے۔ عریانی اگر اس میں ہے تو بس اتنی جتنی ہر عاشقانہ افسانہ میں ہوتی ہے۔ ہیروئن اس کی بھی کوئی عصمت مآب نہیں، لیکن دوسری طرف کوئی ''لکھا بیسوا'' بھی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریف گھرانے کی ایک الھڑ لڑکی، نوعمری کی نادانیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔ تاہم غیرت و عزت سے بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھی ہے۔

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ:-

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر وہیں رہتا تھا ایک سوداگر

اس کے ایک نوعمر حسین لڑکی تھی۔ ماں باپ کی آنکھ کا تارا، لکھی پڑھی نستعلیق ایک روز کوٹھے پر آئی، نواب مرزا سے آنکھیں دوچار ہو گئیں۔ یہ حضرت تو اپنا دل نذر کرنے کے لیے ہر وقت ہتھیلی پر

لیے پھرتے ہی تھے. کھٹ سے عاشق ہو گئے اور اپنے ماں باپ کے سامنے خوب خوب فیل لائے. اب کی عشق ایک طرفہ نہ تھا. ادھر بھی اثر ہو چکا تھا. ایک روز ماما، نامۂ عشق چپکے سے لا کر شوق کے ہاتھوں میں دے گئی. خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور خوشی سے پرنم آنکھوں سے کھول کر پڑھا ۔

ہو یہ تم کو بعد سلام غم فرقت سے دل ہے بے آرام
شکل دکھلا دے کبریا کے لیے بام پر آ ذرا خدا کے لیے

دل کی چوٹ بُری ہوتی ہے. لڑکی قسمت کی ماری عقل و ہوش سے اندھی ہو چکی ہے. پھر بھی شریف زادی ہے اس لیے قلم اس سے زیادہ بے حیائی پر نہیں اٹھ سکتا.

عاشق صاحب یہ پڑھ کر بھلا جامہ کہاں سما سکتے تھے. ایک جواب بحر طویل میں دھر گھسیٹا. جا و بیجا. مناسب و نامناسب، سب ہی کچھ زبان قلم نے اگل ڈالا. ادھر سودا گر زادی بھی برق دم نکلیں. انہیں کے جوڑ کی کھوٹے کھرے مال کی خوب پرکھ رکھتی تھی. پیام "شوق" پڑھ کر خوب لطف لیا اور ہنس کر بولی کہ واہ کیا خواب!

چند روز اسی طرح کی نوک جھونک جاری رہی. اس کے بعد ایک جمعرات کو وہی درگاہ کی زیارت کا چلتا ہوا فقرہ کام آیا. شامت کی ماری والدین کے گھر سے چلی آئی اور نواب مرزا کی ڈیوڑھی پر آ کر رُکی، آگے جو کچھ ہونا تھا ہوا، شرافت لُٹی، عزت ڈوبی. آمد و رفت کا سلسلہ اس کے بعد قائم ہو گیا، لیکن یہ چوری چھپے کی ملاقات کب تک راز رہ سکتی تھی. گھر والوں کو ٹوہ لگ گئی اور والدین نے اپنی رسوائی دفع کرنے کی یہ تجویز کی کہ لڑکی کو لکھنؤ سے دور شہر بنارس میں کسی عزیز کے پاس پہونچا دیا جائے. ادھر لڑکی کو بھی سن گن مل گئی. دل نے کہا کہ "ہائے کٹ جانے کی بات ہے. ماں باپ کو بھی آخر اس روسیاہی کی خبر ہو گئی. اب ان کا سامنا کیسے کیا جائے گا. اس زندگی سے تو موت بھلی! نوعمری کا زمانہ، دل دنیا کی تلخیوں سے نا آشنا، حوصلے زندہ ہو اور ولولے تازہ. سامنے دنیا اور اس کی بہاریں، ابھی لڑکی ہے کوئی پیر زال نہیں، کچھ بیمار دکھی بھی نہیں. بس بات اتنی ہے رگوں میں مشرقی شرافت کا خون گردش کر رہا ہے. دماغ میں خاندانی روایات کی یاد محفوظ ہے، دل میں غیرت و حمیت کی آن باقی ہے. جان

جیسی عزیز چیز سے ہاتھ دھونا گوارا، لیکن اس کی برداشت نہیں کہ سب عزیزوں قریبوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا ہوکر زندگی بسر کی جائے۔ بس یہ دل میں ٹھان آخری ملاقات کے لیے عاشق کے پاس آتی ہے۔ جان دینا تو عاشقوں کا کام سمجھا جاتا ہے۔ یاں جان دینے پر وہ آمدہ ہے جو خود اس قابل ہے کہ دوسرے اس کے اوپر اپنی جانیں فدا کر دیتے ہیں! ؎

تھی نہ فرصت سے جو اشکباری سے اتری روتی ہوئی سواری سے

حسرت نصیب آتی ہے اور کہتی ہے ؎

اقربا مرے ہو گئے آگاہ تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں جبر کیوں کر یہ اختیار کریں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش وحواس پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

لیجیے کہاں ابھی غفلت کے قہقہے بلند ہو رہے تھے اور کہاں عبرت کا درس شروع ہو گیا۔ دنیا اور اس کی ساری دلفریبیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی ہیں۔ اب سابقہ پڑنے کو ہے بندی کا اپنے مالک سے، کمزور کا زور والے سے، بے بس کا قدرت والے سے۔ غفلتیں دور ہو گئیں، مدہوشیاں کافور ہو چلیں۔ شمع جھلملانے لگی، چہرہ پر زردی چھانے لگی۔ اب نہ جوانی میں وہ لذت وسرور، نہ حسن ورعنائی میں پندار وغرور، اب ندامتیں اور اشکباریاں، عبرتیں اور آہ وزاریاں۔ موت کی آمد شاید ہر غافل کو اسی طرح جھنجھوڑ کر ہوشیار کر دیتی ہے ؎

جائے عبرت سرائے فانی ہے موردِ مرگ ناگہانی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں کلّ منْ علیھا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ، کل ہماری باری ہے

موت کے تصور سے اچھے اچھے دلیر اور رستم وقت لرز اٹھتے ہیں۔ یہ تو بیچاری ایک پردہ نشین لڑکی ہی تھی، کمسن ونادان، یہ وصیتیں کرتے وقت اس کے جسم نازک کے اندر قلب نازک کی کیا حالت ہوگی؟ آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ دل کا ہول بڑھتا جاتا ہے۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا

ہے۔کلیجہ میں سنکھے لگے ہوئے ہیں زبان لڑکھڑا رہی ہے۔الفاظ پورے پورے ادا نہیں ہو پاتے۔پھر بھی تقدیر پر صبر کر کے طبیعت کو سنبھالتی ہے آنسو پونچھتی جاتی ہے اور کہتی ہے ؎

ہم اگر جان دیدیں کھا کے سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم !
دل کو ہمجولیوں میں بہلا نا — یا میری قبر پر چلے آنا ! !
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم ! — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم !
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے — لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب وامیر — قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے قریب

گنہگار سودا گر زادی، اپنے گناہوں کا احساس رکھتی تھی خلق میں اپنی رسوائی سے شرماتی تھی، کوئی ماڈرن آرٹسٹ، کوئی فرنگی ''فلم اسٹار'' نہ تھی، کہ فخر اپنی بے حیائی پر اور ناز اپنی سیاہ کاری پر کرتی، گنہگار جتنا قسمت میں لکھا کر آئی تھی سو بن چکی لیکن گناہ کی اشاعت کی روادار کسی حال میں نہ تھی، دامن عصمت داغدار ہونا تھا ہو چکا پھر بھی عزت کے وزن سے واقف تھی، شرافت کی قدر و قیمت پہچانتی تھی۔

پردہ پوشی کے لیے کیسی کیسی منت وسماجت کرتی ہے ؎

آپ کاندھے نہ دیجیے گا مجھے — سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے — تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ذکر سن کر نہ میرا رو دینا — یوں نہ عزت مری ڈبو دینا

کہتے ہیں مرد کی خاطر عورت اپنے کو مٹا دیتی ہے فنا کر ڈالتی ہے۔کم سے کم ہندوستان کی عورت کا تو بیشک یہی حال ہے۔خود تو جان دے رہی ہے مگر یہ اب بھی گوارا نہیں کہ مرد کا رویاں میلا ہو۔تسلی وتشفی کا دھیان آخری سانس تک قائم ہے ؎

دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال — خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو — آج دل کھول کر گلے مل لو !

اپنی آنکھوں سے ندی نالے جاری کر رکھے ہیں۔لیکن چہرہ کی اداسی دیکھنا بھی گوارا نہیں۔

کر نہ رو رو کے اپنا حال زبوں ارے ظالم ابھی تو جیتی ہوں
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں یوں کہیں مردوے بھی روتے ہیں
تو سلامت جہاں میں رہ میری جان نکلیں ماں باپ کے ترے ارمان !
واسطے میرے اپنا نہ دل کڑھا چاند سی بنو گھر بیاہ کے لا !

حسن بے ثبات کی نیرنگیاں ختم ہو رہی ہیں، عشق فانی کی ساری لذتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں۔اور چل چلاؤ کے وقت نفس پر ہجوم کر رہی ہیں ۔

ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل اب تو جاتے ہیں اس جہان سے کل
دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کو کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے
باغ عالم سے نامراد چلے دل میں لے کر تمہاری یاد چلے
پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار کرلو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار

یہ آخری راز و نیاز کتنی دیر؟ یہ زندگی کی آخری اختلاط کی گھڑی، جھلملاتی ہوئی چراغ کی آخری بھڑک کب تک؟ مادی لذتیں ختم اور جسم کی مزیداریاں ایک ایک کر کے تمام ہو رہی ہیں، ناسوتی صحبتوں کا تار تار بکھرنے کو ہے، نفس کی ماری ہوئی لیکن غیرت دار، گناہ گار مگر گناہ کی اقراری، عزت لٹائے ہوئے لیکن بہر حال پاس عزت رکھنے والی، پردہ نشین کی آنکھوں سے پردے ہٹ رہے ہیں ''آج'' ختم ہو رہا ہے۔''کل'' شروع ہو رہا ہے، حسن و جوانی، نزاکت و رعنائی چہرہ کا رنگ و روغن سب کی نمود، مٹی ہی سے تھی اور سب مٹی ہی میں ملی جا رہی ہے۔رفاقت پر کوئی آمادہ نہیں۔ حاضری اس دربار میں درپیش ہے جہاں ایک ایک بدنظری کا پورا پورا حساب درج ہے۔سامنا اس مالک کا کرنا ہے جس نے خلاف قانون آنکھ اٹھانے پر بھی باز پرس رکھی ہیں۔روبکاری حاکم کی جس عدالت میں ہے۔اس سے بڑے بڑے متقی اور صالحین لرزتے رہتے ہیں۔یہ نازک جسم اور نازک تر قلب رکھنے والی، گناہ کے بوجھ سے لدی ہوئی، اپنی جان اپنے ہاتھ سے لینے والی لڑکی اس نازک

گھڑی میں کس کا سہارا پکڑے اور کس کی نگاہ کرم کی آس لگا ہوئے ،اے ہر مشکل کو آسان کرنے والے اس دکھیاری کی مشکل تو ہی آسان کر، تیری ہی ستاری کا دامن اس بے چاری کی پردہ پوشی کر سکتا ہے. تیرے ہی بحر مغفرت کا ایک قطرہ اس بدنصیب کے نامہ عمل کی سیاہیاں دھوڈالنے کے لیے کافی ہے. تیری یاد سے غفلت بے شبہ تھی. پر تیری حکومت سے سرکشی نہ تھی نفس کی لغزشیں یقیناً تھیں، پر تیرے احکام سے جان کر بغاوت نہ تھی .ایمان کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ڈھارس بندھاتی ہے، فاتحہ، قرآن خوانی اور دعائے خیر کی قدر ''آج'' مانگ، چوٹی کے جھمیلوں نے نہ کرنے دی. ''کل'' کے لیے سب سے قیمتی چیزیں یہی نظر آرہی ہیں ۔

اب تم اتنی دعا کرو مری جان کل کی مشکل خدا کرے آسان
میرے مرقد پہ روز آنا تم ! فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم
گو میں دنیا سے رو سیاہ چلی لیکن اپنی سی نباہ چلی !
جی کو تم پر فدا کیا میں نے حق وفا کا ادا کیا میں نے

کانپتے ہوئے جسم، زار وقطار آنکھوں ،لرزتی ہوئی زبان کے ساتھ دل کی بپتی بیان ہورہی تھی کہ رات تمام ہوجاتی ہے .اور کمسن کے ڈوبتے ہوئے دل کی طرح آسمان کے تارے بھی ایک ایک کر کے ڈوبنے لگتے ہیں، صبح کا گھڑیال بجتا ہے اور اس کے ساتھ ناسوتی کرشموں کے جنجال میں پھنسے ہوئے جوڑے کی آخری ملاقات بھی اس عالم آب وگل میں ختم ہوجاتی ہے کلمہ کی آواز سنی سنائی کان میں پڑی ہوئی تھی، وہی اس آڑے وقت پر کام آتی ہے ۔

بولی گھبرا کے رہیو اس کے گواہ اور کہا لا الہ الا اللہ
اب فقط ہے یہ خوں بہا تیرا بخش دیجیو کہا سنا میرا
سر سے لے کر بلائیں تا بقدم بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم

یہ کہا اور سوار ہوگئی. چند گھنٹوں کے بعد محلہ میں شور وشین برپا ہوا، جا کر دیکھا تو سوداگر کے گھر کہرام مچا ہوا ہے. گنہگار شریف زادی نے جو کہا تھا کر دکھایا. جوانی کی نیند مشہور ہے، لیکن یہ زہر

کھا کر وہ نیند سوئی تھی، جس میں قیامت سے قبل کوئی بیداری نہیں، یہ ہے ''آغاز'' کی بدمستیوں کا ''انجام''! پھولوں کی سیج پر رات بسر کرنے والی کو آخری چادر وہی کفن کی نصیب ہوئی. اتنی جلد! اس کمسنی میں! ایسی آناً فاناً!

جوان جہاں اولاد، نازوں کی پالی اکلوتی اولاد، کون انسانی سینہ ہے جو اس داغ کو برداشت کر سکے؟ لڑکی ماں کی آنکھ کا تارا، باپ کے کلیجہ کا ٹکڑا، اندھیرے گھر کا چراغ، سات بیٹوں سے بڑھ کر پیاری تھی. گھر بھر میں کیا معنی، محلہ بھر میں حشر برپا ہو گیا. بوڑھے والدین کی یہ حالت کہ کھڑے پچھاڑیں کھا کر گرتے تھے. اور بیان کچھ اس درد کے ساتھ کر رہے تھے کہ اپنے تو خیر اپنے تھے، راہ چلتے بیگانوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں. گھر کی بڑی بوڑھیاں جنھوں نے گودوں میں کھلا کر پالا تھا، نہالچوں پر تھپک کر سلا دیا تھا، ساتھ کی کھیلی ہوئی سہلیاں اور ہمجولیاں کوئی پردہ کے اندر، کوئی پردہ کے باہر دوپٹہ کا ہوش نہ چادر کی خبر، منہ پیٹنے میں مصروف. غسل و کفن کے بعد جنازہ مرتب ہو کر چلا ہے، تو اس سج دھج کے ساتھ کہ بن بیاہی نامراد کے تابوت پر دھوکا بیاہی ہوئی دلہن کے ڈولے کا! بے شک دلہن ہی تھی، آج کی رخصتی اس دیس کو ہو رہی تھی، جہاں سے پھر کوئی میکہ واپس نہیں آتا ۔

بھیڑ تابوت کے تھی ایسی سات جیسے آئے کسی دلہن کی برأت

خیر، اور تو جس پر جو بیت رہی تھی، تھی ہی اس مامتا کی ماری کا کیا حال تھا، جس کی ہری بھری گود ابھی خالی کرائی گئی تھی، عمر کی کمائی دم کے دم میں واپس لے لی گئی تھی، کلیجہ ابھی ابھی تیروں سے چھد چکا تھا، کس انسانی قلم میں قدرت ہے کہ اس کے داغ دل کا نقشہ صفحہ کاغذ پر کھینچ سکے، آہ! کہ جس کے دل میں بیٹی کی مانگ بھرنے کا ارمان ڈالا گیا تھا، اسی کے ہاتھوں اس لاڈلی کا کفن پہنایا جا رہا ہے، آہ، کہ جو آنکھیں بیٹی کا سہاگ دیکھنے کے انتظار میں نور حاصل کر رہی تھیں، انھیں کو اسے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفن ہوتے دکھا کر بے نور کیا جا رہا ہے۔

نواب مرزا! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت کہ تو نے کوکھ اجڑنے والی ماں کے جذبات کی تصویر بھی کاغذ پر اتار کر رکھدی ہے. ماں کے منہ سے یہ بول نکل رہے ہیں. یا دل و جگر کے ٹکڑے

کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں ۔

کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا گھر مرا آج بے چراغ ہوا
زہر دیدے کوئی تو کھا جاؤں یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں

مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا. تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی، تو نے موت کو یاد رکھا، تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی. تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا. شاید کسی کی رحمت بے حساب پر تکیہ کر کے. لیکن انہی غافلوں اور سرمستوں کو موت وانجام کی یاد دلا کر بھی خوب رُلایا، کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے عجب کیا کہ خدائے آمرزگار، اس عالم کا ستار اور اس عالم کا غفار تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو ومغفرت کے سایہ میں لے لے. اور تیرے کلام کے درد وعبرت، تیرے بیان کے سوز وگداز کا اجر بھی تجھے عطا کرے، اپنی ہی رحمت بے نہایت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم بے حساب کے حساب سے!

(ص:۱۲۵ تا ۱۳۵)

الفاظ کا جادو

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی ''سرا'' میں ٹھہرنا آپ کے لیے باعثِ توہین، لیکن کسی ''ہوٹل'' میں قیام کرنا ذرا بھی باعثِ شرم نہیں، حالانکہ دونوں میں کیا فرق؟ بجز اس کے کہ ''سرا'' مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے اور ''ہوٹل'' مغربی ہے، انگریزی ہے، ولایتی ہے. اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ''سرا'' کے فلاں ''بھٹیارے'' سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جائیں. لیکن فلاں ہوٹل کے مینیجر سے آپ کا بڑا ربط وضبط ہے اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں. حالانکہ سرا کے ''بھٹیارے'' اور ہوٹل کے ''مینیجر'' کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق ہے؟ کسی ''مدرسہ'' میں اگر آپ ''مدرس'' ہیں تو بات کچھ معمولی ہی

ہے،لیکن کسی ''کالج'' میں آپ ''لکچرار'' یا ''پروفیسر'' ہیں تو معزز ہیں.صاحبِ وجاہت ہیں، حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے ''مدرس'' اور ''پروفیسر'' ایک ہی چیز ہیں۔

ندوہ کے ''دارالاقامہ'' میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا،لیکن اسی ''دارالاقامہ'' کا نام آپ ''شبلی ہوسٹل'' سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ فخر دخوشی سے دمکنے لگتا ہے.کہیں چوری چھپے ''رہس'' یا ''نوٹنکی'' دیکھنے کھڑے ہوجایئے تو خود آپ کی ثقافت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے،لیکن تھیٹر میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجیے کہ ''ڈراما'' جیسے فن شریف کی شرافت وعظمت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے؟اپنے دیس کے کسی بھانڈ،کسی سازندہ کسی ڈھاڑی سے،اگر آپ کی شناسائی ہوگئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف ہم عصروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ ہی کر کرتے ہیں،لیکن ''چارلی چیپلن'' اور میری پکفرڈ'' کے کمالات اور ''آرٹ'' کی جتنی داد،جی چاہے دیجیے،بھری محفلوں میں، بزرگوں اور استادوں کے مجمع میں اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی جائے گی!

جوے یا جواریوں سے ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہوسکتا ہے کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے.اپنی جان اور اس کی جان ایک کردیں،لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں،دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں یہی ذلت ہمارے لیے عین عزت بن جاتی ہے اور بڑے بڑے رئیس اور معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے ہوئے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو ریس باز کہلاتے.

چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خریدیئے تو نظریں بچا بچا کر،لیکن حضرت گنج میں ویلریوا کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر کھڑا کر کے کیک وپیسٹری کی خریداری بہ نفس نفیس بلا جھجک فرمایئے،اس لیے کہ ''ویلریو'' حلوائی نہیں،کنفکشنر'' ہے،نظیر آباد کے کسی چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے منافی، لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی دوکان پر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق بستی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو آپ کی نظر میں محض ''بنیا'' ہے لیکن وہی بنیا اگر

وہیں کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بنکر کہلانے لگے تو دیکھیے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کسی رئیس کا ''مصاحب'' آپ کی نظر میں، اخلاقی حیثیت سے بے عملی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فراموشی کا مجسمہ ہے، لیکن صاحب کے ''پرائیوٹ سکریٹری'' اور ''اے، ڈی، سی'' کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں کارکردگی و مستعدی، رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! پنچایت کا نام آیا اور آپ کے ذہن میں نیچ قوموں کا تصور شروع کر دیا، لیکن اِدھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور کارپوریشن کے الفاظ بولے گئے اور آپ کی ذہن ان فرنگی پنچایتوں کی بلندیوں پر رشک کرنے لگا۔ کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے تو غبی ہے کودن ہے، کندہ ناتراش ہے۔ محض ملّا ٹا ہے۔ لیکن اگر کسی ایڈوکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور سپرم کورٹ کے نظائر ازبر ہیں تو ان کی قابلیت خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں۔

فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام آج مجال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے، لیکن لندن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات رومانی ناولوں کے نام سے جاسوسی افسانوں کے نام سے ''سنسنی خیز'' خبروں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ہفتہ، اور ہر روز اور ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کریں۔ ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و انہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا علم و روشن خیالی کی دلیل اور مہذب تعلیم یافتہ ہونے کی سند! ''جراح'' کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کس درجہ پست ہے، لیکن ''سرجن'' کا نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آ جاتی ہے محلّہ اور پڑوس کے ''حلاجے'' آپ کے خیال میں پست و ادنی، لیکن کپڑا بننے والے اگر ''لنکا شائر'' کے ہیں تو ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟

کوئی کہاں تک گنائے اور ناموں اور الفاظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونے کے یہ کافی بلکہ کافی سے کچھ زائد ہی ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجیے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشے میں، فرنگیت کا کتنا رعب ہم پر، اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت

ایک معنی ومفہوم متحد، لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے راستہ سے ''صاحب'' کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں ان میں ان کے دیسی مترادفات سے کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کر لی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہ کیا کہ ملک فتح کر لیے قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدانِ جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا، نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص اسی دورِ یاجوجی کے لیے اٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل ودماغ بھی فتح کر لیے جاتے ہیں اور ہاتھوں پیروں کے علاوہ عقلوں دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خطِ غلامی لکھالیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس، خیر وشر، حسن وقبح، ہنر وعیب کا معیار لے دے کے بس یہی رہ جاتا ہے کہ ''صاحب'' کی چشم التفات کدھر ہے؟ عزت بھی ''صاحب'' کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ، اور دنیا بھی وہیں کی بخشش، اب نہ ہندو ہندو ہے، نہ مسلمان مسلمان۔ سب رعایائے سرکار۔ اب نہ کوئی اللہ دین ہے نہ رام دین، بلکہ سب کے سب چھٹ چھٹا کر ''صاحب دین''۔

(ص: ۱۳۶ تا ۱۳۹)

جھوٹ میں سچ

قصہ ''گل بکاؤلی'' بھی کوئی کتاب میں کتاب ہے؟ عجب نہیں کہ ایک سنجیدہ مقالہ میں اس کا نام دیکھتے ہی بہت سے ہونٹوں پر حقارت کا تبسم آ جائے۔ لیکن کیا ہرج ہے، اگر کبھی کبھار خلاف وضع صحبتوں کا بھی تحمل کر لیا جائے۔ اور پھر دنیا میں یوں بھی تو ہوا ہے، کہ پھٹی پرانی گدڑیوں سے لعل وجواہر نکل آئے ہیں۔

کوئی بادشاہ کہیں کے زین الملوک نام ہیں۔ ان کے چار لڑکے پہلے سے موجود ہیں۔ پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اس پر نظر پڑتے ہی بادشاہ اندھا ہو جاتا ہے طبیبوں نے کہا کہ شفا صرف اس پھول کے لگانے سے ممکن ہے جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ چاروں نوجوان شہزادے اس کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں۔ اور سفر کرتے کرتے ایک مشہور بیسوا

کے دروازے پر پہنچتے ہیں. مکان کے اندر داخلہ کی فیس ایک لاکھ زرنقد ہے. دولت کے نشہ میں اندھے شاہزادے اس کے مکان پر پہنچ کر، اطلاع کے نقارے پر چوب لگاتے ہیں. کتاب کوئی اخلاق کا پند نامہ نہیں عشق و عاشقی کا افسانہ ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ مصنف بیسوا کے ذکر میں کھل کھیلتا، اور اس ''پری جمال'' کے حسن و شوق کی مصوری اس انداز سے کرتا کہ پڑھنے والے نوجوان کے دل میں شوق واشتیاق کی آگ بھڑک اٹھتی، لیکن برعکس اس کے دیکھیے تو سہی کہ اسی موقع پر نظر عبارت ذیل سے دوچار ہوتی ہے:-

''سنتے ہی اس مکارہ دوراں نے دل میں کہا کہ الحمدللہ مدت مدید
کے بعد ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا ارادہ کیا.
اغلب ہے کہ دام میں پھنسے، پھڑک پھڑک کر مرے. نقل مشہور ہے کہ یہ
طائفہ اسی تردد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے، سو خدا نے
ویسے ہی شخص بھیج دیئے''

انہیں پڑھنے کے بعد فرمایئے کہ شوق واشتیاق کی آگ کچھ بھڑکی یا جو تھی وہ بھی ٹھنڈی ہو کر خاکستر بن گئی؟ کتاب ''ترقیوں'' کے دور سے بہت قبل کی تصنیف ہے، مصنف تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کو تریاق کہہ کر پیش کرنے کے ''آرٹ'' سے ناواقف ہے. وہ بدی کے چہرہ پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا وہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے، تو ہانک پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے للہ! اس کے فریب میں نہ آجانا!

بیسوا ایک مخصوص چالاکی کے ساتھ شطرنج کا کھیل کھیل کر اپنے ہاں آنے والے امیر زادوں کو ہرا دیتی تھی، اور پھر ان کی جائیداد لے لوا، انہیں قید میں ڈال دیتی تھی. یہی ماجرا ان چاروں شہزادوں کو بھی پیش آیا. بالآخر پانچویں شہزادے تاج الملوک نے انہی چالبازیوں کے کرتب سے بیسوا کو بھی مات کر دیا. اس کی قید سے اپنے بھائیوں کو چھڑایا.

تاج الملوک جب آگے بڑھنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ''گل بکاؤلی'' قلعہ بکاؤلی

کے اندر ہے۔اور قلعہ کے پہرہ پر اٹھارہ ہزار دیو مقرر ہیں۔شہزادہ اس سے ہراساں اور بے آس نہیں ہوتا۔رفتہ رفتہ دیووں کو رام کرتا ہے،اور دیووں کی ایک بوڑھی سردارنی حمالہ کا دل اس حد تک اپنی مٹھی میں لیتا ہے کہ وہ اپنی پروردہ شہزادی محمودہ کا نکاح اس کے ساتھ کر دیتی ہے۔افسانہ نگار کا ذہن اس مجاز سے حقیقت کی جانب منتقل ہوتا ہے:-

''اے عزیز!روشنی چشم ظاہر بیں کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ کہ نور دیدۂ اولیاء ہے۔ستر ہزار پردے میں ہے۔اگر یہ ارادہ ہو کہ وہ پردے درمیان سے اٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہبان دیو نفس کا حجاب بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر،کہ وہ لعین اپنی کج روی کو چھوڑ کر محمودہ کے مقام میں پہنچا دے،لیکن یہ بات یاد رکھ اگر دیو سے الٹا کیجیے تو سیدھا پڑے''

بکاؤلی بیدار ہوتی ہے،اور اس عزیز وعزیز الوجود پھول کو اپنے باغ سے غائب پا کر،سخت پریشان اور ملول ہوتی ہے،پری خانہ کی کنیزیں اور خواصیں صدہا کی تعداد میں ہیں،سب کی تلاش وسعی بیکار ثابت ہوتی ہے،بالآخر بکاؤلی خود اس ''چور'' کی جستجو میں نکلتی ہے۔اپنے کو نوجوان مرد کی ہیئت میں تبدیل کرتی ہے،اور تلاش وجستجو میں طرح طرح کی تکلیفیں اور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے،افسانہ نگار اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور آئینِ افسانہ نگاری کو بھول بھال کر یوں درسِ معرفت شروع کر دیتا ہے:-

''سبحان اللہ! کیا الٹی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہوا،اور عاشق اس کا مطلوب،لیکن نظر تحقیق سے جو غور کرے تو سیدھی لگے،کیوں کہ جب تک معشوق کو خواہش عاشق کی نہ ہو،اس کی چاہت اکارت ہے اور کوشش بے فائدہ۔آتش طلب کی جو عاشق کے گریبان سے مشتعل ہے فی الحقیقت لگائی ہوئی معشوق کی ہے۔

عشق اول دردل معشوق پیدا می شود

گر نہ سوزد شمع، کے پروانہ شیدا می شود

شہزادہ تاج الملوک مہینوں بلکہ برسوں کی سختیاں اٹھا کر گل بکاؤلی لے کر آیا۔راہ میں چاروں بڑے بھائیوں نے اس سے چھین کر اس کارنامہ کو اپنی جانب منسوب کرلیا۔بادشاہ اس وقت تو چاروں سے بہت خوش ہوگیا۔کچھ مدت کے بعد تاج الملوک بھی پایہ تخت کے قریب پہونچا اور دیووں کی مدد سے اس کے مقابل ایک دوسرا شہر نہایت ہی پر رونق آباد کیا، اور پورے شاہانہ کروفر کے ساتھ وہاں حکومت شروع کی۔بادشاہ کو خبر پہنچی۔قاصد اور وزیر سلطنت کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔انھوں نے واپس ہوکر بہتر سے بہتر اطلاعیں پہنچائیں۔آخر بادشاہ خود ملنے آیا، اور پہچان کر کہ اپنا ہی لخت جگر ہے، بے حد مسرور ہوا، گلے سے لگایا، ہر طرح اعزاز واکرام سے سرفراز کیا اور وہ چاروں مقہور ومردود قرار پائے۔قصہ کے اس جھوٹ میں اب سچ کا پیوند ملاحظہ ہو:-

''اے عزیز! تیری عزت بادشاہ کے دربار میں تیری خدمت کے موافق ہوگی، چاہیے کہ شہزادہ کے مانند کارشائستہ کرے۔تو تیری محبت بادشاہ کے دل میں مؤثر ہو، اور پیغام اپنی ملاقات کا تجھے بھیجے، بلکہ بے کانہ آپ ہی تیرے پاس چلا آئے اور بے اختیار تیرا سر اپنی چھاتی سے لگائے۔اگرچہ پہلے دیدار کے لائق نہ ہو، لیکن آخر کار اسی مقام میں آپ کو پہنچائے کہ وہاں کوئی تیرا شریک نہ ہوسکے۔پھر ایسا کام نہ کیجیو کہ شہزادوں کے مانند داغِ لعنت اٹھائے اور کس وناکس کے روبرو رسوا ہو''

تاج الملوک اور بکاؤلی ایک دوسرے پر فریفتہ، اور باہم عقد کے خواہاں ہیں، لیکن کہاں پری اور کہاں آدم زاد۔بکاؤلی کی ماں بگڑی ہوئی ہے کہ خاکی کے ساتھ اپنی نورِ نظر کا پیوند کرکے پرستان بھر کی عزت کیسے ڈبودی جائے۔بکاؤلی کی ایک خالہ تاج الملک پر مہربان ہوجاتی ہے۔اس کی سفارشی بن کر اپنی بہن کے پاس جاتی ہے۔گفتگو یہی چھڑتی ہے اور اس وقت وہ پری رومی وغزالی کی بولی میں حقیقتِ انسانی پر، یوں ایک مقالہ سنا جاتی ہے:-

''سچ کہتی ہے، لطیف کو ہم صحبت کثیف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے، لیکن تو حضرت انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے ایسے خیال فاسد دل میں ہرگز نہ لاتی۔ بن اے نادان! بشر خلیفہ یزداں ہے اور اس کی صفت بے پایاں، مخلوقات میں اشرف اور افضل ہے، اس کے رتبوں اور درجوں کی انتہا نہیں''

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہوتی ہے۔ اور وہ اور اس کی سہلیاں خوب بن ٹھن کر اپنے کو اس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں بکاؤلی سمائی ہوئی تھی، وہ کسی کے بھی حسن و جمال، زیب و زینت سے متاثر نہ ہوا۔ شہزادی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپنے لگی، تاج الملوک پر یہ آتش باطن اثر کر گئی۔ تاج الملوک کی شادی اس شہزادی کے ساتھ ہوگئی لیکن دل اس کی جانب مطلق ملتفت نہ ہوا۔ دماغ میں ہر وقت وہی بکاؤلی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم بات کا رخ ضمناً یوں پھیر دیتا ہے:-

''اے عزیز! اب تک تیرے دل کی آنکھیں، اغیار کے حسن کو دیکھنے والی ہیں، تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی، ہر چند بے پردہ ہو پہلے خار رغبت اغیار کو دل کی سرزمین سے اکھاڑ کر پھینک دے، پھر گل رخسار یار کو آئینۂ دل میں دیکھ لے۔ اگر تو اپنے گلشن وجود کو بہ نظر تامل دیکھے تو اس میں رنگ و بو کے سوا کچھ نہ پاوے''

کتاب کوئی ضخیم نہیں، دیباچہ اور تصویریں ملا کر بھی حجم ۹۰، ۹۲ صفحے کا ہے۔ اتنی مختصر ضخامت کے اندر حکمت و معرفت، پند و موعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گزر چکے۔

جو کہانی ننگ مشرق تھی، اس کا جائزہ آپ لے چکے۔ جو افسانے ''فخر مغرب'' ہیں۔ وہ بھی ان کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گے؟ ہمارے ہاں کی جو سچی کتابیں، سچوں پر اتری ہوئی یا سچوں کی لکھی ہوئی ہیں انہیں چھوڑیئے ان کی سچی شرحوں کو بھی جانے دیجیے۔ جو کتابیں کھلم کھلا جھوٹی لکھی گئی ہیں، جنھوں نے اپنے جھوٹ کو چھپایا نہیں صاف اس کا اظہار کر دیا ہے؟ ان کے اندر بھی اتنی سچائیاں

اور گہری سچائیاں آپ نے دیکھ لیں؟ جس قوم کے جھوٹ میں اتنی سچائیاں ہوں. جس قوم کے جھوٹے بھی اتنے سچے ہوں. خدا کی شان ہے کہ اسے درس اخلاق وصداقت دینے وہ قوم آئی ہے، جس کی تہذیب وتمدن کا ہر سچ اندر سے جھوٹ ہی ہے۔

(ص:۱۳۱ تا ۱۳۹)

بہار کی بہار

مارچ ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت جلسہ دستار بندی کے موقع پر انگریزی ہائی اسکول کے ایک نویں درجہ کے طالب علم کو اس کے والدِ ماجد کے ہمراہ کھینچ کر لکھنؤ لائی، کانوں کو اشتیاق تھا، دو تقریروں کے سننے کا اور آنکھوں کو تمنا تھی دو چیزوں کی زیارت کی. اللہ نے دونوں شوق پورے کرائے. پہلی بار تقریر سننی نصیب ہوگئی مولانا شبلیؒ کی، اور زیارت ہوئی ان کے چہرے کی دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی، جس کے مضامین استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، الندوہ میں نکل رہے تھے. جلسہ گاہ میں پہونچ کر یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک جوان عمر، خوش لباس طالب علم ہے، چہرہ پر خوشنما چھوٹی سی داڑھی عینک، سر پر مدنی وضع کی مندیل. بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی. سب کی نظروں کا مرکز ومرجع ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا تھا. دستار بندی ہوئی.....اور ڈگریاں تقسیم ہوئیں، اور اس ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور پھر ایک فرمائشی عنوان پر برجستہ تقریر عربی میں بھی. آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنائیں، ہائے لڑکپن کی نیم معصومانہ مسرتوں کا نشہ اب کوئی کہاں سے لائے، جی بھر کر پوری ہوئیں. ۱۹۰۷ء کا اسکولی طالب علم وہی تھا، جو آج ان سطور کا راقم ہے، اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا، جو بحمد اللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے، اور جسے دنیا اب ''مولانا'' اور ''علامہ'' کے القاب کے اضافہ کے ساتھ سید سلیمان ندویؒ کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت وعظمت کا تخم پڑا، اور وہ دن ہے اور آج، کہ تخم نے جڑ پکڑی، پودا بنا، برگ وبار پیدا کئے، اور آج ایک درخت ہی نہیں، پورا باغ کا باغ تیار۔ ۳۳ برس کی

مدت کچھ تھوڑی ہوئی! قرن کا قرن گزر گیا. خدا جانے کتنی آندھیاں، کتنے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چمن لٹ کر رہے، لیکن بہار کی خوشگوار یاد کی بہار بھی قائم، بلکہ اس میں دم بدم اضافہ و ترقی۔

میں بے حد شرمیلا اور بدہمت. الندوہ کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری. ملنے کی جرأت اس وقت نہ ہوئی. کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا. غالباً آخر ۱۹۱۱ء تھا، اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر ملحدانہ تنقید کے سلسلہ میں ''نام'' حاصل کر چکا تھا. جب جا کر تعارف کی نوبت آئی. اور نیازمندی کے تعلقات رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیزداری سے جا ملے اور اب سید صاحب میں اور اپنے قریب کے عزیزوں میں گویا کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہوتا۔

سال اب خوب تو خیال میں نہیں ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء ہوگا کہ ایک بار حیدرآباد جانا ہوا. مولانا شروانی صدر الصدور امور مذہبی کے دولت کدہ پر کوئی علمی کمیٹی تھی نظر ایک نئے چہرے پر پڑی، اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو برابر پڑی ہی رہے ہٹنے نہ پائے. نرم اور روشن چہرہ پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم داڑھی پر پڑی، تو دل نے کہا کہ اس چہرہ کو دیکھتے ہی چلے جایئے. بتانے والے نے یہ بتایا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں. اللہ اللہ کیسا دھوکہ ہوا. نام سے عرصہ سے واقف تھا. ایک خیالی صورت بھی ذہن میں تھی. لیکن یہ صورت، سیرت ہر چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کتنا غلط نکلا. خیال تھا کہ مُسن ہوں گے، یہ تو جوان نکلے. قیاس تھا کہ بڑے بڑے مناظر ہوں گے اور خشکی و کرختگی کے پتلے. مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف جسم لطیف تر روح کو چھپائے ہوئے ہے! خندہ رو، نرم خو، نہ کرختگی نہ ثقالت برعکس اس کے ایک پیکر لیعت ولطافت قال کے موقع پر قال، حال کے محل پر حال. صورت پر نورانیت برستی ہوئی، گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی علم کی جگہ علم، عشق کی جگہ عشق، تعارف ہوا اور ملاقات کے پینگ بڑھے. اس اٹھارہ انیس سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا کیا کچھ سیکھا، ان سوالات کو بس سوال ہی بنا رہنے دیجیے. حیدرآباد کی ہمراہیاں، لکھنؤ کی یکجائیاں، دریابادکی سرفرازیاں، اور پھر عرشہ جہاز پر

ساتھ، مدینہ کے ''روضۂ جنت'' میں ساتھ، بیت اللہ کے طواف وزیارت میں ساتھ، منیٰ کی نمازوں میں ساتھ، ساری داستان کہیں پھیلنی شروع ہوگئی تو سمیٹنی مشکل ہوجائے گی مختصر یہ کہ دماغ اگر ایک بہاری سید زادہ کے علم وفضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری سید کی محبوبیت کی نذر ہوگیا. دماغ اگر ایک کی عظمت کا قائل تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل ''بہار کی بہار'' اب بھی روح پرور نہ ہو تو کیا ہو؟

(ص: ۱۵۰ تا ۱۵۵)

مرزا رسوا کے قصے

کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے

مرنے کے دن قریب ہیں شائد کے اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

جس نے موت کو دعوت ان الفاظ میں ۳۱، ۳۲ سال قبل دی تھی. اس کی شمع حیات واقعۂ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں گل ہوکر رہی. موت کو جب آنا ہوتا ہے جب ہی آکر رہتی ہے. شاعر کی طبیعت ممکن ہے حیات سے اسی وقت سیر ہوچکی ہو. لیکن خود حیات اس وقت شاعر سے سیر نہیں ہوئی تھی. موت تو جبھی آئی جب اُسے آنا تھا. اور جب آئی تو بہتوں نے یہ بھی نہ جانا، کہ کس نام کے رسوا اور شعر وادب کے رسیا کو اپنے ہمراہ لیتی گئی! سدا رہے نام اللہ کا. بقا نہ کسی شاعر کو ہے، نہ شاعری کو، نہ ادب کو، نہ ادیب کو، کیسے کیسے افسانہ گو اور افسانہ نویس آئے اور کیسی کیسی مزیدار کہانیاں سنانے بیٹھے، مگر، ہا دیکھتے ہی دیکھتے خود انھیں کی زندگی افسانہ بن گئی! باقی رہنے والا بس جو ہے، وہی ہے

ذاتِ معبود جاودانی ہے باقی جو کچھ ہے وہ فانی ہے

جو رونق محفل ہوتے ہیں وہ ایک ایک کرکے اٹھتے جاتے ہیں لیکن محفل کی رونق جوں کی توں! لسان العصر اکبر کے الفاظ میں ۔

دنیا یونہی ناشادیوں میں شاد رہے گی برباد کیے جائے گی، آباد رہے گی

ناول نویسی کی عمر اردو میں مرزا رسوا کی عمر سے بڑی ہے۔ سرشار اور شرر اور دوسرے حضرات اپنے اپنے رنگ میں اس چمن کاغذی کی آبیاری شروع کر چکے تھے کہنا چاہیے کہ انیسویں صدی عیسوی کے ساتویں اور آٹھویں دہے میں انگریزی ناول بھی اردو میں خاصی تعداد میں منتقل ہو چکے تھے جب کہیں جا کر مرزا محمد ہادی مرزا لکھنوی بی اے نے انیسویں صدی کے نویں دہے میں اس کوچہ میں قدم رکھا، آدمی پڑھے لکھے صاحبِ علم شریف خاندان تھے۔ شمار شہر کے متین وثقہ طبقہ اور اہل علم میں تھا۔ ناول نویسی کا مشغلہ اس وقت تک کچھ ایسا معزز نہ تھا، غرض کچھ وضع قدیم کا پاس، کچھ اپنے علمی وقار کا لحاظ، داستان سرائی کرنے بیٹھے تو چہرہ پر ''مرزا رسوا'' کا نقاب ڈال لیا، حالانکہ یہ نقاب تھا اتنا باریک کہ جو چاہے وہ ایک خط وخال ایک ایک بال باہر سے گن لے۔ اردو میں ناول بہتوں نے لکھے اچھے اچھوں نے لکھے۔ پر ان کا رنگ سب سے الگ۔ ان کا انداز سب سے جدا، نہ ان کے پلاٹ میں ''سنسنی خیزیاں'' نہ ان کی زبان میں ''غرابت زائیاں'' نہ ان کے اوراق میں ''برق پیمائیاں'' اور نہ ''کوہ تراشیاں'' نہ ان کے الفاظ ''ترنم ریز'' نہ اُن کی ترکیبیں ''ارتعاش انگیز'' نہ ان کی تصویر رزم میں ''برق پاشیاں'' نہ ان کی داستانِ بزم میں ''ابتسام آرائیاں'' پلاٹ وہی روزمرہ صبح وشام کے پیش آنے والے واقعات جو آپ ہم سب دیکھتے ہیں۔ زبان وہی گھر اور باہر کی ستھری اور نکھری بول چال جو ہم آپ سب بولتے ہیں..... کہتے ہیں صاحب کمال لاولد رہ جاتا ہے اس کی نسل آگے نہیں چلتی اپنے طرز کا موجد یہی ہوتا ہے اور خاتم بھی وہی۔ مرزا رسوا کا بھی کوئی خلف معنوی آج تک پیدا نہ ہوا۔

پیش رو اکثر اور معاصرین بیشتر تکلفات میں اُلجھ کر رہ گئے۔ رسوا تصنع سے پاک اور آورد سے بے نیاز، ابھی ہنسا رہے تھے، ابھی رُلانے لگے۔ مزاح وگداز، سوز وساز، شوخی ومتانت سبھی اپنے اپنے موقع سے موجود، لیکن آمد وبے ساختگی ہر حال میں رفیق۔ شگفتگی وروانی ہر گوشۂ بساط میں قلم شریک! جو منظر جہاں کہیں دکھایا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرصع ساز نے انگوٹھی پر نگ جڑ دیا ہے۔ ہر نقل

پر اصل کا گمان، ہر عرض میں جوہر کا نشان، تصویر پر صورت کا دھوکا الفاظ کے پردہ میں حقیقت کا جلوہ۔

ناول بہر حال ناول ہی ہوتے ہیں. اخلاق کے مسائل اور تصوف کے مقالات نہیں ہوتے. ناول میں بجز حسن و عشق کے مضامین اور ہجر و وصال کی داستانوں کے اور ہوتا کیا ہے؟ خیال ہوتا ہوگا کہ ان ناولوں میں نوجوانوں کو لبھانے اور نوعمروں کے جذبات نفسانی کے بھڑکانے کا سامان افراط سے موجود ہوگا لیکن توبہ کیجیے. فحش و عریانی الگ رہی، رکاکت و ابتذال بھی کہیں آنے نہیں پایا اور کہیں دو ایک جگہ جہاں صحیح مصوری اور سچی عکاسی کو اس کے سوا چارہ نہ تھا وہاں بھی انداز بیان زیادہ سے زیادہ لطیف اشارۃً و کنایۃً کا رکھا ہے. بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ راستے میں کوئی گندی نالی پڑ گئی ہے اور آپ ہیں کہ رومال ناک سے لگائے لپ جھپ لمبے لمبے ڈگ رکھتے اس سے گزرے چلے جا رہے ہیں تقریباً ہر افسانہ شریف گھرانوں میں بار پانے کے قابل. پڑھتے جایئے اور حیات بشری میں درک و بصیرت حاصل کرتے جایئے. آپ ادھر افسانہ کی لذت میں محو رہیں گے اور ادھر عبرت و ہدایت کے گھونٹ بلا تکلف حلق سے اترتے چلے جائیں گے. کونین کی گولی پر شکر اس طرح لپٹی ہے کہ بڑے سے بڑے ضدی بچے بھی اس کو دیکھ کر پھسل پڑیں اور مچل مچل کر اس کی طرف لپکیں. ناصح کی تلخ نوائیوں کا رونا سب روتے آئے ہیں. یہاں حضرت ناصح گھل مل کر اور رازدار بن جاتے ہیں اور چپکے چپکے سرگوشیوں میں سب کچھ کہہ سن ڈالتے ہیں ۔۔۔۔ کیا مولیٰ کی کریمی اور کارسازی ہے غالبؔ نے کہا تھا کہ ع

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

یہاں ''ہادی'' ''رسوا'' ہو کر بھی ہادی ہی بنا رہا!

قصے نثر میں ہوں یا نظم میں، ظرافت اور شوخی اگر ان کی جان نہیں تو ان کے عرض لازم سے کم بھی نہیں. بلکہ جو ناٹک اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں ان میں تو کامک، کا درجہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے اور عاشقانہ مثنویوں میں تو شوخی کے ڈانڈے عریانی اور فحاشی سے مل مل گئے ہیں. مرزا صاحب ظرافت پر آتے ہیں تو ہنساتے ہی نہیں ہنساتے ہنساتے لٹا دیتے ہیں. ایک بازاری منچلا طرار نامے

اسٹیج پر آتا ہے اور شرم وحیا کا جامہ اُتار، باپ کے سامنے اپنی آشنا خیلا کا نام لیتا ہے اور پھر والد ماجد سے فرمائش یہ ہوتی ہے کہ ان سے ملوا دیا جائے! زبان، لب ولہجہ، الفاظ سب کے ٹاٹھ وہی بازاریت اور لچپن کے میں کہتا ہے ۔

مجھے خیلا سے ملوا دے ابے باوا ابے باوا نہیں تو ہاتھ دھو مجھ سے ابے باوا ابے باوا
نہ بیٹا ہوں پھر تیرا نہ تو باوا ہے پھر میرا جو کی پہلوتہی تو نے ابے باوا ابے باوا

جیسی روح ویسے فرشتے. پدر بزرگوار آخران کے بھی باپ تھے. جناب خاں صاحب ایک پدرانہ دم خم کے ساتھ تن کر کھڑے ہوتے ہیں اور اگر پسر نتواند پدر تمام کند کے مصداق جواب اسی زبان میں دیتے ہیں ۔

یہ کیا انداز ہیں تیرے، ابے مردک ابے گرگے یہ کیسے سیکھے ہیں شیوا ابے مردک ابے گرگے
ابے باوا ابے باوا یہ کیا بکتا ہے تو مرغے ابے یہ گفتگو ہم سے ابے مردک ابے گرگے

سعادت اطوار بلند اقبال، اکڑ اکڑ کر اپنا فخریہ سناتے ہیں ۔

ہوا یاروں میں جب رہنا چُرا یاماں کا گہنا اڑائے خوب گلچھرے ابے باوا ابے باوا

خونخوار خاں اب پورے خونخوار بنے ہوئے دانت پیس کر گرجتے ہیں ۔

ابے بیٹا ہے تو کس کا غلط ہے یہ تیرا دعویٰ ہمارا نہ ہم تیرے ابے مردک ابے گرگے

اور مصرعہ تو یہ ارشاد ہوا ہے؟ ابے یہ گفتگو ہم سے ابے مردک ابے گرگے!

کسی چمن اور سبزہ زار کی سیر کرتے کرتے دفعۃً آپ کے قدم ایک گندی گلی میں آپڑیں تو آپ بے اختیار یہی چاہیں گے کہ کہیں جلدی سے اتنا راستہ ختم ہو اور آپ پھر کھلی ہوئی خوشبودار ہوا سے اپنے مشامِ جاں کو معطر کرنے لگیں. عجب نہیں کہ اس منظر سے بھی آپ کچھ اسی طرح بیزار ہوئے ہوں. لیکن یہ محض آپ کے قدیم مشرقی معیار کا اثر ہے جو ایسے منظر تکلیف دہ نظر آئے. اِس روئے زمین پر ایسے ایسے ملک بھی آباد ہیں. جہاں نہ باپ کا ادب کوئی چیز ہے نہ بزرگوں کا لحاظ بے باکی و بے تمیزی کا نام وہاں کی اصطلاح میں عین آزادی اور آزاد خیالی ہے. اور اب بیسویں صدی عیسوی

کا وسط طے کر لینے کے بعد خود آپ کا ملک ان منظروں سے نا آشنا کب رہا ہے؟

مرزا صاحب نرے شاعر یا افسانہ نویس نہ تھے. فلسفہ وحکمت کے بھی راز دار تھے اور یہ رنگ بھی اُن کا کہیں چھپتا نہیں ہے. مثنوی ہو یا غزل، ڈرامہ ہو یا افسانہ کہیں پھوٹ ہی آتا ہے. مجنون کی حیرانیاں دکھاتے دکھاتے دفعۃً یہ خیال آ گیا کہ مجنون تھا ہی جو بڑے بڑے ہوشیار اور فرزانۂ روزگار مانے گئے ہیں. انھوں نے بھی اس کارخانہ حیرت کے سمجھنے میں کیسے کیسے غوطے کھائے ہیں یہاں تک کہ بعض بعض تو ایسے بہکے کہ سرے سے صانع عالم ہی کے وجود سے انکار کر بیٹھے ان دانشمندوں کی تردید انھیں کی زبان اور اصطلاحات میں ملاحظہ ہو ؎

بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی — تجربہ ہم کو بتادے کہ بتاتا کیا ہے
مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا ! — پھر قیاس اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے
اس کا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن — پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے

مرقع کا خاتمہ لیلیٰ کی موت پر ہوتا ہے. وفاداری عاشق کی ضرب المثل ہے. لیکن یہاں محبوب بھی پیکر وفا ہے. نوجوان لیلیٰ ناشاد و نامراد دنیا سے رخصت ہو رہی ہے، باپ کا محل کا محل کھڑا ہوا ہے اسی محل کے ایک گوشہ میں یہ حسرت نصیب دم توڑ رہی ہے. دم واپسیں ہے اور اس وقت یہ بول نوعمر و ناشاد مرنے والی کی زبان سے نکل رہے ہیں.

لو کہے دیتے ہیں، قیس پہ دم دیتے تھے — اب کدھر بیٹھے ہیں رُسوا ہمیں کرنے والے
غسل میت مجھے دیتا ہے مرا دیدۂ تر — دیکھو اس طرح نکھرتے ہیں نکھرنے والے
اُجلا اُجلا وہ کفن اور پھولوں کی مہک — مر کے اس طرح نکھرتے ہیں نکھرنے والے

مجنوں دور سہی اس کا تصور تو پاس ہے اس خیالی پیکر سے جو وصیتیں ہو رہی ہیں. انھیں ذرا دل کڑا کر کے سُن لیجیے ؎

حشر کے دن تجھے اللہ سے لیں گے اے قیس — صبر کر صبر کہ یہ دن ہیں گزرنے والے

مصنف عشق مجازی کا قصہ لکھنے بیٹھا تھا اس کے ختم ہوتے ہی مصنف کو خود اپنے افسانہ

حیات کے انجام کا خیال آجاتا ہے اور آداب افسانہ نگاری بھول بھال بے اختیار ہوا ایک ٹھیٹھ مشرقی اور ایک سچے کلمہ گو کی شان سے نظم میں نہیں نثر میں ناظرین سے التجا کرنے لگتا ہے کہ ''اے ناظرین والاتمکین میں دعا کرتا ہوں اور تم آمین کہنا کہ جس طرح عشق مجازی میں مجنون کا انجام ہوا اسی طرح عشق حقیقی میں ہمارا تمہارا خاتمہ بالخیر ہو۔ آمین ثم آمین''۔۔۔۔''ترقی پسند'' بالکل معذور ہے اگر وہ ایسے ''مُلّانے'' کو ڈراما نویسوں میں ادنیٰ درجہ دینے سے بھی انکار کردے!

(ص : ۱۶۲، ۱۷۰)

اردو کا واعظ شاعر

آج سے کوئی ۲۵ سال ادھر کی بات ہے کہ الہلال افق کلکتہ سے نیا نیا طلوع ہوا تھا اور ملک کی فضا ابوالکلامی ادب وانشاء کے غلغلہ سے گونج رہی تھی، کہ ایک روز اس کے کسی مقالہ کے ذیل میں یہ شعر نظر سے گزرا

تعزیرِ جُرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوقِ عصیاں یاں سزا کے بعد

پڑھتے ہی طبیعت بے چین ہوگئی، لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا درج صرف شعر تھا شاعر کا نام نہ تھا۔ دل نے کہا اور اس کہنے میں تأمل وتذبذب کی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ شعر غالبؔ کا ہے، دیوانِ غالب میں پڑھنا یاد اگر نہیں پڑتا، نہ سہی۔ دیوان مطبوعہ میں اگر موجود نہیں نہ ہو، رہ گیا ہوگا لیکن ہے یقیناً غالب کا، اس مسلم استاد کے سوا اور کون ایسا کہہ سکتا ہے؟ غالب کا اتنا پختہ رنگ بجز خود غالب کے اور کہیں مل ہی کہاں سکتا ہے؟

حاضری اسی درمیان میں ایک روز مولانا شبلی کے ہاں ہوئی۔ ذکر اس شعر کا آیا، ارشاد ہوا کہ غالب کا نہیں حالیؔ کا ہے۔

ہائیں یہ کیا ارشاد ہوا؟ کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر؟ بے چارے ایک سیدھے سادے واعظ قسم کے آدمی، روکھے پھیکے اشعار کے ناظم، انھیں غزل اور پھر غزل کے کسی پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟ شعر کے سارے تیور اُستاد غالب کے، تخیل وہی، بندش وہی، زبان

وہی، حالؔی کے کلام میں نہ حُسنِ بیان، نہ لطفِ زبان، نہ یہ روح، نہ یہ جان، !نہ تخئیل میں رعنائی، نہ طرز وادا میں زیبائی !غرض دل نے کچھ جھنجھلا کر اور کچھ خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہی رہتی ہے، دیوان حالؔی اٹھا کر دیکھا تو غزلیات کی ردیف دال میں شعر اپنی جگہ پر موجود!

کون حالی؟ وہی جن کے تغزل وتشبیب کی کوئی وقعت دل میں تھی ہی نہیں، بس شروع سے یہ خیال جما ہوا تھا کہ غزل کی رنگینیوں اور رنگین بیانیوں سے انھیں واسطہ کیا، ایک خشک نظم نویس، کلام میں عاشقانہ مضامین کا قحط، بندشیں سست، خدا غریق رحمت کرے دور اول کے اودھ پنچ کو اور بھلا کرے اس کے نقادفن اور شہسوارِ سخن کا. یہ اسی کا فیض تھا کہ ایک عامی اور مبتدی طالب علم ہی کے نہیں خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں، پختہ کاروں، لائق فائق زبان دانوں کے دل میں بس یہی رچا ہوا تھا. اِدھر حالی کا نام آیا ادھر کلام کی بے نمکی، بے اثری، روکھے پن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی!

بات دل سے نکلتے ہی نکلتے نکلتی ہے، اس ایک شعر سے کیا ہوتا ہے. شعر کیسا ہی بامزہ سہی، بہر حال ہے تو ایک ہی۔۔۔۔اور دو ایک بامزہ شعر کس کے ہاں نہیں ملتے؟ مشق کرتے کرتے معمولی شاعر بھی دو چار شعر تو اچھے سے اچھے نکال ہی لاتا ہے۔۔۔۔اچھا تو آج کی صحبت میں یہی نہو، کہ ہم آپ مل کر دیوانِ حالی کے اوراق اُلٹ پلٹ، اِدھر اُدھر سے دیکھ ڈالیں، عجب نہیں کہ کچھ اور چیزیں بھی ہاتھ آجائیں.

ہم وقتِ وداع ان سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو رو تے بھی تو کیا ہو تا

وداع ورخصت کے بڑے بڑے رقت انگیز مضمون آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے. لیکن حسرت ویاس کی جو تصویر اس رونے میں نہیں، ہنسی میں دکھادی گئی ہے اس کا بھی کوئی جواب ہے؟ ناصح اور عاشق کی مڈبھیڑ دنیائے شاعری کی پُرانی حکایت ہے حالی بھی ایک بار ملتے ہیں۔

جو دل پہ گزرتی ہے، کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

ناصح کو بے درد، بے حس، سب نے مانا ہے یہاں عشق کو اپنی داستان درد کی دردانگیزی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کے خیال میں وہ ناصح کے دل پر اثر کیے بغیر رہ نہیں سکتی، پتھر آخر کیسے موم ہو کر نہ رہے گا کوئی فولاد اتنا گرم ہو بھی تو۔

شوخی اور طرازی، دو الگ الگ چیزیں ہیں. اور ظرافت کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں، کہ اس کے ڈانڈے عریانی وفحاشی سے مل مل جائیں. حالی شریف ہیں اور متین. اول بھی متین، آخر بھی متین، ذہانت، شوخی، ظرافت، طنز، موجود ان کے ہاں سب کچھ، لیکن متانت کی شان سب پر غالب گویا حضرت اکبر الہ آبادی کا پورا جواب. ایک کے ہاں تمام شوخی و رنگینی، دوسرے کے ہاں ایک ذرا سی اُداسی اور غمگینی! ایک کے ہاں قہقہوں اور تالیوں کا شور، دوسرے کے ہاں ادب لحاظ اور قاعدہ کا زور. ایک کی مجلس طرب افروز، دوسرے کی صحبت سبق آموز. ان کے میز پر شراب و کباب، ان کے دواخانہ میں بید مشک اور عرق گلاب.

زبان سے جو بول ادا ہوتا ہے نیچی نظروں شرمیلی نگاہوں کے ساتھ بلغزش مستانہ کے بجائے، ہر قدم سلامت روی کی تصویر، لیکن کلام میں حلاوت اس درجہ کہ پڑھتے جایئے اور دل ہی دل میں مزے لیتے ہوئے جایئے ۔

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

مطلع تو معمولی ہے لیکن آگے گلکاریاں ملاحظہ ہوں ۔

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچتے ہیں۔

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتا یا نہ جائے گا

ذرا ان بزرگ کی کم سخنی ملاحظہ ہو۔ کچھ نہ کہنے پر سب کہہ جاتے ہیں، رات کے نہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے، وعدہ تھا کس سے اور پورا جا کر کہاں ہوا۔ وہی ''کجا نماید کجا می زند'' کی پُرانی داستان، کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو کھل کھیلتا اور ''معاملہ'' کے پہچان جانے کی علامتیں خدا جانے کیا کیا بیان کر جاتا۔ ایک حالی کی متانت ہے کہ صراحت الگ رہی، کسی اشارہ کے بھی روادار نہیں، وہی نیچی نگاہیں اور زبان پر صرف اس قدر کہ ع

پوچھیں گے ہم سبب تو بتا یا نہ جائے گا

خاکساری کے مضامین آپ نے بارہا سُنیں ہوں گے، کیسی کیسی نازک خیالیاں اس میں صرف ہو چکیں ہیں۔ اور تعلّی تو ہمارے شاعر حضرات کی گویا جاگیر ہی ہے، اب ذرا دیکھیے کہ اُردو کا واعظ شاعر ان دونوں اضداد کو کس بلاغت سے جمع کرتا ہے اور ایک مختصر سے شعر کے اندر کس نادر اور اچھوتے انداز سے تعلّی سے خاکساری پیدا کر رہا ہے اور خاکساری سے تعلّی نکال رہا ہے ؎

ہم نے ہر ادنی کو اعلیٰ کر دیا خاکساری اپنی کام آئی بہت

اب بھی اس کلام سے وہی بدگمانی چلی جائے گی کہ خشک اور نرا واعظانہ ہے؟ خیال اب بھی یہی قائم رہے گا کہ حالی غزل گوئی میں ہیچ ہیں؟ غالبؔ اور مومنؔ اور شیفتہؔ آسمان شعر کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں۔ انھیں کے معیار پر کسیے، جانچ لیجیے، پرکھ لیجیے!

یہ سب کچھ ہے لیکن اس پر بھی حالی کا اصلی میدان غزل کا میدان نہیں، ان کی شاعری ''واہ'' کی نہیں ''آہ'' کی نہیں، جوش و ولولہ کی نہیں، حزن و حسرت کی ہے۔ نوعمری میں جو کچھ بھی رہے ہوں۔ لیکن عمر کی پختگی کے بعد تو گل و بلبل کے افسانے چھوڑ اور زلف و ابرو کے جنجال سے نکل، بس قوم کے ہو رہے تھے اور اب وہ تھے اور قوم کے اقبال کا ماتم۔ ساز کوئی سا بھی ہوتا، نغمہ یہی ایک نکلتا۔ کسی

بڑے سے بڑے زندہ دل ظریف کا جوان، چہیتا بیٹا، آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو، اس وقت باپ کے دل پر کیا گزر رہی ہے گی؟ منھ قہقہوں کے لیے کھلے گا یا آہ و بکا کے لیے؟ زبان پر حسرت و یاس کے کلمے ہوں گے یا کوئی نئی پھبتی سوجھے گی؟۔۔۔۔بس جو حال ہمارا آپ کا، ساری دنیا کا، بیٹوں بھائیوں کے لیے رہتا ہے۔ حالی کا وہی حال ساری امت اسلامیہ کے لیے، ساری ملت کے لیے، ساری قوم کے واسطے تھا۔ یہی حال ان آنکھوں نے بعد کو مشہور قومی لیڈر محمد علی جوہر کا دیکھا، فرق یہ تھا کہ محمد علی کے ہاں طبیعت میں غضب کی تیزی تھی۔ حالی کے ہاں آہ کی سرد بھی آئین وضابطہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ ایک کے ہاں تمامتر جوش اور شوریدگی، دوسرے کے ہاں ضبط و تحمل سے ملی ہوئی سنجیدگی۔ محمد علی جدھر سے گزرتے، ایک عالم تہہ و بالا کر دیتے، حالی دلوں میں اندر ہی اندر حزن وغم کی پھانس چبھو کر رہتے۔ محمد علی چیخیں مار مار کر خود روتے ہیں، اور دوسروں کو رُلاتے ہیں، حالی سر جھکائے اداس صورت بنائے چپکے چپکے بیٹھے کلمہ شریف کا ورد کر رہے ہیں ٹھنڈی سانسیں بھرتے جاتے ہیں اور جب آنکھیں بے اختیار نم ہونے لگتی ہیں تو چٹ رومال نکال آنسو پونچھ ڈالتے ہیں۔ طبیعت پر حسرت، اُداسی اور غمگینی مستقل غالب ہوگئی تھی۔ جو بات مُنہ سے نکلتی درد کی کسک سے خالی نہ ہوتی۔

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

''ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا'' ایک مصرعہ میں واعظ شاعری کی پوری آپ بیتی آ گئی۔

(ص:۱۹۷ تا ۲۰۷)

پریم چندر

بات میں بات نکلتی ہے اور شاخ سے شاخ۔ بڑے ناول تو کتابی صورت کے لیے مخصوص رہے۔ ان کے ولی عہد مختصر افسانے پیدا ہوئے اور وہ رسالوں اور ماہناموں میں نکلنے لگے۔ بازار میں ان کی مانگ بھی خوب رہی۔ اور ناول اور مختصر افسانے علم و ادب کی شاخ تو کسی ایک ہی آدھ کے لیے رہے۔ البتہ ایک پُر منفعت تجارت اور کامیاب کاروبار بہتوں کے لیے بن گیا۔۔۔۔لیکن ان سے سب سے

ہوتا کیا تھا؟ ناول ہو یا ''شارٹ اسٹوری'' عام ذہنوں کے سامنے ان کا مفہوم تھا کیا؟ وہی حسن وعشق کی پُرانی داستان وہی لیلیٰ ومجنون شیریں وفرہاد کی ہزار ہا مرتبہ کی دُہرائی ہوئی کہانی جو لاکھ پُرانی ہونے پر بھی اب تک پُرانی نہیں ہوئی ہے۔ ع

یہ وہ مضمون ہے کہ ہوگا نہ پُرانا ہرگز

بس یہی کہ فلاں کی آنکھ فلاں سے لڑ گئی۔ فلاں فلاں کے ساتھ نکل گئی۔ اس کی عصمت لُٹی اُس کی آبرو یوں بچی۔ کسی کے لب پر آہ وسوزاں، کسی کے جگر میں زخم پیکاں۔ یہ اس پر مفتوں۔ وہ اس کے لیے مجنون۔ ایک اپنی آرزوؤں اور تمناؤں میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا ناشاد ونامراد دنیا سے کوچ کر گیا۔ گویا ہر داستانِ حیات، داستان تل ودمن۔ اور ہر افسانۂ زندگی افسانہ شیریں وکوہکن! ناول کی دلکشی کا راز عشق وعاشقی کی گھاتوں میں، اور ناول نویس کے قلم کا اعجاز جوانی کی راتوں میں!

کہتے ہیں افسانہ نام ہے ایک ممکن زندگی کی حکایتی مصوری کا لیکن یہاں زندگی مترادف تھی صرف ہجر ووصال کے، صرف رُخ وخال کے۔ گویا انسانی زندگی اپنی ساری رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوجود کیا تھی؟ تھیٹر کے اسٹیج کی ایک آہ اور دنیائے عمل اپنی ساری وسعت وپنہائی کے باوجود کیا تھی؟ محفل مشاعرہ کی ایک واہ۔

یہ رنگ تھے اور کچھ ایسے ہی ڈھنگ، کہ ایک گوشہ سے چپکے سے پریم چندر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کی کایا پلٹ کر گئے۔ آئے دبے پاؤں خاموشی سے، آتے وقت نہ شور ہوا نہ ہنگامہ لیکن جب گئے تو یارانِ بزم کا انداز ہی کچھ سے کچھ تھا۔ جب تک رہے نہ کسی سے جھگڑے نہ کسی سے الجھے، شکل آپ دیکھتے تو سادہ، بات چیت کرتے تو سادہ تر پاتے۔ بس یہ معلوم ہوتا کہ شہر کے نہیں کسی قصبہ کے معمولی پڑھے لکھے آدمی ہیں اور زیادہ کرید، اگر آپ نہ کرتے تو یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ کس مذہب کے۔ رہے اب تک تو یوں رہے اور گئے تو ایک جدید اسلوب کی بنیاد رکھ کر، صاحب طرز ہو کر، یا ''صاحب'' کے محاورہ میں اپنا ایک مستقل ''اسکول'' چھوڑ کر۔

یہ نہیں کہ پریم چندر سے پہلے کسی کو عام ڈھرّے سے ہٹنے کا خیال ہی نہ آیا ہو مستثنیات

کس کلیہ میں نہیں ہوتے .اردو میں بھی بعض باکمال یقیناً ایسے گزر چکے تھے جن کا قلم ان بے اعتدالیوں اور عریانیوں سے بالکل بچ بچ کر چلا .اور جو زندگی کو زندگی سمجھے .شاعری کا مترادف نہیں سمجھے لیکن ان کی کوششیں اور کاوشیں بس انھیں کی ذات تک محدود رہیں .دریا میں پتھر آ کر گرا، چکّر بنا، تلاطم ہوا، لیکن آناً فاناً سب غائب اور ذری دیر میں سطح برابر۔۔۔۔دھارے کا رُخ پھیر نا وہ جتنا بھی سہی، پریم چندر ہی کے نصیب میں آیا۔

لوگ قصے کہانیوں کو محض لطف وتفریح کے لیے پڑھتے ہیں .لیکن اس لطف کے ساتھ ہی ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو، بدی کی مخفی راہوں کا علم، شیطنت کے خفیہ چالوں کا احساس، وطنیت کا صحیح جذبہ، اور ایثار، اخلاص، اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدِ نظر ہو تو ایسی شیریں خوشگوار کنیں پریم چندر ہی کے دواخانہ میں دستیاب ہوگی .اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کے آئندہ مؤرخ کو جس طرح گاندھی، نہرو، محمد علی، ابوالکلام کی تحریروں کی ایک ایک سطر کی چھان بین ناگزیر ہوگی .اسی طرح پریم چندر کے بھی افسانوں کو اُلٹ پلٹ کیے بغیر کام نہ چلے گا۔

(ص: ۲۲۱)

نیا آئینِ اکبری

آئینِ اکبری تو وہی ایک ہے سب کا جانا ہوا خوب پہچانا ہوا شہنشاہ اکبر کے انتظامی خط وخال کا آئینہ .اب اس میں کوئی جدت کیا پیدا کرے گا .پرانے کو نیا کوئی کیوں کر بنائے گا اور اطلس میں گزری گاڑھے کا پیوند کہاں سے لا کر لگائے گا؟۔۔۔۔لیکن اکبر اکیلے ایک شہنشاہ ہند ہی کا تو نام نہیں ہوا ہے اقلیم سخن کا بھی ایک تاجدار اسی نام کا گزرا ہے .صدیوں قبل نہیں ابھی حال میں .اور کہیں بہت دور نہیں آپ کے شہر سے نزدیک الٰہ آباد میں! وہ قدیم آئینِ اکبری تھا اقلیم ہند کے ایک فرماں روا کا کوکبۂ جلال .یہ آج کا جدید آئینِ اکبری ہے اقلیم معانی کے ایک تاجدار کا پرتوِ جمال! البتہ وہاں داستان گو تھا ایک نام کا ابوالفضل، اور یہاں عرض پرداز ہے ایک سراپا جہل!۔۔۔۔خیر نمائش کے عجائب زار میں ایک عجوبہ کا اضافہ اور سہی! ادبی کانفرنس میں ادیبوں اور شاعروں کے مجمع میں سخن

گویوں اور سخن فہموں کے جلسہ میں ایک کم سواد قصباتی کی جسارت اللہ اکبر! بس یوں سمجھیے کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں جہاں بازیاں بڑے بڑے شہسواروں کی لگ رہی ہوں وہیں ایک گوشہ میں ایک نعلبند بھی کیل کانٹے سے لیس، اپنا تھیلا لیے موجود!

ظرافت کلام اکبر کی سب سے بڑی نقیب بھی رہی ہے اور کمال اکبر کے حق میں سب سے گہری نقاب بھی۔ یہ بالکل صحیح کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا اور ان کی شہرت کو تالیوں نے چمکایا۔ لیکن یہ بھی اسی قدر صحیح کہ دنیا انھیں محض دل لگی باز سمجھ کر ان کے لطیفوں پر مٹی رہی ان کی شوخیوں پر ہنستی مسکراتی، ان کے چٹکلوں پر لوٹتی کھلکھلاتی رہ گئی، ادھر نظر کسی کی نہ گئی اور کسی ایک آدھ کی گئی تو وہ شمار میں نہیں، کہ جس ساز سے یہ نغمے نکل رہے ہیں وہ خود کتنے سوز میں ڈوبا ہوا ہے! یہ سب نے دیکھا کہ ایک پیر شکر کی لپٹی ہوئی گولیاں سب کو تقسیم کرتے جاتے ہیں اور کھانے والے ہیں کہ فرط لذت وحلاوت سے ہونٹ چاٹتے رہ جاتے ہیں، یہ کسی نے نہ پوچھا کہ گولیاں جراثیم کش کیسی زبردست ہیں اور ان میں تریاقیت کس غضب کی ہے! دستانے اگر نرم اور گداز مخمل کے ہیں تو کسے پڑی ہے، جو یہ ٹٹول ٹٹول کر دیکھے کہ اندر پنجہ گوشت پوست کا نہیں فولاد کا ہے!

صاحبِ مثنوی مولوی معنویؒ کے اس رمز سے تو سب ہی آگاہ ہیں کہ وہ ''سر دلبراں'' ''حدیثِ دیگراں'' میں ادا کرتے جاتے ہیں۔ حضرت اکبر نے بھی کچھ سوانگ اسی طرح کا بھرا۔ اور جو کچھ زمانہ کے کڑے تیوروں کے لحاظ سے کھل کر نہ کہہ سکے اُسے قہقہوں کے شور اور تالیوں کی گونج میں سُنا گئے اور عذر خواہی یہ کرتے گئے ؎

سرد موسم ہے، ہوائیں چل رہی ہیں برفبار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

فرمانے کو تو خدا جانے کیا کیا فرما گئے ہیں۔ مذہب اور روحانیت، اخلاق اور معاشرت، تعلیم اور سیاسیات کوئی گوشہ ان کے دائرۂ التفات سے باہر کب رہنے پایا ہے۔ اس ساری داستان کے دہرانے کی قوت کس میں؟ اور اگر کوئی ہمت کر بھی جائے تو سننے والوں کو اتنی فرصت کہاں؟ لیکن اکبر اپنا مخصوص پیام بھی لے کر آئے تھے، ہر پھر کر، الٹ پلٹ، منادی اسی کی کرتے رہے، کوئی سنے یا نہ

سُنے یا سُنے اور سنکر بھی نہ سمجھے بہر حال اپنا پیام انھوں نے سُنا سب کو دیا۔ اسی پیام کا نام اگر آئینِ اکبری رکھ دیا گیا تو کچھ بیجا ہوا؟

پیام کچھ دقیق و پیچیدہ نہیں۔ کوئی غامض فلسفہ نہیں، سیدھی سادھی بات صرف ایک لفظ میں ادا ہو سکتی ہے۔ پیام ''خودداری'' کا ہے۔ مشرق سے کہتے ہیں کہ مشرقی رہ، ہندی کو تعلیم دیتے ہیں کہ ہندی ہی بنا رہ، مسلمان کے لیے تلقین ہے کہ خبر اور اسلام سے نہ ہٹ۔۔۔۔ اس ایک ترانہ کو خدا جانے کتنے دلکش نغموں میں کتنے دلآویز سُروں میں بے شمار بار دہرایا ہے۔ نوآموز مشرقی کو دانش گاہ فرنگ میں داخل ہوتے ہی پہلا سبق جو ملتا ہے وہ بے حیائی اور بے ناموسی کا ہے جس کا نام ''استادوں'' کی اصطلاح میں ہے ''حریتِ نسواں'' ''صاحب'' اور ''میم صاحب'' کے کھلے خزانے میل جول کو پردۂ اختلاط کو دیکھ کر وہ کہنے لگتا ہے کہ ہماری زندگی بھی اب تک کوئی زندگی رہی ہے گھریلو زندگی بھی کوئی زندگی ہے وہی صبح سے شام تک ماں باپ کی اطاعت، بڑوں کی رضا جوئی، بھائی بہنوں سے میل جول، نماز اور قرآن، مسجد اور گھر کی انگنائی! زندگی نام ہے آرٹ کا، فنونِ لطیفہ کا، پکچر گیلری کا، ڈرامہ کا، سینما کا، اُپیر ہاؤس کا، ریڈیو کا، گانے کا، ناچنے کا، اپنی بیوی کو دوسرے کے پہلو میں بٹھانے کا، دوسروں کی بیویوں کے ساتھ خود رقص کرنے کا۔ اب پردہ اس کے نزدیک سب سے بڑی ''قید'' ہے اور سب سے پہلے اسی قید سے وہ اپنے اسیروں کو رہا کرتا ہے نتائج و عواقب کی تلاش اکبر کے کسی کلیات میں نہ کیجیے انھیں تو آپ روزمرہ اخبارات کے صفحات میں، عدالتوں کی کاروائیوں میں اور خود اپنے گرد و پیش براہ راست و بلا واسطہ مشاہدہ فرمالیں۔ اکبر ایک اسی قسم کے منظر سے متعلق صرف ایک سوال کر کے رہ جاتے ہیں ؎

کیا گزری جو ایک پردہ کے عدو رو رو کے پولیس سے کہتے تھے
بیوی بھی گئی ، عزت بھی گئی ، دولت بھی گئی ، زیور بھی گیا

اس بے نقابی اور بے حیائی کو عقل و فہم سے جس حد تک تعلق ہے، غیرت و حیا کے یہ جہاں

تک موافق ہے اکبر اس پر کوئی ناصحانہ خطبہ نہیں ارشاد فرماتے ،کوئی فلسفیانہ مقالہ نہیں سناتے ،ایک رباعی میں ایک چبھتا ہوا سا فقرہ خود انھیں بیویوں کی زبان سے کہہ جاتے ہیں فقرہ کو حسن قبول وہ عطا ہوتا ہے کہ اس ۵۰، ۶۰ سال کے اندر بیشمار زبانوں پر آچکا ہے، محفلوں کو گرما چکا ہے .بوڑھے تو بوڑھے بچوں میں بھی کم ایسے ہوں گے جو نہ سن چکے ہوں ۔

کل جو بے حجاب نظر آئیں چند بیبیاں! اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

سیلاب بے عصمتی کے مقابلہ میں ہمارے آپ کے بزرگوں ،مذہب واخلاق کے رہنماؤں نے جو سب سے زیادہ مضبوط بند باندھا تھا وہ خود عورت کی شرافت کا تھا۔اپنے ہاں کی شریف زادیوں کی ،اپنی بہو بیٹیوں کی حیا وغیرت کی ہم قسم کھایا کرتے تھے اور مگن تھے اس خیال میں کہ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے ان حیا کی پتلیوں کا آنچل بھی کوئی دیکھ سکتا ہے؟ اور اس محال کو ممکن فرض کرلیا جائے تو ان کے بھائی اور باپ اور بیٹے اور شوہر انھیں زندہ کیوں چھوڑنے لگے؟ یہ ہمارے مردانہ خون کی گرمی ہے کس دن کے لئے؟ آنکھ اگر بے جا اٹھی تو آنکھ ہی نہ پھوڑ کر رکھدی جائے گی؟ پیر اگر بے جا پڑا تو پیر ہی نہ کاٹ کر پھینک دیا جائے گا؟ لیکن صاحبانہ ''تہذیب'' کا لشکر جب حملہ آور ہوا تو پہلی گولہ باری ہمارے انھیں قلعوں اور بُرجوں پر ہوئی اور آن کی آن میں ''صاحب'' کے اقبال سے ہمارے یہ سارے دُھس اور دمدمے مسمار! اسکولوں اور کالجوں میں تو سبق ہی اس کا ملا، کہ اب تک جن نظاروں پر اپنا خون کھولاتے تھے ان پر فخر کرو، انھیں اپنے حق میں نعمت سمجھو نعمت .ناز کرو اپنی اس خوش بختی پر کہ بامِ ترقی کے زینہ پر قدم رکھنے کا شرف نصیب ہو گیا۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ا ن کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

(ص: ۲۳۱)

موت میں زندگی

''موت ایک دفعہ آنی اور جان ایک روز جانی ہے لیکن خوش نصیب ہے وہ عورت جو شوہر کی آنکھوں کے سامنے زندگی کو رخصت اور دنیا کو وداع کرے. میرا اصرار ماں کی محبت اور میری شفقت کا اظہار نہ تھا ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھے علم ہے، میرا عقیدہ ہے کہ سسرال کے پتھر میکے کے پھولوں سے، شوہر کی نفرت باپ کے پیار سے اور اپنے گھر کے چنے ماں کے گھر کے قورمہ سے ہزار درجہ افضل اور بہتر ہیں''۔(توشۂ زندگی ص:۴۰)

خط باپ کا ہے، بیاہی ہوئی بیٹی کے نام. شوہر صاحب دوسرا نکاح کر چکے ہیں، اور یہ بیٹی دل و دماغ کے سخت عذاب اور جسم کے شدید آزار میں مبتلا ہے، باپ کو بیٹی کی قسمت پھوٹ جانے کی اطلاع پہونچتی ہے اور لختِ جگر کے ساتھ اپنے دل کے ٹکڑوں کو خط کے خوان میں یوں لگا کر پیش کرتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ اردو افسانوں میں بجز بے حیائی کے رکیک جذبات کے اور رکھا کیا ہے، لیکن کہنے والے دیکھیں کہ اس کلیہ میں استثناء بھی کس پایہ کا ہے. جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ اردو میں افسانہ اگر اسی کا نام ہے تو کاش ہمارا سارا سرمایۂ ادب افسانہ ہی ہوتا!

خط ابھی ختم نہیں ہوا ہے آخری سطریں بھی پڑھ لیجیے:-

''بیٹی یاد رکھنا! عورت کی مصیبت اس کی شرافت کی کسوٹی ہے کوشش کرنا کہ باپ دادا کی آبرو میں فرق نہ آنے پائے. اس دنیا کو خیر باد کہو اور اب ادھر جی لگاؤ جہاں ہمیشہ رہنا اور سدا سہنا ہے. ساجدہ! منزل کڑی اور راستہ ٹیڑھا ہے خدا کا نام لو، بسم اللہ کرو اور اب اس منزل میں قدم رکھو'' (ص:۴۰)

بحث یہاں افسانہ کی زبان سے، پلاٹ سے، کردار نگاری سے، اس کے کسی فنی پہلو سے نہیں. ان سارے پہلوؤں کو چھوڑ دیئے. سوال یہاں صرف اس قدر ہے کہ اگر آپ صاحبِ اولاد ہیں اور اتفاق سے کسی لڑکی کے باپ بھی تو خود بتایئے کہ خود پر کیا گزر کر رہے گی؟ ''زندگی'' میں ''موت'' کا سماں کس نے اس طرح دکھایا ہے؟ افسانہ اور رومان کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر کس نے آخرت سے

اس طرح ڈرایا ہے؟

خیال نہ گزرے کہ کتاب کا موضوع ہی غم کی مصوری ہے۔ نوحۂ زندگی" نام ہی نوحہ وشیون کا ہے، اس لیے اگر اس میں موت کا ذکر بار بار آ گیا اور آخرت کے خوف سے سطر سطر میں ڈرایا گیا ہے، تو بات کچھ ایسی داد وفخر کی نہیں۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے زندگی کی ایک کامل سرگزشت اور مکمل روئداد چار جلدوں میں "صبحِ زندگی"، "شامِ زندگی" اور "شبِ زندگی" (دو حصے) کے نام سے لکھ ڈالی ہیں۔ اس میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے سارے دور، عورت کی زندگی کے آ گئے ہیں۔ خصوصاً "صبحِ زندگی" کے تو ہر ہر صفحہ سے زندگی ہی کی کرنیں طلوع ہو رہی ہیں اور بڑے سے لے کر چھوٹا شاید ہی کوئی مرحلہ نسوانی زندگی کا چھوٹنے پایا ہو، کہیں بچی کو لیے گود میں کھلا رہے ہیں اور کہیں انگلی پکڑ کر اسے ٹہلا رہے ہے۔ کہیں برسات میں جھولا جھلا رہے ہیں۔ کہیں اس کی توتلی زبان میں اس سے کہانی کہہ رہے ہیں۔ مکتب میں اسے حساب کے پہاڑے یاد کرا رہے ہیں۔ اور ابھی جانماز پر بیٹھے اسے مناجات برزبان یاد کرا رہے ہیں۔ کہیں انگنائی اور دالان میں جھاڑو دلا رہے ہیں۔ اور کہیں باورچی خانہ میں سالن بگھارنے اور حلوہ پکانے کی ترکیبیں بتا رہے ہیں۔ ابھی بنیوں سے مول تول، بازار کے سودا سلف کی گفتگو ہو رہی تھی، ابھی انگشتی پیچک لیے ہوئے سلائی، کترائی، کٹائی بخیہ کے بقچہ کھولے بیٹھے ہیں۔ غرض ہر طرف زندگی ہی زندگی کی بہار ہے۔ لیکن بہار کی اس گرمی میں بھی زندگی کی خزاں یاد، دیدۂ دل کے سامنے سے ہٹنے اور نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔

اُردو میں لکھنے والے، ناول اور افسانہ لکھنے والے بھی، ایک سے بڑھ کر ایک اب تک ہو چکے ہیں۔ کسی نے کردار نگاری کا حق ادا کیا۔ کسی نے لطف زبان کا سماں باندھ دیا کسی نے ہنسایا کسی نے ڈرایا۔ لیکن اگر دائرۂ انتخاب کو محدود کر کے سوال یہ کیا جائے کہ زندگی کی منظر نگاری میں موت کی مصوری کی عکاسی کس نے سب سے زیادہ کی؟ تو جواب کئی نہیں ہوں گے صرف ایک ہوگا زبانوں پر نام متعدد نہیں صرف ایک راشد الخیری کا آئے گا۔ موت کے کیسے کیسے نقشے اس عبرت نگار قلم نے زندگی

میں دکھادیئے؟ نہیں یہ وصف بھی غلط بیان ہوا۔ کہنا چاہیے کہ موت میں کس کس طرح زندگی پیدا کر دکھائی، اور جو موضوع تمام خشک و بے مزا سمجھا جاتا تھا اس میں کس درجہ لذت، درد و چاشنی غم کوٹ کوٹ کر بھر دی! روتے روتے سسکیاں بندھ جائیں اور نہ پھر کتاب چھوڑنے کو جی چاہے اور نہ ورق الٹے الٹا جائے اسے اگر بندہ کا اعجاز ارمولیٰ کا افضال نہیں تو اور کیا کہیے؟

لکھنے والے نے ہزار ہا صفحے لکھ ڈالے اور کوئی درد و عبرت کے منظروں کا استقصاء کرنے بیٹھے تو صدہا صفحات بھی اس کے لیے کافی نہ ہوں گے۔ اور یہ یہاں مقصود نہیں۔ اس وقت مقصود تو مصور غم کی مصوری پر ایک سرسری تبصرہ اور اس کا اجمالی تعارف تھا۔ موتیں آپ نے بہت سی دیکھی ہوں گی۔ صحبت برخاست ہونے سے قبل، آیئے ایک موت مصور غم کی معیت و رہبری میں بھی دیکھتے چلیں۔

نسیمہ ایک نیک دل بیوی ہیں۔ خالق کی فرماں برادر اور مخلوق کی خدمت گزار، صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی سب انھیں خاتون کی زندگی کی ''صبح'' و ''شام'' و ''شب'' کی ایک مسلسل داستان ہیں۔ ۵۵ برس کے سن میں ان کا وقت آخر ہو رہا ہے دیکھیے مسلمان کی موت بھی کیسی حیات بخش ہوتی ہے۔ مرنے والی نیک دل بیوی کو موت کا یقین ہو چکا ہے۔ سب عزیزوں، قریبوں کو پاس بلا کر بٹھاتی ہے اور زبان کہنا چاہیے کہ آخری باریوں گویا ہوئی ہے:-

''اماں جان کی فضیحتیاں میں نے سنیں، ابا جان کے حکم بارہا میں نے ٹالے، بہن بھائیوں پر شفقت مجھ سے نہ ہوئی۔ بڑوں کی طاعت میں نے نہ کی، آہ عمرِ گزشتہ! اس کٹھن رستہ میں جہاں ایک ایک قدم اٹھنا مصیبت ہے تو نے عتاب کا ایسا انبار سر پر رکھدیا کہ کسی طرح ہلکا نہیں ہوتا۔ اس وقت مامائیں مجھ سے ناخوش، لونڈیاں مجھ سے نالاں، نوکر مجھ سے پریشان۔ الٰہ العالمین! الاماں الاماں! اس وقت نسیمہ کی ہچکی بندھی ہوئی تھی اور بیویوں میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جو نہ رو رہی ہو کچھ ضبط کیا اور پھر سلسلہ شروع کیا کل کی بات ہے کہ پھوپھی جان نے مجھ کو پالکی میں سوار کرایا اس وقت بیسیوں عورتیں سفید بالوں والی مجھے رخصت کرنے میں شریک تھیں۔ آج وہ سب قبروں میں جا سوئیں اور میرا سارا سر سفید ہو گیا۔ یہ انقلاب قدم قدم پر مجھے موت کا سبق دے رہے تھے۔ لیکن غفلت کی

انتہاء بے خبری کی حد کہ کبھی بھولے سے بھی موت کا خیال نہ آیا. پندرہ برس کی بیاہی آئی چالیس برس اس محلہ میں رہ چلی، مگر ایک کو بھی پوری طرح خوش نہ کر سکی، اماں جان اللہ غریقِ جنت کرے کون کہہ سکتا ہے کہ مجھ سے خوش گئیں یا رنجیدہ، رابعہ، ہاجرہ دونوں نندیں میرے سپرد تھیں. مگر ان کا حق خدمت کچھ بھی ادا نہ ہوا. بے موقعہ جھڑکا، بلاوجہ ڈانٹا، بے سبب خفا ہوئی. خواہ مخواہ بگڑی. اب دیکھتی ہوں تو اس غصہ میں اصلاح کا خیال کم اور نفسیات زیادہ تھی. مگر مجھے ان بچیوں کی سعادت مندی سے امید ہے کہ یہ مردہ بھاوج پر عذاب نہ ہونے دیں گی اور عنداللہ میری غلطیوں کو معاف کر دیں گی۔"

نندیں یہ سنتے ہی چیخیں مار کر بھاوج کے قدموں میں گر پڑیں اور کہا خدارا بھابی جان! یہ نہ فرمایئے آپ نے ہماری ماں کو ہمارے دل سے بھلا دیا. آپ نے ہم کو انسان بنایا، اور ہم آپ ہی کی بدولت دنیا میں رہنے کے قابل ہوئے. دونوں نندوں کو نسیمہ نے گلے لگا لیا. اور پھر کہنا شروع کیا. کنبہ کی ایک دو نہیں بیسیوں اللہ کی بندیاں میرے رحم کی مستحق تھی، محلہ کی بہت سی مخلوق بھوکی سوئی اور میں نے پیٹ بھرے. مسافر میرے دَر سے خالی گئے. یتیم میری چوکھٹ سے ناکام پھرے. رانڈوں نے اس بند ہونے والی زبان سے جھڑکیاں سُنیں. بوڑھیوں نے میرے طعنے سہے، نوکروں نے میرے غصے اٹھائے. ہائے اللہ گناہوں کی گٹھڑی اتنی بڑی! رحم آ قارحم!! ایک متفقہ آواز نکلی،

"اے بیگم! تیرے روئیں روئیں میں خدا جان دے ہم کو بے کس نہ چھوڑ. یتیموں کا باپ تو رانڈوں کی وارث تو، اپاہجوں کا سہارا تو، مفلسوں کا گزارا تو۔"

نسیمہ اس کے بعد کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر تکان زیادہ ہوئی. بخار شدت سے چڑھا اور بولنے کی ہمت نہ رہی. بیویوں نے اس کی بلائیں لیں. بچوں نے اس کو دعائیں دیں. شام قریب تھی بیویاں روتی دھوتی اپنے گھروں کو سوار ہوئیں دوسرے دن رات کے ۹ بجے بخار کچھ ہلکا ہوا تو نسیمہ نے نسیم کو اپنے پاس بلایا اور کہا:-

خوش نصیب ہوں میں بیوی کہ تمہارے ہاتھوں پیوند زمین ہو رہی ہوں، جس چہرہ سے گھونگھٹ اٹھایا تھا اس کو اپنے ہاتھ سے خاک میں چھپا دینا. سیاہ بال تمہارے گھر میں سفید ہوئے، اور

جوانی تمہارے سامنے بڑھاپے سے بدل گئی ہم آقا تھے میں کنیز تھی تمہارا رتبہ زیادہ اور حق بڑا تھا مگر ہزاروں مرتبہ بگڑی ہوں اور بُرا بھلا کہا ہے آج اپنے بچوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں اپنی عنایت سے اس کو معاف کر دینا تا کہ خدا کے حضور میں تمہاری گنہگار نہ ہوں، نسیم بیوی کی زبان سے اتنا سُنتے ہی بیتاب ہوا .روتا ہوا اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے اور کہا تم جیسی بیوی دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈے تو نہ ملے گی .تم نے وہ کیا کہ میرا دل تم کو دعائیں دے رہا ہے .تم نے مجھ کو پچاس روپیہ کی نوکری سے صدر الصدور بنایا .اور جس گھر میں کُتے لوٹتے تھے تمہارے دم سے آج گلزار بنا ہوا ہے .میرا منہ نہیں کہ تمہارا شکریہ ادا کر سکوں . ہاں میں تم سے نادم ہوں .اور اس خیال سے جو شروع میں میں نے کیا میری روح کانپ رہی ہے .نسیمہ بیگم! اپنے بچوں کا صدقہ ! مرے ہوئے وسیم کا صدقہ اب مجھے معاف کر دو'' نسیمہ نے شوہر کا ہاتھ اپنے سر پر رکھا، اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا خدائے برحق تم کو معاف کرے میں پہلے معاف کر چکی ہوں .اب پھر کہتی ہوں میں نے معاف کیا اب میں تم سے اس قدر اور کہتی ہوں اگر میرے بعد ضرورت تم کو دوسرے نکاح پر مجبور کرے تو بیشک کر لینا میں منع نہیں کرتی ،لیکن دو معصوم بچیاں تمہاری محتاج چھوڑتی ہوں لڑکے سیانے ہیں اور کماتے ہیں مگر یہ بھولی چڑیاں سوتیلی ماں کے قبضہ میں نہ جائیں .تسنیم ان کی پرورش کرلے گی . ماں کا پکھوا چھوٹنے کے بعد تسنیم سے بہتر رفیق ان کا کون ہوگا وہ دشمنی میں ان کی دوست اور بدخواہی میں ان کی بہترین خیر خواہ ہوگی .تمہاری تنخواہ میں سے جو کچھ بچ کر آج تک جمع ہوا ہے وہ یہ دس ہزار کے نوٹ ہیں جوان دونوں کی شادی کے واسطے محفوظ تھے اور اب تمہارے سپرد کرتی ہوں . بچے ہوشیار ہیں مگر میرے بعد دیوار سے سر پھوڑیں گے ان کو کلیجہ سے لگا کر رکھنا اگر میدان حشر میں ملاقات ہوتی ہے تو تم سے اپنے بچوں کے دُکھ کا مواخذہ ضرور کروں گی'' .(شام زندگی ص ۱۳۹-۱۴۳)

نسیمہ کے جسم و روح پر جو کچھ گزری اس کا اصل حال تو اللہ جانے یا اس کے فرشتے ،باقی شاعر کی طرح افسانہ نگار کو بھی کبھی کبھی الہام ہوتا رہتا ہے .اور عجب نہیں کہ ایک مومنہ کی وفات کی منظر نگاری کے وقت مومن راشد پر بھی الہامی لمحوں کی بارش ہو رہی ہو۔

''نسیمہ پر جس وقت مرض الموت کی بے ہوشی طاری ہوئی اور دماغ نے یادِ وسیم کے سوا تمام تعلقات کو خیر باد کہا اور خیال کی تمام قوت اسی لال کی طرف ڈھل گئی جس کی تصویر کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے آٹھوں پہر دن اور رات آنکھوں کے سامنے رہتی تھی تو کانوں نے شوہر کے آخری، الفاظ سنے اور زبان نے یہ جواب دے کر کہ ''میرے لال کی روح میرے استقبال کو آئی'' بیس اکیس سال کے واسطے کو جو بالآخر فنا ہونے والا تھا ختم کر دیا۔ بچے جو ماں کے نام کے عاشق تھے معذور کھڑے اس کا دم واپسیں اور شوہر جو بیوی کی صورت کا پروانہ تھا مجبور بیٹھا اس کی مفارقت ابدی دیکھ رہا تھا۔ گھر کا کونہ کونہ اور زندگی کا ذرہ ذرہ با آواز صدا دے رہا تھا کہ کنوار پنے کی آزمائش اور سسرال کے امتحان کا نتیجہ آج برآمد ہوتا ہے۔ روح نکلتے ہی دیکھتی کیا ہے کہ دونوں کلیجے کے ٹکڑے نسیم اور وسیم جن کے کھڑوں کو آنکھیں ترس گئی تھیں اور جو سفید کفن میں لپٹے لپٹائے ماں کی آنکھوں سے رخصت ہوئے جھلا جھلی کپڑے پہنے ہشاش بشاش گردن جھکائے کھڑے ہیں۔ اس وقت ان کا نظر آنا موت کی پہلی کامیابی تھی، ٹھٹکی اور گم صم کھڑی ہوگئی کہ ملک الموت نے کہا۔

خالق کے احکام سچے دل سے بجالانے والی مخلوق! تیرے لال موجود ہیں۔ بیتاب ہوکر آگے بڑھی نسیم دوڑ کر ماں کے قدموں میں لپٹا اور وسیم نے اپنی گردن ماں کے سینے سے لگادی دونوں کو کلیجہ سے لگالیا اور سجدہ میں گر پڑی۔ اب فرشتۂ موت آسمان کی طرف اُڑا۔ نسیمہ قدم قدم پر خدا کی رضامندی کے آثار پا رہی تھی۔ اب وہ وقت آیا کہ نسیمہ بیگم کی پاک روح خالق الموجودات کے حضور میں حاضر ہو لطیف روح غسل کی محتاج نہ تھی ایک حور سامنے آئی اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور رضائے الٰہی کا ایک بے بہا جھومر اس کے ماتھے پر لگا اُلٹے قدموں پلٹ گئی۔ اب فرشتۂ موت جگمگاتی روح کو لیے ہوئے دوسرے مقام پر پہونچا یہاں حوروں کی صفیں قطار در قطار استقبال کو موجود تھیں سب نے بالاتفاق خوش آمدید کا نعرہ لگایا۔ ایک ممتاز حور سامنے آئی اور سر سے پاؤں تک ہیرے جواہرات کے زیور پہنانے شروع کیے وہ پہناتے وقت بآواز بلند کہتی تھی کہ یہ جڑاؤ گلوبند شوہر کی رضامندی کا صلہ ہے اور ہیرے کے کنگن اس لیے ان ہاتھوں میں پہنائے جاتے ہیں کہ یہ اپنے جسم سے زیادہ مخلوق

کے کام آئے۔ والدین کی فرمانبرداری اور بزرگوں کی تعظیم کا انعام یہ موتیوں کی مالا ہے"۔ (اب زندگی حصہ اول ص ۳۲-۳۳)

نسیمہ کے پیکر خیالی پر جو کچھ نوازشیں ہوئیں اُنھیں تو مصور غم کی نگاہِ کشفی نے دیکھ لیا لیکن خود اس مبصر الم کی جو کچھ سرفرازیاں اس دربار میں ہو رہی ہوں گی جہاں نہ کسی کی مخالفانہ تنقید کا اثر پہنچ سکتا ہے اور نہ کسی کی معاندانہ تنقیص کا۔ ان کا احاطہ کس بندۂ خاکی کا تصور، کس بشر کا تخیل کر سکتا ہے؟

من خشی الرحمن بالغیب وجاء بقلب	جو شخص بھی دنیا میں بن دیکھے خدائے رحمٰن کی خشیت
منیب ادخلوھا بسلٰم . ذٰلک یوم	رکھتا ہوگا اور قلب منیب (رجوع ہونے والے دل
الخلود. لھم مایشاؤن فیھا ولدینا مزید	کے ساتھ حاضر ہوگا۔ اس کو حکم ہوگا کہ داخل ہو جاؤ

اس جنت میں امن وراحت کے ساتھ اور یہ یوم عیش لازوال ہے جس کے ختم ہو جانے کا اندیشہ نہیں ایسوں کے لیے سب کچھ ہے جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس تو ان چیزوں سے بھی بڑھ کر نعمتیں ہیں۔

دنیا والے تو اس کو منتہائے فکر سمجھتے ہیں کہ جو مانگو مل جائے یہاں اشارہ ہو رہا ہے کہ یہاں اس منتہائے فکر سے بھی آگے کچھ مل کر رہے گا۔ جہاں تک ذہن رسا کی رسائی نہیں ہوتی وہ سب کچھ بھی انھیں مرحمت کر دے گا!

اللہ اللہ! یہ کن کو؟ ہاں ان کو جو قلب منیب رکھتے ہوں جن کے دل میں خشیت الٰہی ہو اور پھر اس بندہ کے انعام واکرام کا پتہ نشان کون بتائے۔ اس کا اندازہ وحساب کون لگائے جس کی خشیت لازمی سے بڑھ کر متعدی ہو یعنی صرف اپنے ہی قلب میں نہیں رہی، بلکہ اس نے وہ دوسروں کے قلب میں بھی پیدا کر دی اور جس کے قلم نے "موت" میں "زندگی" پیدا کر دی!

(ص:۲۴۶)

ایک بزمِ مشاعرہ کی غیر شاعرانہ صدارت

بزمِ مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اس کا صدر ایک دیہاتی! اور دیہاتی بھی کیسا زبان وادب کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر وسخن کے باب محض غبی! داد بانیِ مشاعرہ کی خوش طبعی کی

دیجیے. سبحان اللہ ! کیا خوب نظر انتخاب پڑی ہے !ان کی قلمی ظرافت سب پر روشن و آشکار لیکن حقیقت میں آج کی عملی ظرافت ان کا شاہکار ! دنیا کی نظر میں وہ محض ایک ظریف، لیکن میرے حق میں تو ستم ظریف ! یہ صدارت کیا ہے قحط الرجال بلکہ نیرنگیِ دہر کا ایک کھلا ہوا نشان اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانہ کا گمان ! بلکہ یوں کہیے کہ فسانۂ عجائب کا. کوئی ظریفانہ ایڈیشن اگر صاحب کائنات کی سرپرستی میں طبع ہو تو اس کے لیے ایک موزوں عنوان !

صدر اور صدارت کا نام آتے ہی ذہن منتقل ہوتا ہے ''خطبۂ صدارت'' کی جانب بلحاظ ضخامت طویل و عریض، بلحاظ ادب وانشاء فصیح و بلیغ، و بلحاظ معانی و مطالب اور بلحاظ تحقیق فن دقیق. سامعین باتمکین مطمئن رہیں کہ اس قسم کی بحر طویل میں کوئی فکرِ سخن ان کی خدمت میں ہرگز نہ پیش کی جائے گی اور نہ دو چار منٹ سے زائد انھیں تکلیف دی جائے گی. نہ شاعری کی کیفیت و ماہیت پر ہومر اور کالی داس کے حوالوں سے کوئی فاضلانہ تبصرہ اور نہ اردو مشاعرہ کا ولی دکھنی کے زمانہ سے شروع کر کے کوئی تذکرہ ! یہ مختصر سامعہ خراشی جو کی جارہی ہے وہ بھی محض اس ارشاد کی تعمیل میں کہ خطبۂ صدارت کے نام سے کچھ نہ کچھ ہو ضرور ! گویا یہ بھی فرض ہے کہ بلبلوں کی نوا سنجیوں سے قبل کچھ دیر زاغ آشفتہ نوا سے بھی لطف اٹھالیا جائے۔

آج جب کہ نہ دلّی کی سرکار ہے، نہ اودھ کا دربار. اور شاعر کی قدر آدھی و چوتھائی بھی نہیں. جتنی نانک کے گویوں اور سازندوں اور سینما کے بھانڈوں اور نقالوں کی ہے؟ آفریں ہے کہ آپ کی ہمت پر جواب بھی آپ میر تقی میرؔ اور خواجہ دردؔ کی یاد کو سینہ سے لگائے، کلیجہ سے چمٹائے ہوئے ہیں اور بجلی کے قمقموں کے دور میں اپنی شمع کافوری جلائے ہوئے ہیں. زندگی کے حقائق و معارف کی ترجمانی، ہر دور میں فارسی اور اُردو کے شاعروں اور استادوں سے بڑھ کر کس نے کی ہے؟ شاعروں سے مراد جماعت کے حقیقی باکمال افراد ہیں. ورنہ ننگ جماعت افراد کس طبقہ میں نہیں ہوتے؟ کون ایسا چمن ہے جس میں گل بغیر خار کے ہوں؟ آپ کے فخر کے لیے آپ کے بلند پایہ اسلاف معنوی کے کارنامے کافی ہیں. بلکہ کافی سے بڑھ کر وافی. کوشش کیجیے کہ ہر قدم انھیں کے نقش پر پڑے. بلکہ حقیقت

نجی میں، حقیقت بینی میں، حقیقت گوئی میں ان سے کچھ آگے بڑھ کر رہے، اور اوراق لیل ونہار پر اپنی یہ تاریخ ثبت کرا جایئے۔ کہ آپ کے ہاں فیضی اور عرفی اس وقت بھی برابر پیدا ہوتے رہتے رہے، جب دربارِ اکبری مدت ہوئی برخاست ہو چکا تھا!

(ص: ۲۶۰)

شبلیؒ

۱۴ء و ۱۵ء کو دن ہی ابھی گئے گزرے ہیں۔ کل رات ہی کا تو خواب ہے! وہ دیکھیے دارالمصنفین کا خاکہ تیار ہو رہا ہے۔ دستورالعمل بن رہا ہے۔ مجلس انتظامی کے رکن ملک بھر سے چھانٹ چھانٹ کر لیے جا رہے ہیں۔ ہونہار اور نوعمر، رفیق چنے جا رہے ہیں۔ علم وقلم کی بساط پر ایک نئی مجلس مرتب ہو رہی ہے۔ تحقیق وتصنیف کی مسند پر جلوہ آرا ہو رہے ہے۔ سید سلیمان ندوی یا ایک ہیچمداں کی زبان میں سلیمان اعظم، طبع واشاعت کے میر لشکر بنے ہوئے ہیں۔ انھیں کے رفیق وصدیق، ہم دم وہم قدم مولوی مسعود علی ندوی یا ایک بے ادب کی زبان میں سالار مسعود غازی! کیا زمانے تھے، کیا، جوش تھا اور کیسے بلند جذبات تھے! کیا کیا ولولے! اور سب سے بڑھ کر ایک عزم صمیم۔ کام کی دُھن۔ خدمت کی لگن!

اور یہ ساری آگ لگائی ہوئی اور روشنی پھیلائی کس کی تھی! ایک بڑے میاں کی، جو ستر اور اسی کیا معنی ابھی ساٹھ برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ''بڑے میاں'' بن گئے تھے۔ ابھی اپنی بھر پور جوانی ہی میں تھے کہ ملک بھر میں اپنا سکہ بٹھا چکے تھے۔ اور علامہ کہلانے لگے تھے۔ اور علوم ومعارف کی مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے ہزاروں دماغ روشن کر چکے تھے۔ تو ذرا وقت نکال کر اسی مردِ خدا کی داستانِ حیات کی کچھ سطریں پڑھ ڈالیے۔ داستان کچھ اس کی شخصیت کی اور کچھ اس کی کارگزاری کی۔ کہانی ناتمام سہی، ادھوری سہی، سرسری سی، بلکہ یوں کہیے کہ اڑی پڑی سی۔

اپنے ہوش کی آنکھیں ابھی کچھ کھل ہی چلی تھی اور زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے ختم اور بیسویں صدی کے شروع ہونے ہی کا تھا کہ کانوں میں مولانا شبلی کا نام عظمت وتوقیر کی راہ سے پڑنے

لگا. اکثر حالی کے ساتھ عطف ہوکر، اور کبھی ان سے ہٹ کر، بلکہ کبھی کٹ کر بھی شہرت یہی سننے میں آئی کہ مولانا علم وفضل کے پیکر ہیں. اور ایک ہمہ داں اور تاریخ کے بحر بے کراں نثر کے تاجدار، تو نظم کے بھی شہسوار. کچھ اور تمیز آئی تو الندوہ باقاعدہ پڑھنا شروع کیا اور اس نے مولانا کے علم وفضل کا نقش دل پر گہرا کردیا. اب الندوہ کا انتظار ہر مہینے بے تابی سے رہنے لگا. اورنگ زیب عالم گیر پر الندوہ میں قسط وار مضمون سونے پر سہاگے کا کام کرگیا. سوتے جاگتے شبلی ہی کا خیال پیکر نظر کے سامنے رہنے لگا. سال ہی ڈیڑھ سال بعد کالج میں پڑھنے کے لیے لکھنؤ منتقل ہوآیا. اور اخیر ۱۸ء کی دوسری ششماہی کی کوئی تاریخ ہوگی، جب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

اف وہ پہلی اصالۃً حاضری! کتنی مؤدبانہ، کتنی عقیدت مندانہ اور کیسی پرستارانہ تھی! نام بتانے اور معمولی سے سوالوں کا جواب دینے میں زبان لڑکھڑانے لگی، ہمت جواب دے گئی. خیر اس پہلی ملاقات کے بعد راہ کھل گئی. اور شروع شروع تو آمد ورفت، رُک رُک کر کئی کئی دن بعد ہوتی رہی. اور پھر جلد ہی جلد ہونے لگی. کبھی تنہا اور کبھی اس وقت کے رفیق خصوصی مولوی عبدالباری ندوی کے ساتھ. ملاقات کا عام وقت سہ پہر کا تھا. اِدھر سہ پہر ہوا، اور اُدھر قدم خود بخود آستانِ شبلی کی طرف اٹھ گئے. اس وقت مولانا کی حیثیت گویا پیر ومرشد کی تھی. سیاست ہو یا مذہب، شاعری ہو یا ادب، تاریخ ہو یا فلسفہ، علم وفن کے ہر شعبہ، ہر شاخ میں مرجعیت انھیں کو حاصل. وہ امام میں مقلد، وہ رہنما میں مسافر، وہ طبیب میں مریض۔

طبیعت حسن پرست پائی تھی، فارسی شاعری میں کھل کھیلتے اور معاملہ بندی کو بڑے لطیف انداز میں سرمستی کی حد تک پہونچا دیتے: بمبئی اور جنجیرہ کی تلمیحوں کو تو یار لوگ لے اڑے اور بدگمانی اور مبالغہ کے زور سے سوئی کو بلّم بھالا بنا دیا. لیکن ایسا بھی نہیں کہ بات سرے سے بے اصل ہو. اور مولانا کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے آخر یہ کیوں ضروری ہے کہ عمل ہی میں نہیں بلکہ خیال اور دماغ میں بھی انھیں بے نفس اور معصوم تسلیم کرلیا جائے.

مولانا کا سب سے بڑا وصف ان کا مشغلۂ علم تھا. کتب بینی ان کی غذا تھی اور مطالعہ ان کا

اصلی ذوق، انھیں کتب خانہ دے دیا جاتا تو بس اب انھیں نہ کھانے پینے کی پروا تھی نہ سونے کی. ان کا سب سے بڑا راحت کدہ ان کا کتب خانہ ہی تھا. یہ ذوق ان کی اصلی طبیعت و سرشت بن گیا تھا اور چونکہ یہ حال تھا، محض قال نہ تھا. آمد تھی، آورد نہ تھی اور تکلف و تصنع کو اس میں دخل نہ تھا. اس لیے ان کا ذوق متعدی بھی تھا اور دوسروں کو قوت کے ساتھ متأثر کرتا رہتا اور جو اُن کی صحبت میں اٹھا بیٹھا وہ خود بھی اگر مصنف نہیں تو مضمون نگار بن ہی گیا. جمال ہم نشین ''من اثر کرد'' کی تصدیق۔

شخصیت کی جھلکیاں آپ دیکھ چکے. اب ذرا مصنف پر بھی ایک سرسری، اچٹتی نظر ہو جائے.

مولانا اپنی جگہ بولنے والے بھی بہت اچھے تھے اور ملک کے اونچے خطیبوں، مقرروں میں گنے جاتے تھے لیکن ان کا اصلی جوہر کمال خوش تقریری نہیں، خوش تحریری تھا. اور ان کا شہرۂ آفاق عظمت کا نقیب زبان نہیں قلم تھا. مصنف اردو نے اور بھی اچھے اچھے پیدا کئے ہیں. کسی نے تاریخ نگاری میں نام پایا، تو کسی نے ادب و انشاء کا جادو جگایا. ایک نے دینیات میں اللہ اور رسول کے فرمان سنائے تو دوسرے نے قصے کہانیوں کے چونچلے دکھائے. تنوع یا رنگا رنگی کی دولت شبلیؒ ہی کے نصیب میں آئی. تاریخ ہو یا سوانح نگاری، شعر ہو یا نقدِ شعر، کلام ہو یا فلسفہ، جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا. اب چاہے وہ چھوٹا رسالہ ہو یا بڑی سی کتاب، لکھنے کا حق ادا کر دیا۔

موضوع جو کچھ بھی ہو. تصنیف و تالیف بجائے خود ایک فن ہے. جس کے اپنے قاعدے ہیں. ضابطے ہیں، اصول ہیں، فروع ہیں. شبلی کو یکتائی فنِ تصنیف میں حاصل تھی. رزم ہو بزم، دونوں کا سماں یکساں صحیح کھینچ دینے میں طاق، موزوں لفظ، مناسب فقرے، متناسب ترکیبیں لانے میں مشاق. کوئی استدلال کریں گے، تو ایسا معقول کہ پہلے ہلّہ میں تو آپ کا دماغ ان کے ساتھ ہی جائے گا. رنج کا نقشہ کھینچیں گے تو ایسا کہ آپ پر بھی جذبۂ غم طاری ہوئے بغیر نہ رہے. مقام مسرت کی مصوری کریں گے تو ایسی کہ آپ کے دل کا کنول آن کی آن میں کھل جائے. کسی شعر کی گرہ کھولیں گے تو ایسی کہ آپ کا بھی وجدان جھوم جھوم اٹھے. معرکہ حرب و ضرب کی تصویر دکھائیں گے تو ایسی کہ خود آپ کی رگ شجاعت جوش میں آجائے!

قلم پر یہ قدرت، وہ بھی ایسی ہمہ گیری، اس جامعیت کے ساتھ کمتر ہی کسی مصنف کے نصیب میں آئی ہے۔ پڑھنے والے گویا موم کی گڑیا ہیں کہ لکھنے والے نے جب اور جدھر چاہا ان کی ناک موڑ دی اور انھیں پتہ بھی نہ چلنے پایا۔

تصنیف وتالیف جب خود ایک مستقل آرٹ ٹھہرا تو آرٹسٹ یا فن کار کے لئے لازم ہے کہ اسے ناظرین باتمکین کی طبیعت پر، جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو، عبادت دقیق ہو، ثقیل نہ ہو، سادہ ہو پھیکی نہ ہو، سلیس ہو سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو خشک نہ ہو، عام فہم ہو عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو ٹھس نہ ہو، فکر انگیز ہو مگر بور کرنے والی نہ ہو، پر زور ہو مگر پر شور نہ ہو، شبلی اسلوب بیان کی ان باریکیوں کے اور لطافتوں کے نزاکتوں کے محرم راز تھے۔

نثر کے ساتھ نظم بھی شبلی کی قلمرو میں داخل تھی۔ آخر زمانے میں مولانا نے ''کشاف'' کا نقاب چہرے پر ڈال نظمیں بہت ساری کہہ ڈالی۔ سب کی سب سیاسیات اور وقت کے چلے ہوئے مسئلوں سے متعلق۔ اور یہ مولانا ابوالکلام کے ہفتہ وار الہلال کے افق پر طلوع ہوتی رہیں۔ زیادہ تر مزاحیہ رنگ میں ہیں اور کچھ طنزیہ بھی ہیں۔ اپنی نوعیت میں سب کی سب خوب! ایک مشہور نظم جنگ بلقان کے سلسلہ میں ہے اور دردناک مرثیہ اپنے بھائی کی وفات پر ہے۔ کچھ اور نظمیں مذہبی، اخلاقی عنوانوں پر اس دور سے بہت پہلے کی ہیں علی گڑھ کے زمانہ قیام کی ایک قومی مسدس بھی ہے لیکن مولانا کے اردو کے سرمایہ میں سب سے قیمتی ان کی ایک مثنوی مختصر سی کل ۲۰ صفحہ کی صبح امید کے نام سے ۱۸۸۴ء یعنی مولانا کے ابتدائی کی کہی ہوئی۔

بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر، کی ایک چمکیلی مثال۔ مثنوی کا مضمون نہ فاسقانہ ہے، نہ عاشقانہ، تمامتر قومی یا ملی ہے۔ لیکن موضوع کی اس سنجیدگی کے باوجود، ایسی بانکی، ایسی سجیلی، ایسی البیلی کہ گلزار کی ہم ادا اور ترانۂ شوق کی ہم نوا۔

شبلی جس پایہ کے سخن گو تھے۔ اس سے بڑھ کر سخن فہم تھے۔ تنقید کا فن جتنا بھی ترقی کر جائے۔ شبلی نے کلام فارسی پر جو بہترین تبصرے اپنی شعر العجم میں کر دیئے اور اردو کی رزمیہ شاعری اور فن بلاغت سے متعلق جو مبصرانہ نکتے موزانہ انیس ودبیر میں سپرد قلم کر دیئے ہیں ان سے کوئی طالب علم چاہے

ادبیات فارسی کا ہو یا ادبیات اردو کا شاید ہی مستغنی ہو سکے. اور طالب علم تو خیر، منتہی ہو جانے کے بعد بھی طالب علم ہی رہتا ہے. ان موضوعوں پر جو اچھے منجھے ہوئے اہل قلم ہیں. وہ بھی ان کتابوں سے روشنی حاصل کرتے رہیں گے. اس طرح جو فلسفہ اور عقلیات پر لکھنے لکھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں. ان کے لیے بھی مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ الکلام وغیرہ کو دلیلِ راہ بنائیں اور پھر اس جڑ کو پکڑ کر اس میں پھل پھول جتنے بھی چاہیں پیدا کرلیں. واقعات نگاری کے لحاظ سے الفاروق نمونہ کا کام دے گی. اور سیرۃ النبی کی تو بعض عبارتیں (خصوصاً ولادت مبارک کے سلسلہ میں) اپنی دلکشی و دلآویزی اثر انگیزی کے لحاظ سے کلاسیکل یا معیاری ہونے کا درجہ پا چکی ہیں. سلاست بیان، تحریر کی ان ساری قسموں میں قدر مشترک ہے اور حسنِ ترتیب کا جہاں تک تعلق ہے شبلی نے دماغ ایسا پایا تھا، جیسا شاہجہاں نے تعمیر کے لے. تاج محل کا تو خیر کہنا ہی کیا، باقی جامع مسجد دہلی، مسجد اجمیر وغیرہ جس شاہجہانی عمارت کو نظر میں لائیے اس کا نقشہ سڈول اور کیسا سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آئے گا شبلی بھی شاید اسی طرز و انداز کا اپنی تحریر کا چھوٹی ہو یا بڑی اپنے دماغ میں تیار کر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ یہ چیز ان کے لیے امر طبعی بن گئی تھی.

(ص: ۲۸۱)

سفر سعادت

بہترین شعر وہ نہیں جو دنیا کو سنانے کے لئے کہے جاتے ہیں بلکہ وہ ہوتے ہیں جو خود اپنے لئے کہے جاتے ہیں. بعض اوقات نثر کی کتابیں بھی شاعری کے اس معیار سے جانچنے کے قابل ہوتی ہیں. سفرنامے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے اس مجموعۂ اوراق کا انداز سب سے نرالا پائیں گے. یہاں مصنف دوسروں کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو مخاطب کئے ہوئے ہے زیادہ سے زیادہ اس لطف میں اپنے مخصوص احباب واعزہ کو شریک کرنا چاہتا ہے یا ان لوگوں کو جو مصنف ہی کی طرح اس سفر سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں، اور بس. مصنف صاحب اپنی روئداد سفر کو زیادہ رنگین اور مرصع ادیبانہ وانشاء پردازانہ بنا سکتے تھے اگر چاہتے، لیکن اس سادہ اور بے تصنع پرواز تحریر کی دلکشی ہی کچھ اور

ہے شام کی ہوا خواری کے لئے ہزار بن سنور کر باہر نکلیے، وہ بات کہاں جو گھر کے اندر بے تکلف مخملی، بالطبع بیٹھنے اٹھنے میں ہے۔

کوئی بشری کوشش بشری لغزشوں سے پاک نہیں رہ سکتی۔ مصنف نے اپنے اس نیاز مند کا ذکر ان اوراق میں متعدد مقامات پر کیا ہے لیکن کہیں کہیں تو افراط حسن ظن کا کمال ہی دکھا دیا ہے، اور اپنی ساری شہرت ثقاہت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔ محدثین کرام نے صوفیہ و مشائخ سے روایات قبول کرنے میں جو احتیاط برتی ہے اس کی حکمت کا یقین تو پہلے سے تھا ہی اب عین الیقین ہو گیا۔

مشک کی تعریف یہ کی گئی ہے اگر آپ کا شامہ درست ہے تو آپ مشک کے سامنے آتے ہی خود اسے پہچان لیں گے اور عطار کی ہر لسانی اور چرب زبانی سے قطعاً مستغنی رہیں گے یہاں بھی دیارِ حبیب سے آیا ہوا مشک آپ کے سامنے حاضر ہے اگر مشامِ جاں کہیں خوشبو محسوس کر لے تو مصنف اوراق کے ساتھ اس نامہ سیاہ تعارف نگار کے حق میں بھی دعائے خیر فرما دیجیے گا اللہ آپ کو جزائے خیر سے محروم نہ رکھے گا۔

(ص : ۳۲۳)

تاریخ نظم اردو

بدنفسی کہیے یا بدباطنی، واقعہ یہ ہے کہ کوئی تین سال ہوئے صوبہ کی ہندوستانی اکیڈمی کے اجلاس خاص میں جب ناطق صاحب اپنی نظم سنانے کھڑے ہوئے تو ان سطور کے راقم آثم نے سننا شروع کیا، نکتہ چینی وعیب جوئی کے کانوں سے، لیکن ابھی پہلے ہی بند کا پہلا شعر شاعر کی زبان سے ادا ہوا تھا کہ شکاری خود شکار بن چلا اور جو اعتراض کی کمین گاہ میں بیٹھا ہوا تھا وہ اعتراف کے میدان میں آنے لگا اور دو ہی بند پورے ہوئے تھے کہ واہ واہ سبحان اللہ کے نعرے آنے لگے اور جو منتقد تھا اسے معتقد بنتے بن پڑی۔ جگ بیتی تو خیر نہیں آپ بیتی تو یہ تھی۔ اب چاہے اسے کہہ لیجیے شاعری کی ساحری، یا زبان وادب کی افسوں گری، بہر صورت یہ تھی نطق ناطق ہی کی کرامت کلام ناطق کا اعجاز!

وہی نظم اب مکمل صورت میں آپ کے سامنے ہے تعارف حیراں ہوں کیونکر کرایا جائے۔

مشک کے تعارف کے لیے خود عطار کا زبان کھولنا خوشبوئے مشک کی توہین کرنا ہے چہ جائیکہ اس کی جسارت وہ کرے جو عطار بھی نہیں! حسین وجمیل چہرہ کے حسن و جمال کے ادراک کے لیے ضرورت تو صرف آنکھ کی ہے زبان ایسے موقع کے لیے بالکل بے زبان. دیدار کا کام ''گفتار'' آخر کیونکر دے سکے. دن کے پھیلے ہوئے اجالے میں یہ کہنا کہ دیکھو آفتاب روشن ہے یہ تعارف آفتاب کا نہ ہوا یہ در پردہ اپنی تعریف ہوئی کہ ہم بھی چشم روشن وآفتاب شناس رکھتے ہیں۔

جسے دیکھیے ایجادِ اردو کا سہرا اپنے ہی سر باندھنا چاہتا ہے دہلی والے کہتے ہیں کہ اردو کی زچہ گیریاں ہم نے گائی ہیں، دکن والے بولے کہ پودے کا تخم تو ہماری سرزمین پر پڑا ہے. پنجاب سے آواز آئی کہ یہ دربار ہمارے ہاں سے رواں ہوا ہے. بہار نے دعوی کیا کہ اس بہار نے تو سب سے پہلے ہمارے چمن کو کھلایا ہے. اب دیکھیے جناب ناطق اس چوکھ چراغ کو کس حسن ادا سے روشن کرتے ہیں اور شاعری کے دھاگے میں کس لطافت سے تاریخ کے موتی پروتے جاتے ہیں۔

دہلوی ، بازار اردو میں خریدار زباں
دکھنی دربار اردو میں گہر بار زباں
عہد محمودی سے ہے پنجاب سرکار زباں
بودھ تک پہنچے بہاری کے زنار زباں

یہ الفاظ لائے ہیں یا ایک ایک مصرعہ کی انگوٹھی پر نگینہ جڑتے چلے گئے ہیں آگے فیصلہ ناطق ملاحظہ ہو۔

ایک مورخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی
ملک میں تاریخ سے پہلے زباں پیدا ہوئی
پوچھنا تاریخ سے پیدائش اُردو کا حال
کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال

خوب اور بہت خوب! مدتوں کی جنگ وجدال کا فیصلہ آناً فاناً ہو جاتا ہے یک بیک آنکھیں کھل جاتی ہیں کہ یہ کیسی نادانیاں تھیں! یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے بچے آپس میں الجھتے جھگڑتے ،

بزرگ خاندان کے پاس آئے ہیں (بزرگ سن وسال ہی کے لحاظ سے نہیں، فہم ودانش کے اعتبار سے بھی) اور وہ چٹکی بجاتے سارے جھگڑے چکا دیتا ہے لیکن ایسا جواب نہ محض شاعر کو سوجھ سکتا ہے نہ اکیلے مؤرخ کے بس کی بات ہے، یہ وہی دے سکتا ہے جو ایک ہی وقت میں شاعر بھی ہو اور مؤرخ بھی اور ساتھ ہی نظر فلسفۂ تاریخ ولسانیات پر بھی رکھتا ہو۔

کوئی بشری تحقیق، لغزش وخطا سے محفوظ نہیں رہ سکتی، لیکن بحیثیتِ مجموعی یہ عرض کر دینا مبالغۂ شاعرانہ سے پاک ہے کہ مسائل فن اور حسن بیان کی جامعیت کے لحاظ سے اردو میں کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر اس تمہید نگار کے علم میں نہیں اور اگر کالجوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں اسے جگہ مل جائے تو محض طلباء کی نہیں اکثر اساتذہ کی بھی خوش نصیبی ہوگی!

(ص: ۳۴۰)

مرزا بلگرامی (تبصرہ)

افسانہ گوئی کی تعریف، مشرق میں یہی سمجھی گئی، کہ ظاہر جھوٹ اور باطن سچ. اسم فرضی ہو، لیکن مسمّٰی واقعی. گلاس شراب کے ہوں، لیکن گلاس کے اندر بجائے شیرۂ انگور کے آبِ انار! زبان ''دشنہ وخنجر'' کے تلفظ پر کھلے، لیکن دل ''ناز وغمزہ'' کے معنی میں لگا رہے. گلستان کی حکایتوں کی تاریخی تحقیقات کرنے بیٹھیے اور اس کھوج میں پڑ جایئے کہ فلاں حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے وہ کس ملک کا تھا کس سنہ میں تخت نشین ہوا، کس تاریخ کو وفات پائی، کے شادیاں کیں، کتنی اولاد چھوڑیں تو شاید ایک حکایت بھی سچ نہ نکلے، لیکن اگر پوست کو چھوڑ کر مغز کو دیکھیے، نقاب کے رنگ میں الجھنے کے بجائے چہرہ کے خط وخال پر نظر جمایئے تو ایک ایک لفظ، سچ اور سچائی میں ڈوبا ہوا ملے گا. صاحبِ مثنوی نے نہ صرف اس پر عمل کر کے دکھایا بلکہ اس کا فلسفہ بھی بیان فرمایا کہ ''سرِ دلبراں'' کچھ ''حدیث دیگراں'' ہی میں خوش تر وخوشگوار تر ہوتا ہے اور استاد غالبؔ اپنی زبان میں فرما گئے ہیں ۔

ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

البتہ دل کو تذبذب اس میں ہے کہ اس چھوٹی سی دلچسپ وخوشنما کتاب کی حیثیت کیا قرار دی جائے ،اور اسے لٹریچر کی کس صنف میں رکھا جائے .تاریخ یا سوانح عمری اسے قرار دیتے ہوئے تو دل دھڑکنے اور قلم لڑکھڑانے لگتا ہے .پھر کیا ہے؟ افسانہ؟ اچھا افسانہ ہی سہی .مصنف کو اگر اسے افسانہ کہنے ، اور ناظرین کو اسے افسانہ سمجھنے پر اصرار ہے تو افسانہ ہی سہی ، پھر وہی سوال ہوگا ، کہ افسانہ جھوٹا ہے یا سچا؟ تو اب کیا ہر سوال کا جواب ریویو نگار ہی دے گا؟ ماشاءاللہ آپ کی بھی آنکھیں ہیں ،اور آپ کے پاس بھی عقل ودماغ ہے سوال کا جواب اپنے ہی آپ کیوں نہیں حاصل کرتے۔

(ص : ۳۵۴)

ہم اور وہ

''قدیم جدید'' کی بحث اب خود قدیم ہو چکی ہے اور کوئی جدت اس میں باقی نہیں رہی اس پر بھی اب کوئی زندہ شخصیت اس میں حصہ لیتی ہے تو بحث کی مردہ ہڈیوں میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے .مدت سے کہا جارہا تھا کہ دلّی دلّی والوں سے خالی ہوگئی .اور زبان دانی اس خطہ سے رخصت ہوگئی ''ہم اور وہ'' نے ثابت کر دیا کہ دلّی میں دلّی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں اور دلّی کی زبان اب بھی ماشاءاللہ اسی آب وتاب اسی آن وبان سے زندہ ہے قائم وپائندہ ہے درخشاں وتابندہ ہے .مصنف نے ایک اچھوتے طرز پر قدیم وجدید کی بحث کو اٹھایا ہے اور محاکمہ کا حق ادا کر دیا ہے نتائج تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے کہ قلم کا رُخ کہیں کہیں غلو ومبالغہ کی جانب جھک گیا ہو لیکن بحیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے سچی ،کھری ،سیدھی ، خدا لگتی .اور حسن بیان ولطفِ زبان کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ .فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی ہے .حسن انشا کا ایسا نمونہ دیکھنے کو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں اللہ ان کی عمر میں بہت برکت ،ان کے قلم کو بہت قوت عطا کرے کہ گلشن اردو کو ایسی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں باقی رہے گی۔

(ص : ۳۷۶)

آٹھواں باب

مکتوباتِ ماجدی

بیسویں صدی عیسوی کا گلشن اردو ادب جن نہروں اور دریاؤں سے سبز و شاداب ہوا اور اس میں ہر صنفِ ادب کے گل بوٹے کھلے، انہیں میں ایک سرِ فہرست دریا "دریائے ماجدی" بھی ہے۔

مولانا دریابادیؒ چونکہ ایک مسلم الثبوت ادیب و صحافی اور مفسرِ قرآن تھے، اور اپنے ہم مذاق ماہرین فن سے تعلقات گہرے اور خصوصی رکھتے تھے۔ اسی طرح اپنی صدق بیانی اور طرزِ بیان کی سحر انگیز انشاء پردازی کی وجہ سے محبین و مخلصین کا بھی ایک وسیع حلقہ رکھتے تھے، اس لیے ان سب سے ان کے مذاق کے موافق خط و کتابت رکھتے۔

۱۹۵۳ء سے چند مخلصین کے اصرار پر خاص خاص خطوط کی نقل رکھنے کا التزام کیا گیا، اکثر یہ خدمت مولانا کی منجھلی صاحبزادی (اہلیہ حبیب احمد قدوائی) انجام دیتیں جو مولانا کی مزاج شناس ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کی انتہائی باریک تحریر پڑھنے میں برق تھیں۔ یہ خطوط کم و بیش گیارہ ہزار کی تعداد میں موجود و محفوظ ہے۔ ان خطوط کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور مرتب محترم ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے اظہار کے مطابق مزید دو یا تین جلدوں میں شائع ہوں گے۔

پہلی جلد ادبی اور تعزیتی مکتوبات پر مشتمل ہے۔ ادبی مکتوبات بھی دو طرح ہیں۔ ایک تو وہ جن میں الفاظ کی وضع، تذکیر و تانیث، اور ان کے محلِ استعمال کی بابت سوالات و جوابات مذکور ہیں۔ اور کہیں کہیں مولانا نے ان سے متعلق اپنے خاص مذاق کا اظہار بھی کیا ہے۔ دوسرے وہ مکتوبات جن میں مکتوب الیہ کے نام و کام سے دلچسپ و نیک فال نت نئی تلمیحات کو رعایتِ لفظی کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے جو ادبی لطافتوں اور نزاکتوں کا ایک انوکھا شاہکار ہے۔ ادبی مکتوبات کا انتخاب اسی دوسرے حصہ سے کیا گیا ہے۔

تعزیتی مکتوبات میں ہر طرح کے تعزیت نامے موجود ہیں. اولاد کی رحلت پر دل شکستہ ماں باپ کے نام، ماں باپ کے سایہ سے محروم ہو جانے پر افسردہ و متفکر اولاد کے نام، اسی طرح سرمایۂ حیات کی رخصتی پر مغموم شوہر کے نام، اور عاشق زار شوہر کی جدائی پر الم نصیب بیوی کے نام. ان تعزیت ناموں میں اظہارِ ہمدردی و غمگساری، تسکینِ قلب و تسلیِ خاطر کے ساتھ ساتھ اسوۂ نبوی کی طرف ایسے اشارے کیے ہیں کہ محزون امتی اضطراراً اہی سہی اپنی زندگی پر ایک گونہ فخر کرنے لگتا ہے. اور انا للہ و انا الیہ راجعون کی ایسی مؤثر اور دلنشین انداز میں تشریح کی ہے کہ مصیبت زدہ کے دلِ پژمردہ میں یکا یک حیات کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

دوسری جلد ۱۳ اور تیسری جلد ۱۸ خص مخلصین کے نام لکھے گئے مکاتیب کا مجموعہ ہے. جن میں مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قابلِ ذکر ہیں۔

راقم سطور نے مکتوباتِ ماجدی کی تین فصلیں قائم کی ہے. پہلی دو فصلوں کے نام حکیم عبدالقوی دریابادیؒ کے پہلی جلد کے دو حصوں کے رکھے گئے دو ناموں سے مستعار ہے.

(۱) دلآویز ادبی مکتوبات

(۲) دلدوز تعزیتی مکتوبات

(۳) دلچسپ علمی مکتوبات

پہلی فصل میں دوسری اور تیسری جلد کے بعض ادبی مکتوبات کو بھی جگہ دے دی گئی ہے اور دوسری فصل میں ایک تعزیتی مکتوب بھی شامل کر لیا گیا ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال پر مولانا مناظر احسن گیلانی کے نام تیسری جلد میں تھا۔

فصل اول

دلآویز ادبی مکتوبات

بنام سید لقمان صاحب

(معتمد بزم صحافت جمعیۃ الاصلاح، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

عزیزم! وعلیکم السلام

آپ تو خود ''لقمان ہیں آپ کو حکمت کا درس کون دے سکتا ہے۔ لیکن لقمان نے دانائی نادانوں سے سیکھی تھی۔ اس لیے اپنے لکھنے لکھانے میں کچھ حرج نہیں دیکھتا۔

''اصلاح'' کا کام یوں بھی دشوار اور نازک ہے اور پھر اصلاحی صحافت تو اور دشوار تر اور نازک تر ہے۔ خدا کے لیے اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھیے۔ بس اس کے بعد ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ اصلاح کا کام پیمبرانہ روحانیت و دقت نظر چاہتا ہے۔ اور اصلاحی صحافت گویا اسی کا شعبہ و تذکیر و تبلیغ ہے۔ جتنا اپنے آپ کو سیرت پیمبری میں جذب و تحلیل کرتے جایئے گا۔ جتنا اپنے آپ کو پیمبری سانچے میں ڈھالتے جایئے گا تزکیہ نفس اور تربیت ضمیر از خود ہو جائے گی۔۔۔۔ راہ اور شاہ راہ صرف یہی ہے اس کے سوا جتنی گلیاں اور کوچے ہیں سب منزلِ مقصود سے ہٹانے والے اور بھٹکانے والے ہیں۔

دعا گو

عبدالماجد

(حصۂ اول ص:۱۱)

(مشہور شاعر حضرت امجد حیدر آبادی پر خواجہ حمید الدین شاہد صاحب نے مضمون مانگا تھا اس کے جواب میں یہ پیام بھیجا)

''امجد'' نامور، ذی شان کے باب میں ''ماجد'' گم نام و بے نشان کا کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ ہے دکھانا شہد کو اور کون سی مٹھاس ڈال کر میٹھا کیا جائے۔ اور نمک میں اور کون سی نمکینی ڈال کر

نمکین بنایا جائے؟ وہ میرے افضل التفضیل برائے نام ہی نہیں زندگی کے ہر صیغہ میں مجھ سے افضل، اکرم، اشرف، اور اکمل ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں، کمالات میں، کرامات میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔

عبدالماجد

(ص:۱۳)

یوسف قمر صاحب

(ایڈیٹر "ہلال نو" پشاور کے نام پیام)

"ہلال نو" یوں بھی آبروئے آسمان اور پھر امت کا قومی نشان۔ اس کی زیارت کی مشتاق کون سی آنکھ نہ ہوگی خواہ اس کا طلوع افق پشاور ہی سے ہوا کرے۔ اور پھر اس کے ایڈیٹر یوسف قمر! جمال ہی جمال! نورٌ علیٰ نورٌ!۔۔۔۔ چار چاند لگ جانا اسی کو کہتے ہیں۔

اس کی ٹھنڈی روشنی یقیناً ہر دیدہ ور کے لیے "سرمۂ بصارت" اور "چشمۂ بصیرت" ثابت ہو رہی ہوگی۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض جلد اسے آسمان معنویت کا بدر کامل بنا کر رکھے۔

عبدالماجد

(ص:۱۲)

مکتوب بنام ادیب شہیر خواجہ محمد شفیع دہلوی، لاہور

برادرم! وعلیکم السلام

خوشی اس کی ہے کہ دریافتِ خیریت سے خود آپ کی خیریت دریافت ہوگئی۔ "مذکور" میری خیریت تھی اور مقدور آپ کی خیریت۔ فالحمد للہ۔ ہندوستان آنے کا ارادہ کبھی نہیں ہوتا؟ آپ دلی کو کبھی تو آ کر دیکھ جایئے۔۔۔۔ سہاگن نہ سہی، بیوہ سہی۔

والسلام دعاگو و دعاخواہ

عبدالماجد

(ص:۲۱)

مکتوب بنام حکیم بنیاد علی میرٹھی

(انہوں نے مولانا مرحوم کو اپنے دواخانہ کے شربت "روح پرور" کی دو بوتلیں بطور تحفہ بھیجی تھیں، اس کے شکریہ کا مکتوب)

کرم گستر! وعلیکم السلام

شربت "روح پرور" واقعی اس موسم میں ایک تحفہ روح پرور ہے۔ اور پھر ایک نہیں دو دو بوتلیں۔۔۔۔

اجر کو اضعافا مضاعفا کرنے والی. جنتان ذو افنان و مد هامتان کی شان لیے ہوئے۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

(ص:۳۶)

مکتوب بنام رازق الخیری صاحب ''ایڈیٹر عصمت'' کراچی

(انہوں نے ''عصمت'' کے جوبلی نمبر کے لیے مولانا سے مختصر مضمون مانگا تھا، پیام ذیل اسی بارے میں ہے)

جوبلی نمبر

ہوش کی آنکھیں جب سے کھلیں ''عصمت'' کی زیارت سے مشرف ہوتا رہا. مدتوں ان آنکھوں نے نور اور دل نے سرور اس کے مطالعہ سے حاصل کیا. خدا جانے کتنی بہو بیٹیوں کی زندگیاں اس سے سنور گئیں. سنبھل گئیں. پچاس برس کی مدت کوئی معمولی مدت ہوئی؟ یہ کس قیامت کی انقلابی، کس غضب کی حشر انگیزی، ہندوستان اور پاکستان دونوں کیا سے کیا ہو گئے. خاتون مشرق کہاں سے کہاں پہونچی. اور دیکھیے ابھی کیا کیا اور دیکھنا باقی ہے! اکبر اور اقبال دونوں اپنا سر پیٹتے رہے. آفریں ہے آپ کی ہمت پر کہ آپ آج بھی پرانی صدا لگائے چلے جا رہے ہیں. اور بیڑا اسی کا اٹھائے ہوئے ہیں کہ ''چراغ خانہ'' کو کسی حال میں ''شمع انجمن'' نہ بننے دیں گے. نقشہ

چراغ لے کر کہاں سامنے ہوا کے چلے

کا کھینچا ہوا۔

یہ سب اگر بانیِ ''عصمت'' حضرت راشد الخیری کے اخلاص کی کرامت اور فیض کا تصرف نہیں تو اور کیا ہے. اللہ آپ کے دم کو قائم رکھے اور آپ کے دم خم کو بھی. جیتے رہیے اور اُسی آن بان سے اسی قلندرانہ شان سے اپنے میدان جہاد میں جمے رہیے، ڈٹے رہیے۔

دعاگو

عبدالماجد

(ص:۳۵)

مکتوب بنام مولوی حبیب ریحان خان صاحب ندوی

منزل و نشان منزل

منزل تک رسائی ہو یا نہ ہو، یہ امتیاز کیا کچھ کم ہے کہ نشانِ منزل دکھاتے رہنے کی خدمت مدت دراز سے آپ اپنے ذمہ لیے ہوئے ہیں۔ نشانِ منزل کے عام نمبر کیا کچھ کم ایسے ویسے ہوتے ہیں پھر اب کی تو اس کا خاص اور خصوصی نمبر نکال رہے ہیں۔ اللہ ہم آپ کو سب کو راہ منزل سے گزارتا ہوا منزل مقصود تک جا پہنچائے۔

والسلام دعا کو
عبدالماجد

(ص:۳۷)

مکتوب بنام ابن احمد صاحب، ناظم اعلیٰ حلقۂ ادب

(انہوں نے اپنے رسالہ "پرواز" کے لیے پیام مانگا تھا)

اللہ آپ کے "پرواز" کو طاقتِ پرواز عطا فرمائے اور اس کا رخ ہمیشہ سیدھا رکھے! زمانے کی ہوائیں جس رخ پر چل رہی ہیں اس کا مقابلہ آسان نہیں۔ اللہ آپ کی ہمت کے بازوؤں کو قوی رکھے اور ہر قسم کی "بادِ ہوائی" باتوں سے بچائے۔

والسلام دعا کو
عبدالماجد

(ص:۴۶)

مکتوب بنام مولانا جمال الدین عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی

(موصوف نے مولانا مرحوم کو بہت نفیس کھدر کا کرتا، پاجامہ بھیجا تھا)

برادرم سلمہ! السلام علیکم

وہ خرقہ جمعہ کے وقت پہنا۔۔۔ ماشاء اللہ وسبحان اللہ۔ اتنا سبک اتنا لطیف، اتنا نفیس کہ جسم معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ملبوس ہے بھی! حلۂ بہشتی کا نمونہ۔۔۔ جمال کا کمال! اخلاص کا قائل پہلے ہی سے تھا کرامت کا معتقد اب ہونا پڑا۔ جزاک اللہ وبارک اللہ

دعا گو و دعا خواہ
عبدالماجد

(ص:۵۳)

مکتوب بنام ایڈیٹر صاحب صداقت، حیدرآباد

(انہوں نے اپنے پرچہ کے لیے پیام مانگا تھا جو حسب ذیل ہے)

''صداقت'' کو جو مناسبت ''صدق'' سے ہے اس کے بعد صداقت کی داد صدق کے لیے تو کہنا چاہیے کہ خودستائی کے مترادف ہے۔ لیکن اتحاد و اشتراک لفظی سے قطعِ نظر معنوی اعتبار سے بھی مذہبی رنگ کا روزنامہ نکالنا اس دور میں ایک مجاہدہ سے کم نہیں چہ جائیکہ جب وہ صحافتی خصوصیات ولوازم میں اپنے کسی معاصر سے پیچھے نہ ہو۔ سب باتوں کی ایک بات یہ کہ وہ اب تک قلمی اشتہارات کی لعنت سے بچا ہوا ہے۔ اللہ اسے ہر طرح ترقی نصیب کرے۔

والسلام دعاگو
عبدالماجد

(ص:۶۸)

مکتوب بنام حاجی مقتدا خان صاحب شیروانی

مخدوم و مقتدا! وعلیکم السلام

آپ کے اشہبِ قلم نے ضلع کے سبزہ زار میں ماشاء اللہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں وہ وہ کلیلیں بھری ہیں وہ وہ کاوے کاٹے ہیں، وہ وہ طرارے بھرے ہیں کہ میری ہمت تو تقلید کی بن نہیں پڑتی۔ اس میدان کے غازی مرد تو آپ ہی ٹھہرے۔ میرا ابلق خامہ اگر داد کی منھ زوری کا حوصلہ کرے تو پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائے۔ داغ پر داغ اٹھائے۔ ایک ہی گردنی میں درست ہو جائے نعل در آتش ہو کر زبان بند کرتا ہوں۔ قافیہ تنگ ہے۔ زینہار آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اللہ آپ کا کارساز ہے۔

والسلام
عبدالماجد

(ص:۶۹)

مکتوب بنام ایڈیٹر صداقت، حیدرآباد

(مکتوب الیہ نے اپنے اخبار کے بابائے اردو نمبر کے لیے مضمون مانگا تھا)

بابائے اردو

ہمارے مخدوم و مکرم مرزا محمد ہادی رسوا مرزا لکھنوی شعر بڑے مزے کے کہتے تھے ان کی ایک غزل کا شعر ہے ؎

ہو کوئی حوروں پہ فدا کوئی بتوں پہ شہید
ڈھونڈھ ہی لیتا ہے انسان خدا ایک نہ ایک

سو ہمارے بزرگ بابائے اردو نے اپنا خدا اردو ڈھونڈھ نکالا۔ وہی ان کا مرجع، وہی ان کا ملجا، وہی ان کا مقصود، وہی ان کا مسجود، وہی ان کی عبادت، وہی ان کی ریاضت، وہی ان کا معبد، وہی ان کا مصلّٰی۔ نہ بیوی نہ بچے۔ ساری خانگی الفتوں دلچسپیوں کا وہی ایک مرکز و محور ۱۹۱۲ء سے جب انجمن اردو اس کس مپرسی میں پڑی ہوئی ان کے حوالے ہوئی ہے یہی دیکھیے کیسی نکھر گئی ہے۔

اورنگ آباد ہو کہ حیدرآباد، دہلی ہو کہ کراچی۔ جہاں کہیں بھی رہے سوتے جاگتے یہی ایک دھن ان پر سوار۔ جوان سے ادھیڑ ہوئے اور ادھیڑ سے بوڑھے اسی ایک عشق میں۔ عجب نہیں کہ کبھی گنگناتے ہیں تو اپنے اسی محبوب کو مخاطب کر کے

اے تو افلاطون و جالینوس ما

دولت لٹائی تو اسی کی خاطر، دست گدائی پھیلایا تو اسی کے لیے۔ آج اس سے لڑے کل اس سے ملے۔ سب اسی پر جفا و وفا کے لیے۔ اتنے مجاہدے دین و مذہب کی خاطر کرتے تو عجب کیا کہ جنید و بایزید کی صف میں شمار ہوتے۔ آندھیاں اٹھیں، اور گزر گئیں۔ انقلاب آئے اور ختم ہو گئے، وہ بدستور اسی بساط اردو سے چمٹے ہوئے۔ ان کے کارناموں کو گنانا، ان کی تفصیل لکھنا دوسروں کا کام ہے۔ یہاں تو داد محض ان کی استقامت بلکہ کرامت کی دینا ہے۔ جس کسی نے انھیں بابائے اردو کہا بہت خوب کہا۔ کچھ خیال ایسا پڑتا ہے سب سے پہلے شاید میر نیرنگ مرحوم کی زبان سے نکلا تھا یا شاید اس کے موجد خواجہ حسن نظامی ہوں۔

اللہ ان کی عمر و توانائی میں زیادہ سے زیادہ برکت دے اور خدمت اردو کے لیے ان کی جسمانی اور دماغی قوتوں کو سدا جوان رکھے۔

عبدالماجد

(ص: ۷۰)

مکتوب ناظم انجمن اردو پنجاب یونیورسٹی
(انہوں نے یوم اکبر کے لیے پیام مانگا تھا)

پیام

اکبر کی عزت کرنا خود اپنی عزت بڑھانا ہے ع مادح خورشید مداح خود است. دل خوش ہوا کہ آپ نے اکبر شناسی کا ثبوت دے کر اپنے عرفانِ نفس کے لیے بھی مدارج طے کر لیے. اکبر کا پیام صحیح، لطیف، ذوق ادب کے ساتھ اسلام اور اسلامیت کے پیام کے سوا کچھ نہیں. مآلِ سخن و حاصل کلام کے لحاظ سے اکبر و اقبال بالکل ہم زبان ہیں گو راستے دونوں کے الگ الگ ہیں۔

والسلام
عبدالماجد

(ص:۷۵)

پیام بنام انوار ظہوری صاحب، ایڈیٹر ماہ نامہ ''نیا راہی''

پیام

''سلیمان نمبر'' کے لیے سلیمان کے شایانِ شان یہ ''مورِ ضعیف'' پر وبال کہاں سے لائے مرحوم سے اس نیاز مند کے تعلقات ۴۰، ۴۵ برس تک رہے. گہرے بے تکلفانہ، عزیزانہ، طالب علمی سے لے کر سن کہولت تک، عمر کے ہر دور میں۔ شروع شروع میں ایک حد تک حریفانہ، معارضانہ، اخلاص نے ساتھ ہر دور میں دیا۔

اتنے طویل تجربے اور ساتھ میں ایسا شریف، ایسا متین، ایسا سنجیدہ کمتر ہی کوئی نظر آیا. صحیح معنی میں یہ طالب علم ساری عمر رہے. علم کے پتلے کتاب کے کیڑے. علم و تحقیق کا ذوق، ہر دوسرے ذوق پر غالب. سیرت نبوی سے عشق ساری عمر رہا اور آخر عمر میں فنافی الشیخ ہو کر رہ گئے تھے. ایک پیکرِ تواضع و خضوع. علمی معاملات میں اپنے چھوٹے سے اپنے کو چھوٹا سمجھنے والے۔

والسلام
عبدالماجد

(ص:۷۶)

مکتوب بنام خورشید احمد صاحب، ایڈیٹر مشعل راہ کراچی

برادرم سلمہ تعالیٰ وعلیکم السلام

''چراغ'' کا بدل ''مشعل'' آپ کو خوب ہاتھ آ گیا. بدل کیوں ''نعم البدل'' کہیے. اور آپ خود ٹھہرے مطلع انوار، پھر ''خورشید'' ع

ایں خانہ تمام آفتاب است

مشعل کی روشنی تو ابھی یہاں پہونچی نہیں صرف آپ کے خط سے اطلاع پا کر یہ ایک لفظی ''پھلجڑی'' تیار ہوگئی.

والسلام دعا گو
عبدالماجد

(ص:۷۷)

مکتوب بنام پروفیسر مسعود حسن رضوی دین دیال روڈ لکھنؤ

محترم! السلام علیکم

خدا خدا کر کے اس طوفان کا زور گھٹا.

اے سبحان اللہ. یہ ''طوفان'' کی مناسبت سے ''گھٹا'' کیا خوب! دیکھیے اس داد پر مجھ غریب پر نہ برس پڑیے گا۔

دعا گو
عبدالماجد

(ص:۷۸)

بنام جوش ملیح آبادی

برادرم! وعلیکم السلام

والا نامہ ملا ساتھ ہی نمونہ کفت اردو بھی پہنچا. انشاء اللہ جلد ہی پڑھ کر کچھ نہ کچھ عرض کروں گا

بعض پاکستانی تنقیدیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے نقادوں کا زاویہ نظر

قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے

کا ہے خوردبین سے دیکھیے تو حسین سے حسین چہرہ بھی داغدار نظر آ سکتا ہے. علالت کے ذکر سے تشویش خاطر ہوئی لیکن نثر میں ''خدا کرے'' اور نظم میں ''معبود'' تو بڑی ہی امید افزا علامتیں ہیں.

دنیا سے اٹھنا تو سب ہی کا برحق ہے لیکن دعا ہے کہ جوش کا ئلا واجب ادھر سے آئے وہ کسی ''صہبا گسار'' ''ستراد ار نار'' کا نہیں بلکہ رومی، خسرو اور اقبال کی صف میں شامل ہونے اور کسی کے ذکر جمیل میں

رطب اللسان رہنے والے کا ہو اور اس دعا کے مقبول ہونے سے مایوس ہرگز نہیں۔

والسلام
عبدالماجد

(ص:۸۳)

مکتوب بنام حبیب انصاری صاحب

(مکتوب الیہ کی اس اطلاع پر کہ انھوں نے اپنا ذاتی مکان بنوالیا ہے مکتوب بالا بھیجا)

عزیزم مکرم!

شاعر نے تو ''جہاں'' سے بے نیاز ہو کر خیر صرف ''جانِ جہاں'' کی مانگی تھی اور کہہ ڈالا تھا ۔

مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے

میں یہ بے نیازی کہاں سے لاسکتا ہوں۔ مکان کی مبارک باد مکین کو دیتا ہوں اور خیر مکین و مکان دونوں کی ''لامکان'' سے مانگتا ہوں۔

والسلام دعا کو
عبدالماجد

(ص:۱۱۳)

مکتوب بنام مولانا عبدالرؤف صاحب

کرم گستر! السلام علیکم

آم ''ڈھیر کے ڈھیر'' آپ کے بھیجے ہوئے کھانے میں اب آئے جزاک اللہ۔ اتنے میٹھے اور رسیلے کہ حد تعریف سے باہر۔ سبحان اللہ!۔۔۔ کہیں آپ نے اخلاص کا رس تو ان میں نہیں گھول دیا تھا!

والسلام دعا گو و دعا خواہ
عبدالماجد

(ص:۱۱۹)

مکتوب بنام مولانا قاری طیب صاحب دیوبندی

(حضرت مولانا موصوف نے اپنی آنکھ کے آپریشن پر ایک طویل نظم لکھ کر مولانا دریابادی کے پاس بھیجی تھی یہ تبصرہ اسی نظم پر ہے)

حضرت محترم! السلام علیکم

''آنکھ کی کہانی'' آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالا۔ سبحان اللہ و ماشاء اللہ! مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و نظم پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے۔ ذٰلک فضل اللہ۔

کیا کیا قافیے نکالے ہیں! کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں۔۔۔۔نہ کہیں سے جھول اتنی طویل نظم میں نہ کہیں سے آورد، بس آمد ہی آمد۔خوش دماغ تو بہ حیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے آپ تھے ہی اب معلوم ہوا کہ ماشاءاللہ خوش فکر بھی اس درجہ میں ہیں۔ماشاءاللہ

والسلام دعا کو دعا خواہ

عبدالماجد

(ص:۱۲۱)

مکتوب بنام ایڈیٹر صاحب ''چراغ راہ'' کراچی

برادرم! وعلیکم السلام

''چراغِ راہ'' کی روشنی آج پہلی بار اس ''ظلمت کدہ'' تک پہنچی بہ واسطہ ''خورشید''۔

والسلام دعا کو دعا خواہ

عبدالماجد

(ص:۱۲۶)

مکتوب بنام طالب چکوائی

کرم گستر! تسلیم

''برگ سبز'' موصول ہوگئی تھی۔وقت نکال کر اِدھر اُدھر سے سیر کرلی۔''برگ'' کا ہے کو ہے چمن ہے گلزار و شاداب اور آپ طالب نہیں اردو کے حق میں عین مطلوب ہیں۔

دعا گو

عبدالماجد

(ص:۱۲۹)

بنام حکیم مولوی محمد زماں حسینی قاسمی

(حکیم محمد زماں صاحب کے فرزند حکیم مولوی محمد عرفان کا عقد مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم کی تیسری صاحبزادی سے ہوا تھا۔جو ذیل خط اسی مبارک شادی کے سلسلہ میں ہے)

کرم گستر! وعلیکم السلام

تقریب عقد، اور وہ بھی خاندان ''نامی'' میں! اللہ ہر طرح مبارک و مسعود کرے۔! اللّٰھم الف بینھما الخ یہیں سے پڑھے دیتا ہوں۔اس کو جسمانی حاضری کا بدل سمجھا جائے۔

والسلام

عبدالماجد

(ص:۱۳۱)

مکتوب بنام حیات وارثی صاحب سکریٹری اردو ہندی سنگم

پیام

حسرت موہانی سچے مسلمان تھے۔

صاحبِ ایمان وعرفان تھے

محبت کی جان اور اخلاص وایثار کے مجسم نشان تھے۔

قناعت اور توکل میں اپنی مثال آپ تھے۔

ایک بہترین شاعر خصوصاً غزل گو تھے۔

جرأت وہمت میں لاثانی تھے۔

جاں بازی وبے خوفی میں فردِ فرید تھے۔

ایک بہترین ناقد ادیب تھے۔

اخلاق، کردار، عقل وذہن کی خوبیوں کی جامعیت کے لحاظ سے ایک مکمل انسان تھے۔

عبدالماجد

(ص:۱۴۳)

مکتوب بنام محمد عصمت خان صاحب سکریٹری اردو فارسی سوسائٹی لکھنؤ

پیام بہ موقع یوم اکبر

کلام اکبر کی گرچاٹ پڑ گئی تو ایک ہی وقت میں۔

۱۔آپ نے اپنی زبان بھی درست کرلی۔

۲۔اردو کے ایک اچھوتے، لطیف، پیارے اسلوب بیان کے بھی رمز شناس ہوگئے۔

۳۔اپنی سخن گوئی، سخن فہمی، سخن سنجی کی بھی نوک پلک درست کرلی۔

۴۔توحید ومعرفت کی بھی چاشنی چکھ لی۔

۵۔اپنے اندر مشرقیت، اسلامیت، غیرتِ ملی اور خودداری کی روح بھی جذب کرلی۔

اکبر اور کلام اکبر پر سیکڑوں صفحے لکھ چکا ہوں پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ بھی نہیں

لکھا، اللہ تکملہ آپ لوگوں کے ہاتھ سے کردے۔

عبدالماجد

(ص:۱۴۷)

مکتوب بنام حکیم نیّر صاحب

بندہ نواز! تسلیم

آپ تو بڑی چیز نکلے۔۔۔۔زندہ باش

اتنے بہتر اتنے مفصل، اتنے جاندار بلکہ جان بخش خط کی تو میں توقع ہی نہیں کرسکتا تھا. زیادہ سے زیادہ یہ خیال کئے ہوا تھا کہ چند سطروں میں ضابطے کا جواب آجائے گا. اس کا بیشتر حصہ چھپنے کے قابل ہے۔

بہت ہی خوشگوار حقیقتیں اس ''شعاعِ نیّر'' سے روشن ہوجائیں گی. آپ اجازت دیتے ہیں نہ؟ اگر روکنا ہو تو لکھ دیجیے ورنہ آپ کی خاموشی کو نیم رضا نہیں بلکہ کامل رضا سمجھوں گا۔

نیازکیش

عبدالماجد

(ص:۱۵۴)

مکتوب بنام ایس اے احسن نقوی انجمن ارباب ادب

پیام

علی عباس حسینی کیا بہ حیثیت انسان اور کیا بہ حیثیت صاحب فن دونوں حیثیتوں سے بڑا ممتاز درجہ رکھتے تھے کہنے کو وہ ''ترقی پسند'' تھے، لیکن میں کہا کرتا تھا کہ اگر ایسے ہی ترقی پسند سب ہوجائیں تو میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے تیار ہوں اتنا صاف ستھرا قلم اتنا شستہ ذوق، اتنی صحیح اور سلیس زبان، گندگی و بداطواری سے اتنا گریزاں، ان کے طبقہ میں شاید ہی کسی کے نصیب میں آیا ہو. امریکہ کے گندے جنسی ناولوں کے مطالعہ میں غرق رہتے لیکن کیا مجال جو اپنے قلم پر ذرا بھی ان کا عکس پڑنے دیں. زندگی کی عکاسی اور مصوری میں انھیں ملکہ حاصل تھا اور زبان و بیان پر پوری قدرت۔

بہ حیثیت صاحب قلم اگر شریف تھے تو بہ حیثیت انسان شاید شریف تر. یوں بھی منکسر،

متواضع، صلح کل، خدمت گزار، مہمان نواز قسم کے آدمی تھے۔ آخر عمر میں عبادت و مذہبیت کا رنگ اور غالب آ گیا۔ گفتگو اکثر آیاتِ قرآنی پر کرتے اور نماز کے لیے چوکی بستر علالت کے پاس لگی رہتی اتنی خوبیوں کے لوگ کمتر ہی نظر آتے ہیں۔

دعا کو
عبدالماجد

(ص:۱۶۵)

مکتوب بنام شاہ معین الدین صاحب، ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ

(مولانا مرحوم دارالمصنفین کے جلسہ انتظامیہ میں شرکت کرنے اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے اس سفر میں متعدد تکلیفیں اٹھانی پڑیں اس خط میں اسی کا ذکر ہے)

مکرم بندہ! وعلیکم السلام

ع۔ خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ع۔ قصہ دُرد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

شاہ گنج اسٹیشن پر جو حکم سفر سرائے میر کا ملا وہ حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا۔ اسے ہر حال میں میرا وہمی ذہن اپنے حق میں ظلم سمجھتا چہ جائیکہ اس وقت تو بیماری کی ایک تکلیف میں مبتلا تھا۔ اعظم گڑھ پہنچ کر ہی دوسرا عالم نظر آیا

ع۔ رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر!

رودلی کی ضرب المثل مہمان نوازی اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر دیسینہ کی میزبانی کا گوشہ چشم دوسروں کے لیے وقف! چابک سواران ایک طرف مسکین گدا ایک طرف۔ فجر کی چاے اشراق تک نہ ملی تو قدرتی قبض شدید ہو گیا جس کی تکلیف کئی دن تک رہی۔

واپسی میں جب اسٹیشن گیا تو ٹکٹ تو سیدھے کہاں ملتا گاڑی آئی تو بجائے پلیٹ فارم کے زمین دوز پٹری پر رکی۔ اب سوار زمین سے اچک کر سوار ہونے کی اور کیا صورت تھی۔ آدمی جو ساتھ تھا درجہ کے اندر سے دستگیری کی اور مولوی نعیم نے نیچے سے سہارا دیا جب جا کر مشکل آسان ہوئی۔

خیر جو نوشتہ تقدیر تھا ہو کر رہا اس ''شکوہ'' کے ''جواب شکوہ'' کی ہرگز ضرورت نہیں نہ گرم نہ نرم۔ درخواست صرف آئندہ کے بارے میں ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں مہمان خانے کا کمرہ

خصوصی میرے لیے مخصوص رہتا تھا. اب اس کی بحالی پھر کردی جائے سوا اس کے کہ ڈاکٹر محبوب صاحب آجائیں. ملازم انشاءاللہ ساتھ لایا کروں گا اور ساتھ ہی تھرماس بھی چاہے رات میں بند کر کے اس میں رکھ لیا کروں گا۔

لیجیے ایک معاملہ ذکر کرنے سے رہ ہی گیا. آپ تو رخصت ہو چکے تھے. میری روانگی سے کوئی پون گھنٹہ قبل مدرسہ بلیریا گنج کے کوئی پچاس طلبہ کا گروہ ایک مدرس کی قیادت میں حملہ آور ہوا فرداً فرداً دست بوسی، متعدد کاپیوں پر دستخط، تقریر پر اصرار وغیرہ، غرض ہر وہ فرمایش جو ہجوم اپنے لیڈروں سے کرتا رہتا ہے ع

دیے داغ نے امتحان کیسے کیسے

والسلام

عبدالماجد

(ص:۱۶۶)

مکتوب بنام جناب شہباز حسین صاحب

(مکتوب الیہ نے مولانا سے اپنے حالات زندگی لکھ کر بھیجنے کی فرمایش کی تھی)

مکرم نیاز کیشاں! وعلیکم السلام

حکم نامہ پہنچا حیرت ہی ہوگئی. ایک بے کمال کیسے باکمالوں کی بزم میں قدم رکھے اور اپنی ''داستانِ حیات'' ہنرمندوں کو سنائے.

لیکن بہرحال فرمایش ایک ''شہباز'' کی زبان سے ہوئی ہے. ''کنجشک'' غریب میں تاب وتوانی کہاں کہ سرتابی کرے. انشاءاللہ تعمیل جوں توں ہو کر رہے گی ہفتہ عشرہ کی مدت میں۔

والسلام دعا گو دعا خواہ

عبدالماجد

(ص:۱۶۹)

مولوی صبغۃ اللہ شہید صاحب انصاری

بردرام! وعلیکم السلام

مدت دراز کے بعد آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا الحمد للہ

آپ نے سب سے پہلے اس نیاز مند کو یاد فرمایا	جزاک اللہ
نورِ بصارت کا اعادہ مبارک ہو	ماشاء اللہ
نورِ بصیرت بھی بڑھے گا	انشاء اللہ
آپ کی آنکھوں کے نور کے ساتھ ساتھ میرے دل کو سرور ہوا	سبحان اللہ
قصد سفر ڈھاکہ مبارک ہو	بسم اللہ
کہیں کسی شیطان کی نظر بد نہ لگ جائے	لاحول ولاقوت الا باللہ

والسلام

عبدالماجد

(مکتوباتِ ماجدی جلد دوم ص:۲۹۳)

برادرم! السلام علیکم

آج کل فسانہ آزاد دیکھ رہا ہوں. وقت جس دن چھین جھپٹ کر مل جاتا ہے اور خاصا لطف اس سے لے رہا ہوں. سرشار کو زبان پر قدرت غیر معمولی حاصل ہے. نئے محاورے نئی نئی ترکیبیں خدا معلوم کتنی اس سے سیکھ رہا ہوں. پڑھتے پڑھتے خیال آپ کی طرف گیا اور بلا تصنع وتکلف وہ خیال ظاہر کئے دیتا ہوں. آپ خود کیوں نہ ماشاء اللہ اپنی زبان دانی اور طلاقتِ لسانی سے کام لیں. اور ایک افسانہ یا داستان مختصر وقلیل الحجم سی اسی طرز وانداز میں لکھ دیں کچھ زیادہ محنت ودماغ سوزی بھی اس میں کرنا نہ ہوگی. پلاٹ وغیرہ کے لیے فکر نہ کیجیے. خود سرشار کے ہاں پلاٹ بیحد غیر مربوط رہتا ہے. بس محض زبان کے سہارے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لکھ ڈالئے.

وکٹوریہ پارک کی سیر، درگاہِ شاہ مینا کی ایک شام، بارہ دری قیصر باغ کی محفل، باغ مُلّا انور کا ایک منظر، امین آباد میں سڑک گشت، حسرت موہانی کے ساتھ چند گھنٹے، مجذوب کی یاد اس قسم کے بیسیوں عنوانات ہو سکتے ہیں. ایک چیز یادگار آپ کے قلم کی رہ جائے گی۔

والسلام دعا گو ودعا خواہ

عبدالماجد

(ایضاً ص:۲۸۳)

(یہ خط کس کے نام ہے معلوم نہ ہو سکا)

کرم گستر! وعلیکم السلام

ہدیۂ گرامی موصول ہوا۔ جزاک اللہ۔ تیل اور سرمہ کا عطیہ ''سرآنکھوں'' پر۔ شافی برحق دونوں میں شفا بخشے۔

والسلام دعاگو و دعاخواہ
عبدالماجد

(صدق جدید ۱۲؍جنوری ۱۹۶۷ء)

بنام مولانا عبدالباری صاحب ندوی

برادرم! السلام علیکم

ابھی تک تو یہی علم ہے کہ حضرت گیلانی تشریف لائے ہیں اور دوشنبہ کی شام کو دہرہ سے لکھنؤ پہنچیں گے میں ان کو آپ ہی کے بھروسے پر فوراً لکھنؤ جانے دے رہا ہوں یعنی جس طرح گیلانی سے لانے کی ذمہ دار، میاں مکارم تھے اسی طرح انھیں واپسی میں دریابادپہونچانے کے ذمہ دار جناب والا ہیں ڈر یہی لگا ہوا ہے کہ انھیں لکھنؤ میں دیر لگے گی اور گھبرا کر آخر میں وہ سیدھے وطن ہی کا رُخ کریں گے۔۔۔۔ تشبیہ ناقص وگستاخانہ سہی لیکن بہرحال ہے لگتی ہوئی کہ بن یامین کی بہ حفاظت واپسی کے لیے پیغمبر یعقوبؑ یہودا سے عہد لے رہے ہیں۔

والسلام
عبدالماجد

(مکتوبات ماجدی جلد دوم ص:۹۳)

برادرم! وعلیکم السلام

شہد کی پہلی عنایت اشرفی رنگ کی تھی۔ یہ مکرر عنایت بے شان وگمان (بلکہ خلافِ گمان) ٹھیک حسین احمدی رنگ کی ہوئی۔ مسرت وشکرگزاری کے احساس پر شرمندگی غالب رہی۔ قند مکرر تو سنا تھا۔ عسل مکرر، کا مزہ خود چکھنے میں آ گیا۔

والسلام
عبدالماجد

(ص:۲۱۸)

بنام قطب الدین احمد صاحب

عزیزی سلمہ! السلام علیکم

شہد کے سے لطیف ونفیس تحفے کا یوں ہی کیا کہنا پھر اس میں لانے والے کے خلوص کی شیرینی حل ہوگئی ہو نور علیٰ نور۔ بہر حال وہ بوتل ایک عرصے تک انشاءاللہ شیرینی حیات بخش رہے گی۔

دعا کو

عبدالماجد

(ص:۳۸۰)

بنام مولانا اویس صاحب ندوی نگرامی

برادرم سلمہ اللہ! وعلیکم السلام

انشاءاللہ کتاب تکمیل پر بہت خوب ہوگی لیکن دیکھیے وہ دن کب آتا ہے!

کون جیتا ہے تیرے زلف کے سر ہونے تک

مسودے کو دیکھ کر حسرت ہی رہی کہ استفادہ نہ کر سکا! ابھی تو تخم ریزی زمین میں ہو رہی ہے۔ پھل کیا معنی کچے پھل ہاتھ آنے کی منزل بھی ابھی کتنی دور ہے۔

اللہ ہی کی طرح اُس کا کلام بھی بے شمار جہات کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ سیکڑوں ہزاروں بہترین کام کرنے والے کام کر گئے اور کام کی ضرورت پھر بھی باقی ہی چلی جاتی ہے اور اللہ میاں ہر دور میں جس سے بھی چاہیں اپنے کلام کی خدمت لے ہی لیتے ہیں۔ آپ جیسے پڑھے لکھوں کا ذکر نہیں مجھ جیسے بے علم سے بھی۔

والسلام دعا کو ودعا خواہ

عبدالماجد

(جلد سوم ص:۶۸)

برادرم! السلام علیکم

جی بہت چاہتا تھا کہ ۱۵ر کو رخصت کرنے کی سعادت حاصل کرلوں، لیکن عین اسی وقت اردو کی ایک سرکاری کمیٹی کا جلسہ جے پور میں ہوگا لکھنؤ ۱۶ر سے قبل پہنچنا ممکن ہی نہیں

دیدۂ سعدی ودل ہمراہ تست

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

دعاؤں میں جہاں اور جب بھی یاد پڑ جاؤں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا تبرکات کے سلسلے میں بڑی تمنا آبِ زمزم کی شیشی کی رہا کرتی ہے. بشرطیکہ بے تکلف اور بلا کسی زحمت کے ممکن ہو فرمائش کرنے والے بیشمار ہوں گے۔

والسلام دعا گو ودعا خواہ

عبدالماجد

(ص:۸۳)

بنام مولوی سید رئیس احمد جعفر ندوی کراچی

برادرم! السلام علیکم

انگریزی تفسیر کی دیکھیے کب تک نوبت آتی ہے. اس زندگی میں تو اب مجھے توقع رہی نہیں. عمر نوح کہاں سے لاسکتا ہوں. صبرِ ایوب بھی ممکن نہیں. گریۂ یعقوب البتہ بس میں ہے۔

پچھلے خط میں آرزوئے ملاقات والے فقرے نے تڑپا دیا. اب میں کیا کہوں. اِدھر سے اشتیاقِ ملاقات کا کیا درجہ ہے لیکن اس سے عمر بھر کے لیے مایوسی ہے. نہ کبھی پاس پورٹ وغیرہ کی مصیبتیں ختم ہوں گی اور نہ کبھی آرزو پوری ہو سکے گی۔

عبدالماجد

(ص:۱۲۲)

برادرم سلمہ اللہ! وعلیکم السلام

سیتاپور میرے لیے مقام مقدسہ میں داخل ہے. پچھلے ہفتے ڈیڑھ دن کے لیے شوقِ زیارت کر آیا مہمان نادم سیتاپوری کا رہا. میر مظہر حسین مرحوم کی کوٹھی میں قدم پورے پچاس برس بعد رکھا. اللہ اللہ بچہ تھا اور اب پیرِ نابالغ.

اس کوٹھی مرحومہ پر جا کر حسرتوں کا مزار دیکھا. دل خون کے آنسو رویا. جہاں والدہ ماجدہ

تہجد، فجر، اشراق کے سجدے کرتی رہتی تھیں جہاں والد ماجد لوگوں سے ملتے ملاتے تھے ۸ سے ۱۸ سال کے سن تک پورے دس کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

اسکول کے اُن لڑکوں سے ملا جو اب ستر کے ہیں اور چودہ پندرہ برس کی عمر میں خوش روئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ع

حسن ہے بے وفا بھی فانی بھی

اور میں خود بھی اس وقت کیا تھا!

ماسٹر ایوب بھی ساتھ ساتھ تھے۔ قضیارہ سیتاپور میں آپ لوگوں کے کھنڈر دیکھے۔ خیر آباد بھی کھڑی سواری ہو آیا۔ کاشانۂ ریاض کے سامنے سے گزرا تو موٹر آہستہ کر لی کہ حسرت کو اپنی زندگی کے لیے بجائے دو چار سکنڈ کے لیے ایک آدھ منٹ کی مہلت نصیب ہو جائے۔

والسلام دعا کو

عبدالماجد

(ص:۱۳۶)

عزیزم! السلام علیکم

آپ کے انشاء پرداز ہونے کا قائل نہ تھا، آج ہو گیا۔ ثقافت جولائی نمبر کے ابتدائی صفحات پڑھ کر۔

سبحان اللہ
ماشاء اللہ
جزاک اللہ

داد و تحسین کے تینوں صیغے بہ یک وقت گردان کے قابل

والسلام دعا کو

عبدالماجد

(ص:۱۵۵)

بنام مولانا مناظر احسن گیلانی

مخدوم ومکرم! وعلیکم السلام

سوانح قاسمی بھی وقت سے پہونچ گئی تھی. کم فرصتی کا یہ عالم ہے کہ کمالِ اشتیاق کے باوجود پڑھنے میں آٹھ دس دن لگ گئے. جی ہاں آپ کے قلم کی روانی کا کیا کہنا ماشاء اللہ ایک اُبلتا ہوا دریا ہے. اور اسے چاہے کوئی کچھ سمجھے لیکن میں تو محلِ مدح میں کہتا ہوں کہ آپ نے دماغ خاص یوروپین پایا ہے. قیاس در قیاس انبساط کو کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے. مولوی محمد یعقوب غریب کو کیا خبر ہوسکتی تھی کہ ان کی مختصر المعانی کی شرح ستر سال بعد اتنی ضخیم ومطول لکھی جائے گی. میرے لیے سب سے زیادہ مؤثر وہ حصے ہیں جہاں آپ نے مولانا کی سادگی اور خود فنائی دکھائی ہے۔

والسلام دعا کو دعا خواہ

عبدالماجد

(ص:۱۵۹)

بنام مولانا ابوالحسن علی ندوی

برادرم سلمہ اللہ! السلام علیکم

مولوی سید اختر علی تہلری وشیعی آپ سے ملنے کے آرزومند تھے. آپ کی عربی ادبیت کے بہت قائل ہیں. عجب نہیں، اس وقت تک مل لیے ہوں. میرا تجربہ تو اُن کے متعلق اچھا ہے. لیکن میری نہ کہیے، میرا تجربہ تو متعدد شیعوں احمدیوں اور دوسرے مذہبوں سے متعلق بہت اچھا ہے.

حسن نایاب میں اکبر کی سند ٹھیک نہیں
وہ تو ہر ایک کم سن کو پری کہتے ہیں

والسلام دعا کو دعا خواہ

عبدالماجد

(ص:۲۱۵)

فصل دوم

دلدوز تعزیتی مکتوبات

دل شکستہ ماں کے نام

عزیزہ سلمہا! دعائیں

دیکھتے دیکھتے آج گے دن ہوگئے، اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو خاک میں دفن کیے ہوئے، نازوں سے پالے ہوئے نورِ نظر کو قبر میں اتارے ہوئے۔ اور اللہ کی امانت اللہ کو واپس کیے ہوئے! جس کی جدائی چند گھنٹوں کو بھی گوارا نہ تھی۔ اسے یوں نظر سے اوجھل ہو جاتے ہوئے گے دن کیا معنی، ہفتوں پر ہفتے سالوں پر سال۔ ساری عمر اس طرح پلک جھپکتے کٹ جائے گی اور پھر جب ماں باپ کا بلاوا اللہ کی رحمت سے آئے گا تو استقبال کو پیشوائی کو ہاتھوں ہاتھ لینے کو یہی نورِ نظر موجود ہوگا۔۔۔۔ خون اور کیچڑ میں لت پت نہیں نور کے پانی سے دھلا ہوا نکھرا ہوا، جنت کی خوشبوؤں میں بسا ہوا۔

اس وقت کے شوق و اشتیاق کا، جوشِ مسرت کا کوئی اندازہ آج نہیں ہوسکتا۔ کوئی لفظ اس بے پایاں خوشی کو بیان ہی نہیں کرسکتا، اس کا اندازہ تو بس اسی وقت ہوگا اور دل بے اختیار پکار اٹھے گا کہ اس نعمت کے آگے اس دنیوی صدمہ کی ہستی کیا تھی۔ عمر بھر کی ساری لذتیں ہر قسم کی مسرتیں اس ایک گھڑی پر قربان کردینے کے قابل نکلیں گی۔۔۔۔ سعید نام ہی کا نہ تھا، واقعی سعید و صالح تھا اور اس کے سعید و صالح ہونے کی قدر تو اس وقت ہوگی۔

آج ہی ایک قولِ غوثِ اعظم حضرت شیخ جیلانیؒ کا نظر پڑا! اور جی میں آیا کہ تمہیں سنادوں۔ فرماتے ہیں کہ اللہ اپنے بندۂ مومن کی آزمائش اس کے درجۂ ایمان ہی کے مطابق کرتا ہے۔ یعنی جس کا ایمان جتنا بڑھا ہوا ہو اتنی ہی سخت اس کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور خود حدیث رسول میں بھی یہ

مضمون آیا ہے کہ سب سے بڑھ کر کڑی آزمائش پیمبروں کی ہوتی ہے پھر جو جتنا اونچے مرتبہ کا ہوتا ہے درجہ بدرجہ اس کی۔۔۔۔ یہ ارشاد سچ ہے تو تمہیں مبارک ہو کہ تمہارا ایمان اللہ کے یہاں اس درجہ کا پایا گیا کہ اس کی آزمائش بھی ایسی سخت رکھی گئی۔ یہ آزمائش جو تمہاری ہوئی تو کوئی معمولی ہوئی؟ جوان صالح اور ہر طرح ہونہار اور تندرست لڑکے کا اور پھر بالکل یک بیک منٹوں کے اندر اٹھ جانا کوئی معمولی بات ہے؟

رہے وہ اختلاجی دورے جو تمہیں پڑے، وہ تمہارے بس اور اختیار کی چیز نہیں اس لیے یہ دورے بھی اجر گھٹانے والے نہیں اجر بڑھانے والے ہیں۔ اچھا ہوا کہ جا کر قبر دیکھ آئیں اور کچھ نہ کچھ تسکین حاصل کر آئیں۔ وہ مرحوم تو اب دوسرے ہی عالم میں ہے جو ہر طرح گل وگلزار ہے۔ خدانخواستہ کہیں قبر کے اندر تھوڑے ہی ہے۔ قبر کے اندر تو محض بے جان جسم رہتا ہے جیسے میلے کپڑے اتار کر کہیں ڈال دیے جاتے ہیں۔

بس چند باتوں کا خیال رکھو تو انشاءاللہ نفع ہر طرح رہے گا۔

(۱) نماز اور قرآن مجید پڑھ پڑھ کر مرحوم کے حق میں دعائیں کرتی رہو۔

(۲) کلمۂ طیبہ اٹھتے بیٹھتے وضو باوضو ہر حال میں جتنی تعداد میں بھی ممکن ہو پڑھے جاؤ۔

(۳) ادائے قرض فرض عین ہے اور اسے معمولی اور ہلکی بات نہ سمجھو، جیسا کہ اکثر لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ سوال اس طرح فرض نمازوں اور روزہ وغیرہ کی بابت ہوگا، قرض لے کر جلد سے جلد واپس نہ کرنے کی بابت بھی ہوگا۔ اس لیے ہر ممکن کوشش وتدبیر ادائے قرض کی کیے جاؤ۔ اس میں غفلت نہ ہونے پائے اور جب فکر ہر وقت چوبیسوں گھنٹے سوار رہے گی تو اللہ بھی برکت دے گا۔ اس اہم ضرورت کو ساری ضرورتوں پر مقدم سمجھو۔

والدعا

عبدالماجد

(۱۹۸)

غم زدہ بہن صاحبہ! السلام علیکم

اولاد کی موت تو بچپن ہی میں صبر آزما ہوتی ہے نہ کہ اس سن والی کھاتی کماتی صاحبِ اقبال اولاد کی۔۔۔۔اور پھر جب کہ والدین بھی اس سن کو پہنچ چکے ہوں! یہ آزمائش ہی نہیں بلکہ بہت بڑی اور سخت کڑی آزمائش ہے۔آزمائش ماں باپ، بیوی کی سب ہی قریبی عزیزوں کی ہے۔ماں کا نمبر قدرۃً سب سے بڑھا ہوا ہے لیکن اجر اور اجر بے حساب ملنے کا وقت آئے گا تو یہی اجڑی کوکھ والی ماں ہی سب سے آگے ہوگی۔

کل کی نعمتوں اور راحتوں، لذتوں کے مقابلہ میں آج کی بڑی سے بڑی مصیبتیں ایسی ہی معلوم ہوں گی جیسے جاگنے کے بعد کوئی پریشان خواب یاد آجائے۔جس طرح یہ دنیائے بے ثبات و بے حقیقت کے دن چٹکی بجاتے گزر جاتے ہیں۔اس پر پورا یقین اور اطمنان رکھیے اور یہ سمجھے رہیے کہ جس نے امتحان لیا ہے وہ خود آپ کے ظرف سے پوری طرح واقف ہے اور اللہ ہی جانے کہ وہ آپ کے درجے اور رتبے کتنے بڑھانے والا ہے۔

ہر عزیز اپنے اپنے درجۂ تعلق کے لحاظ سے ایسا ہی انعام پانے والا ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے فانی انعاموں میں موجود نہیں۔اس تسلی نامہ کو سرسری و بے حقیقت نہ سمجھیے اس کو دل میں اتاریئے اور اس کا نتیجہ انشاء اللہ خود ہی جلد دیکھنے میں آجائے گا۔جس نے وقت ڈالا ہے وہی آسانی سے کاٹ بھی دے گا۔غم و تعزیت اور ایصال ثواب میں ہم سب شریک ہیں۔

والسلام

عبدالماجد

(ص:۳۰۰)

غمزدہ باپ کے نام

برادرم سلمہ! السلام علیکم

معصوم اولاد کسی کی بھی ہو خصوصاً کسی عزیز کی جب اس کی وفات کی خبر سنتا ہوں تو بجائے تعزیت کے دل بے اختیار اسے مبارک باد پیش کرنے کو چاہتا ہے۔۔۔۔حدیث نبوی میں بشارتیں

ہی اس معصوم اور اس کے والدین دونوں کے حق میں ایسی ایسی پڑھ چکا ہوں! ماں باپ کی مغفوریت کا تو کہنا چاہیے اس کے بعد بیمہ ہی ہو گیا! انشاء اللہ وہ معصومہ اپنے والدین کی انگلی پکڑے انھیں دوڑتی، گھسیٹتی، ہنستی، کھیلتی اپنے ساتھ جنت میں لے جائے گی! وہ جنت جس کے سامنے آج کے غم کا بڑا سے بڑا پہاڑ بھی کوئی ہستی نہیں رکھتا. بہر حال فوری طور پر غم وحزن سے متأثر ہونا بھی ایک امرِ طبعی بشری ہے اور اگر تأثر اس درجے کا شدید قدرت نے نہ رکھ دیا ہوتا تو پھر یہ اجر لامتناہی بھی کاہے کو ہوتا؟

سب سے بڑی تسلی اپنے اور سب کے ہادی اعظم کے نمونے سے حاصل کیجیے. آخر اس ذات اقدس کو بھی تو اپنی معصوم اولاد کا جسم اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارنا پڑا تھا اور غم کے آنسو بھی اس چشم مبارک سے بہے تھے! مبارک ہیں وہ امتی جنہیں اپنے رسول کی گزری ہوئی منزلوں سے خود بھی گزرنا پڑے۔

والسلام دعا گو
عبد الماجد

(ص:۲۱۱)

برادرم! السلام علیکم

واسطہ در واسطہ آپ کے یہاں سانحہ کی خبر مجھ تک بھی پہنچی اور دل دھک سے ہو کر رہ گیا. سانحہ بجائے خود بھی کم نہ تھا. پلے پلائے، ہنستے دوڑتے لختِ جگر کا آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ جانا ماں باپ کے لیے کس درجہ صبر آزما تھا چہ جائیکہ یوں آناً فاناً چٹ پٹ دشمنوں تک کے دل دہلا دینے کے لیے کافی!۔۔۔۔ آپ لوگوں پر قیامت گزر کر رہی ہوگی. کیا کیا ارمان آپ لوگوں کے دلوں میں میں ہوں گے. پڑھنے پڑھانے کے، شادی بیاہ کے، ہر طرح کے دنیوی واُخروی فلاح وبہبود کے ۔۔۔۔ بجلی ان پر گر پڑی بے وہم وبے گمان.

ایسا کڑا امتحان تو بس عالی ظرف ہی کا لیا جاتا ہے خوش ہو جیئے کہ قسامِ ازل کی میزان میں آپ عالی ظرف پائے گئے. اور اس وقت کی خوشی کا تو کہنا ہی کیا جب وہ معصوم روح ہنستی کھیلتی ہوئی آپ کو اس عالم میں لے جانے کے لیے استقبال کو آئے گی اور پھر دوبارہ مچلتی ہوئی جنت میں آپ کو

گھسیٹتی ہوئی لے جائے گی۔اس وقت رشک کریں گے آپ کے نصیب پر دوسرے اور نصیبہ پر آپ خود۔

والسلام
سوکوار عبدالماجد

(ص:۳۶۳)

الم نصیب بیوہ کے نام

عزیزہ سلمہا! دعائیں

بادشاہت گئی اور آناً فاناً گئی بجلی گری اور یک بیک گری۔نازوں میں پلی ہوئی شوہر کی ناز برداریوں میں بسی ہوئی خوش نصیب، خوش حال سہاگن دم کی دم میں رانڈ دکھیا ہو کر رہ گئی!

آزمائش، کڑی آزمائش ہر بیوہ کی ہوتی ہے تمہاری آزمائش اتنی بڑی اتنی کڑی ہوئی کہ عجب نہیں فرشتوں کے بھی دل دہل گئے ہوں۔خود تمہارے ماں باپ پر ہزاروں میل دور یہ خبر سن کر کیا گزر گئی ہوگی ایمان اور عقیدہ کے امتحان کا اصلی وقت یہی ہے۔تسکین وتسلی کا سہارا یہی ایمان ہوتا ہے۔یہ نہ بھولنے پائے کہ جس نے یہ وقت ڈالا ہے، وہ سب سے زیادہ رحم دل ہے اس کے ہاں سے کسی ظلم کا امکان ہی نہیں۔خدا جانے اسے کیا کیا درجے تمہیں دینا منظور ہیں۔آج ان مرتبوں کا اندازہ بھی نہیں ہوسکتا جس طرح ابھی کل تک کوئی انسانی دماغ اس حادثہ کا بھی اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔

مرحوم کے ساتھ معاملہ جو بھی ہوتم تو بہر حال بے قصور و بے گناہ مظلوم ہی مظلوم ہو اور حشر میں مظلومیت کی سفید چادر اوڑھے بے کسی کے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ فریادرسی بن کر پیش ہوگی تو دیکھنا کہ کیسے کیسے انعاموں سے سرفراز ہوتی ہے! کیسی کیسی دولتوں سے جو آج تمہارے تصور میں بھی نہیں آسکتیں تمہیں مالا مال کیا جاتا ہے۔یقیناً تمہارا ظرف بہت اونچا سمجھا گیا جب ہی اتنا بڑا بار تمہارے اوپر ڈالا گیا، یہ مرتبہ ہر ایک کو نہیں نصیب ہوتا۔آج لوگ تمہارے اوپر ترس کھاتے ہیں کل سب رشک کریں گے انشاء اللہ۔

زخم کا ٹھنڈا مرہم بس عقیدہ اور ایمان ہے۔اس دنیائے فانی کی بڑی سے بڑی بھی لذتیں گے

دن کی راحتیں اور لذتیں تو بس آخرت میں ہیں جس طرف ہم سب کیا بوڑھے کیا جوان دوڑتے لپکتے ہوئے چل رہے ہیں لڑکیاں اور ان کی والدہ سب اڑ کر تم تک پہنچنا چاہتی ہیں کل شام کو جب اخبار میں خبر پڑھی تو پہلے تو مجھے خود ہی یقین نہ آیا اور پھر جب ان لوگوں کو سنایا تو گویا سکتے میں آ گئیں۔۔۔۔ٹریجڈ جی ہے ہی اتنی سخت کہ اپنے تو اپنے بیگانوں کے بھی دل لرز گئے۔

دعا کو

عبدالماجد

(۲۴۴)

مغموم شوہر کے نام

برادرم! السلام علیکم

خانہ ویرانی کی اطلاع کل شام کو ملی۔ انا للہ۔

آپ ماشاء اللہ قرآن مجید سے اپنا تعلق جوڑے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ اس کڑی آزمائش کے وقت آپ کے ہر کام آئے گا اور آپ کا صبر و سکون برقرار رہے گا ورنہ طبعی حیثیت سے جو کچھ آپ پر گزر جائے تھوڑا ہے۔ جو چیز چلی گئی وہ اپنی تھی ہی کب؟ وہ تو جس کی تھی بس اسے کے پاس چلی گئی۔ ہم خود اپنے کب ہیں؟ انا للہ۔ نہ ہم خود اپنے نہ ہماری کوئی چیز اپنی خود ہمارا اور ہماری سب چیزوں کا مالک تو کوئی اور ہی ہے۔ نہ بیوی اپنی، نہ بچے اپنے، نہ جان اپنی، ہم سب آگے پیچھے بس ایک ہی مالک و مولیٰ کی طرف رواں دواں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

سالہا سال کی رفاقت ہمہ وقتی، ہمہ جہتی رفاقت کا ایک دم سے ٹوٹنا یقیناً قلب بشری کے صدمہ و شدید اذیت کا باعث ہوتا ہے لیکن ذرا اس حقیقت کا استحضار کر لیا جائے کہ منزل مقصود جب سب کی ایک، راستہ بالکل وہی تو اس سے کیا بڑا فرق پڑتا ہے کہ فلاں صبح کی ٹرین سے روانہ ہوا اور فلاں دوپہر کو۔

مالک و مولیٰ کو اجر بے حساب دینا منظور ہوتا ہے اور اس کا محض بہانا اسی طبعی غم و صدمہ کو بنا لیتے ہیں ورنہ اجر اعظم و دائمی کے انبار اور اس عارضی و فانی دنیا کے آنی و فانی غم کا مقابلہ ہی کیا؟

نیم جاں بستاند وصد جان دہد

امتی کو تو عقلاً یہ خوش ہونے کا موقع ہے کہ اُسے سنتِ خدیجہؓ و مصطفیٰؐ کے اتباع کا مرتبہ اضطراراً نصیب ہو گیا۔ اللہ ہر طرح صبر جمیل نصیب کرے آپ کو بھی اور بچوں اور بچیوں کو بھی۔ ایسی ایسی کڑی آزمائش میں ڈال کر اب کوئی کیا بتائے کہ اس کے لیے کیا سامان لطف وسرور دائمی تیار ہو رہے ہیں؟ یہ دولت عالی حوصلہ وعالی ظرف صابروں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ **وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔۔۔** تعزیت میں سارا گھر بھر شریک ہے۔

والسلام دعا کو

عبدالماجد

(ص:۲۷۳)

عزیزم سلمہ! السلام علیکم

ہماری آصفہ تو خوب ہلکی پھلکی اپنے وطنِ اصلی کو روانہ ہو گئی۔ ہم معمر لوگوں کی طرح بوجھل بننے کا انتظار نہ کیا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**۔ اس دنیا میں زیادہ جی کر بجز اس کے حاصل کیا ہے کہ غم اور صدمہ ہی روز اور سہنے کو ملیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہلکے پھلکے روانہ ہو جاتے ہیں۔

آں عزیز کے دل کو صدمہ جس درجہ کا بھی پہنچا ہو بالکل قدرتی ہے۔ بیوی اور پھر اچھی بیوی پیاری اور محبوب بیوی زندگی کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے جس کا بدل ممکن نہیں۔ یاد اس مرحومہ کی بات بات پر آئے گی۔ اور خون کے آنسو رلائے گی، لیکن خوب یاد رہے کہ اجر بھی ٹھیک اسی درجے کا ملے گا۔ امتحان جتنا سخت ہوتا ہے انعام بھی اسی مناسبت سے ملتا ہے۔

ماں، بہنیں چاہنے والا شوہر سب پر کیا کیا گزری ہوگی، سب سے بڑا مسئلہ بچوں کے سنبھالنے کا ہے خاص کر سب سے چھوٹے بچے کا، اللہ ہی یہ بیڑا پار لگائے گا۔ یہاں خبر کل دوپہر کو پہنچی۔ اس وقت سے رات تک برابر خیال مرحومہ ہی کا بندھا رہا اب غسل ہو رہا ہوگا اب تکفین ہو رہی ہوگی۔ اب جنازہ چلا ہوگا، اب نماز ہو رہی ہوگی۔ اب تدفین کا وقت ہوگا ظہر اور عصر کی نمازوں کے بعد خیال کر کے دعائے مغفرت کی توفیق ہو گئی۔

ہر انسان سے کتنے حق ادا کرنے رہ جاتے ہیں. اللہ کے بھی بندوں کے بھی. مرحومہ کے ساتھ دوستی یہی ہے کہ ان کے حقوق کو ادا کر دیا جائے یا انھوں معاف کرالیا جائے حقوق اللہ (مثلاً نماز، روزہ چھوٹ جانے) کی حد تک تو معاملہ آسان ہے محض استغفار کافی ہو جاتا ہے بندوں کے حقوق کا معاملہ ذرا دشوار ہے. اس کی طرف فوراً توجہ ہونی چاہیے. سابقہ میں جس کسی کے بھی حقوق باقی رہ گئے ہوں وہ تو فوراً ادا کر دیئے جائیں (کسی کا قرض، کسی کی مزدوری) وغیرہ. رہے زبان اور ہاتھ پیر کے حقوق (کسی کی بیجا مار یا بدزبانی وغیرہ) تو انھیں بھی صاحب معاملہ سے معاف کرالیا جائے. یا انھیں کچھ دے دلا کر راضی کر لیا جائے بس ان مراتب سے فارغ ہو کر جنت ہی جنت، راحت ہی راحت ہے. ایسی راحت جس کا دنیا میں تصور نہیں ہو سکتا۔

موت کو لوگوں نے ہوّا بنا رکھا ہے. یہ ہرگز کوئی عذاب یا بری حالت نہیں. جو منزل پیمبروں تک کے لیے ناگزیر رکھ دی گئی ہے وہ بری کیوں کر ہو سکتی ہے یہ تو مادی آلائشوں سے آزاد ہونے اور روح کے اپنے جوہرِ لطیف کی طرف رجوع ہونے کا کامیاب وقت ہوتا ہے. ہر مسلمان کے لیے سرتا سر برکت و رحمت. طبعی طور پر جدائی کا قلق تو ہوتا ہی ہے اور ہونا چاہیے بھی. باقی عقلی طور پر مسرت و ادائے شکر کا موقع. وہاں جس جس سے ملاقات ہو رہی ہوگی اس خوشی کا اندازہ دنیا کی عام خوشیوں سے کوئی مقابلہ نہیں.

جدائی کتنے دن! بات کہتے ہی مدت ختم ہو جائے گی. اور ہر عزیز کے ساتھ دائمی وصال نا قابل انفصال! اصل رشتہ تو وہیں کا ہوگا۔۔۔۔ یہ دنیا کا بودا کمزور تار عنکبوت کا سا رشتہ بھی کوئی رشتہ ہوتا ہے! اور آں عزیز نے تو طویل تیمارداری میں خدا معلوم کتنے مجاہدے کر لیے اور اپنی تربیت و تزکیہ روح کے مراتب طے کر لیے. بارہا اپنے فن پر جھنجھلانا اپنے اور اپنے ساتھیوں کی کسی تدبیر کسی مخلصانہ کوشش کا کام نہ آنا، مرحومہ کی تکلیفوں کو ذرا بھی کم نہ کر سکنا. یہ سارے اپنی بے بسی کے مشاہدے بے کار نہیں کرائے گئے. سب کچھ انھیں کے اندر آ گیا راحتوں، لذتوں، بے اندازہ مسرتوں کے یہ جوہری خزانے جب جنت میں پوری شدت اور قوت کے ساتھ کھلیں گے تو اس وقت حسرت ہوگی کہ ان کا ذخیرہ اور زیادہ کیوں نہ ہوا. مالک و مولا کی بے پناہ شفقتوں اور بے اندازہ احسانات کا اندازہ ہی آج کون

کرسکتا ہے۔

والسلام دعا گو
عبدالماجد

(ص:۳۳۶)

متفکر بیٹے کے نام

عزیزی سلمہ! وعلیکم السلام

کیا کہوں کہ خبر صاعقہ اثر سن کر دل پر کیا گزر گئی۔ بہر حال جو مشیت تھی وہ پوری ہو کر رہی اور رسول کا سیرت نگار اپنے خدا کے حضور میں مزد وانعام سے سرفراز ہونے کے لیے حاضر ہو گیا۔ اس کے انعامات و سرفرازیوں کا کیا ٹھکانا ہم دنیا والے تو اندازہ بھی نہیں کر سکتے ۔۔۔۔لیکن بہر حال ظاہری و مادی مفارقت سے صدمہ ہونا بھی انسان کے لیے ایک امرِ طبعی ہے اللہ ہم سب کو صبر دے۔ یتیم ایک خاندان نہیں، ساری ملت ہو گئی اور جس کا جتنا رشتہ اور تعلق اسی قدر اس کا غم و صدمہ بھی بالکل قدرتی ہے۔

آں عزیز اپنے دل کو یہی کہہ کر تسلی دیں کہ اس سوگ میں دو چار، دس بیس افراد خاندان نہیں لکھوکھا افراد امت شریک ہیں۔ اپنی والدہ ماجدہ کو یاد دلائیں کہ بیوگی تو عورت کے حق میں جالب رحمت و جاذب کرم ہے۔ عائشہ صدیقہ اور کتنی پاک بیبیوں کو یہی مرتبہ مل چکا ہے اس کی پوری قدر تو ''وہاں'' پہنچ کر ہو گی اور ''وہاں'' پہنچنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ اللہ ان کا سایہ مدتوں تک ان کی اولاد کے سر پر رکھے۔ لیکن بہر حال بڑی سے بڑی مدت بھی کٹتے دیر نہیں لگتی، منزل سب کی ایک ہی ہے اور سب دوڑتے بھاگتے وہیں پہنچ رہے ہیں۔

والد عا
عبدالماجد

(ص:۲۰۴)

کرم فرما! وعلیکم السلام

بے شک اس وقت آپ کا دل دُکھا ہوا ہو گا۔ اس دکھے ہوئے دل کے جذبے کو کام میں

لائیں اور اپنے اور ان مرحوم اور ساری امت کے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔۔۔۔قلب شکستہ کی دعا کا کیا کہنا لھم ما یشاء ون فیھا ولدینا مزید ہر منھ مانگی مراد حاصل بلکہ اس سے بھی سوا!

آپ ماشاءاللہ خود صاحب علم وفہم ہیں لقمان کو حکمت کون سکھا سکتا ہے. صبرِ جمیل کے لیے یہ آیۃ انا للہ وانا الیہ راجعون . کے دونوں اجزا کے معانی کا استحضار رہے. جب ہم خود اپنے لیے نہیں اللہ کے لیے ہیں تو ہمارے باپ اور بھائی اور بیٹے ہمارے ہوئے کب؟ سب کے سب اللہ ہی کی ملک. جس کی چیز تھی اس نے جب چاہی واپس لے لی اور پھر ظاہری جدائی کی مدت کتنی! ہم سب کے سب ہی ایک منزل کی طرف دوڑتے بھاگتے تو چل ہی رہے ہیں اور آگے پیچھے پہنچ ہی رہے ہیں. پھر بے صبری کاہے کی؟ یہ دونوں جس کے دل میں اُتر گئے تو پھر اسے آگے کسی صبر کی ضرورت ہی نہیں۔۔۔۔اور آپ تو خوش نصیب بھی ہیں کہ اتنا موقع آپ کو ان مرحوم کی خدمت کا مل گیا. اس سچے کا قول یاد کر لیجیے جس نے کہا ہے کہ رب کی خوشی باپ کی خوشی میں اور رب کی ناخوشی باپ کی ناخوشی میں ہے۔

والسلام دعا گو دعا خواہ
عبدالماجد

(ص:۱۷۶)

برادرم! وعلیکم السلام

والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ جانا جب، جس حال اور جس سن میں ہو بہر حال دنیا میں اللہ کی ایک بہترین نعمت سے محروم ہو جانا ہے چہ جائیکہ جب یہ حادثہ بالکل اچانک پیش آ جائے اس کی شدت کا کہنا ہی کیا. اناللہ۔

بہر حال آزمائش سخت ہوئی اور جس کے ظرف بلند ہوتے ہیں ان کی آزمائش بھی ایسی ہوتی ہی رہتی ہیں ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اور مقصود ان آزمائشوں سے ہمیشہ یسر ہوتا ہے، نہ کہ عسر. مہر ہوتا ہے یہ کہ قہر. اور مومن کی

زندگی کا یہ پہلو قابل صد رشک ہوتا ہے گو اس کی قدر معاً اور فی الفور نہ ہو فوراً تو جذبات غم والم ہی طاری رہتے ہیں اور بندہ اس پر مجبور ہے. عقلاً صبر فرمایئے اور دل میں اجر بے حساب کا حساب لگاتے رہیے، ہماری آپ کی اور کُل دنیا کی بھی عمر کتنی؟ آناً فاناً سب کی کٹ جانے والی ہے اور پھر انشاء اللہ اپنے ہر عزیز کی وہ ملاقات جس میں کبھی جدائی نہ ہوگی. مومن تو ہر حال میں مورد لطف کرم ہی رہتا ہے. گو کسی امید پر نقاب خوف کا پڑا ہوا ہو. اللہ مرحومہ کی بال بال مغفرت فرمائے اور آپ سب لوگوں کو صبر جمیل سے نوازے۔

دعا کو

عبدالماجد

(ص:۲۶۰)

رنجیدہ بھائی کے نام

برادرم! السلام علیکم

مرحوم سے ذاتی شناسائی بھی ۱۹۲۹ء میں ہوئی تھی. اور بالواسطہ تو ان کے الطاف وعنایات کا مورد تھا ہی اور آپ کے تو وہ خیر حقیقی بھائی ہی تھے۔۔۔۔خوب جانتا ہوں کہ بھائی کی محبت کے کیا معنیٰ ہوتے ہیں اور تازہ تجربہ رکھتا ہوں کہ اس نعمت کا زوال ساری زندگی کو کیسا تلخ بنا دیتا ہے. اس لیے ہمدردی بھی آپ لوگوں سے رسمی نہیں قلبی اور گہری رکھتا ہوں خانگی نظام اور کاروباری انتظام میں خلل کیا کچھ پڑ کے رہا ہوگا اور ماں غریب کا تو پوچھنا ہی کیا؟ کیا کچھ دل پر گزر رہی ہوگی۔۔۔۔لیکن انھیں بشارت دیجیے کہ ان کے مرتبے بھی کیا کیا بڑھنے والے ہیں اور درجے بھی کیا کچھ ملنے والے ہیں. اتنا سخت امتحان ہر ایک کا نہیں ہوتا، ہر ایک کا ظرف اس قابل نہیں سمجھا جاتا!

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

یقین رکھیے کہ جس درجے کی آزمائش ہوئی اسی نسبت سے ثمرہ واجر بھی. اس میں شبہ بھی نہ کیا جائے مسلمان جو اٹھ جاتا ہے بہر حال اپنے شفیق مولا و پروردگار کے پاس پہنچتا ہے ہر طرح کا انعام

واکرام وصول کرنے کے لیے۔۔۔۔اس میں غم وحزن خوف واندیشہ کی کیا بات ہے۔یہ موقع تو تبریک وتہنیت کا ہونا چاہیے!اور پھر جب کہ وہ بندہ اہل اللہ بھی ہو۔حج پر حج کرتا چلا جاتا ہو۔اور اسے بلاوا بھی پہنچے تو خاص ارضِ حرم میں! موت ہم ایسوں کے لیے قابلِ رشک!اب ملاقات انشاء اللہ جنت ہی میں ہوگی،ایسی ملاقات جس کے بعد کوئی جدائی نہیں۔۔۔۔اس نامہ سیاہ کو بھی اپنا شریکِ غم سمجھیے اور ہم لوگوں کی طرف سے تعزیت اپنے بڑے چھوٹوں سب کو پہنچائیے۔

والسلام دعا گو

عبدالماجد

(ص:۲۵۳)

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مرگ مومن کی حقیقت مجھ سے زیادہ آپ پر روشن ہے اس لیے تعزیت میں آپ سے کچھ عرض کرنا لقمان کو حکمت کا درس دینا ہے۔۔۔۔لیکن معرفت کی جس منزل پر بھی اللہ آپ کو پہنچادے بہرحال انسان ہی ہیں جیسا کہ میں انسان ہوں اور اپنے بھائی کے غم کا تجربہ حال میں اٹھاچکا ہوں۔

گوشت پوست کا بنا ہوا دل کیسے ممکن ہے کہ پتھر کا بن جائے اور جو صدمہ طبعی ہوتا ہے اس کی انتہائی تلخی اور چبھن محسوس نہ کرے۔مدتوں اور برسوں نہیں،کہنا چاہیے کہ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ آپ نے میرے بڑے بھائی کی تعزیت مجھ سے کی تھی،آج بجنسہٖ اسی منزل پر آپ خود آ گئے۔

مرحوم آپ کے لیے بھائی کی سی نہیں باپ کی سی شفقت رکھتے تھے۔اس کا مجھے علم ہے آج سب کے دلوں پر جو کچھ گزر رہی ہوگی وہ آپ ہی جانتے ہوں گے امتحان واقعی سخت ہوتا ہے،لیکن آپ تو ظرف بھی اسی قدر عالی رکھتے ہوں۔انشاء اللہ پوری طرح صبر ہی نہیں،مقامِ تسلیم ورضا پر ثابت رہیں گے اور آپ خود اپنی ذات سے مرحوم کی بچیوں اور صاحبزادے کے لیے نمونۂ استقامت کا کام دیں گے۔مرحوم کا آپ سے تو خیر خون کا رشتہ تھا میرے لیے بھی بھائی سے کم نہ تھے اور اس میں شاید کچھ مبالغہ ہو کہ جس طرح آج آپ اپنے والد مرحوم کی وفات دوبارہ محسوس کر رہے ہوں گے میں بھی اپنے بھائی مرحوم کی وفات کا صدمہ ازسرِ نو محسوس کر رہا ہوں۔

بہر حال جس کی حکمت نے یہ وقت ڈالا ہے اسی کی رحمت اسے کاٹ دے گی. اور میں اپنی کیا کہوں ایک بہترین وشفیق ترین معالج سے میں اکیلا نہیں سارا خاتون منزل کیا بڑے کیا چھوٹے سب ہی محروم ہو گئے! اور آپ کی خانگی ذمہ داریاں بھی دفعۃً کئی گنا بڑھ گئیں. جو چھوٹا تھا وہی سب سے بڑا بنا دیا گیا اور اسی کو اب خاندان کا افسر بن کر رہنا ہے. رہیں مرحوم کی دینی، ملی خدمات تو ع

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے!

انشاء اللہ اسی ہفتہ اصالۃً بھی حاضر ہو کر شرکتِ غم کروں گا۔۔۔۔ جن بچیوں کو ابھی ماں کا داغ تازہ تھا ان پر کتنی جلدی یہ دوسرا پہاڑ صدمہ وغم کا آ پڑا۔

والسلام دعا کو

عبدالماجد

(ص:۲۵۷)

عام تعزیتی مکتوبات

تعزیت لکھنے بیٹھا ہوں مگر تعزیت کروں تو کس سے کروں؟ صرف مرحوم کے اعزہ سے؟ صرف دفتر نوائے وقت لاہور سے. تعزیت کا مستحق سارے پاکستان کا پریس ہے. سارا پاکستان ہے. پاکستان کا ہر طبقہ ہے بلکہ یہ کہنا بھی داخل مبالغہ نہیں کہ سارا عالم اسلامی ہے. ایسا اخلاص اب عنقا ہے ایسا پیکر شرافت ومجسمہ انسانیت اب ڈھونڈھنے سے کہاں ملے گا؟

صبح کام کرنے میز پر بیٹھا ہی تھا کہ قیامت خیز تار کل دو بجے دوپہر کا چلا ہوا ملا. انا للہ وانا الیہ راجعون. رات ایک خواب پریشان وتکلیف دہ دیکھا تھا تعبیر کتنی جلد مل گئی. مرحوم میرے تو خصوصی مخلص ومحسن تھے. اللہ بال بال مغفرت کرے، کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے. عین رمضان اور وہ بھی اس کے عشرہ دوم کے ختم پر لقائے رب دلیل خوش نصیبی ہے. مرحوم کے اعزہ یقین رکھیں آسمان تنہا انھیں پر نہیں پھٹ پڑا ہے ان کے غم دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنے والے اور ان کی طرح سوگ منانے والے ابھی بہت سے ہیں اور انھیں میں یہ دور افتادہ بھی ہے۔

ان سطور کی تحریر کے وقت تدفین بھی ہو چکی ہوگی. کیسا دل پھڑ پھڑا کر رہا کہ کاش اڑ کر پہنچ سکتا۔۔۔۔اور اس جوان مرد کفن پوش کا آخری نظارہ اس عالم ناسوت میں کر سکتا. جا جنت کا مسافر اور اپنی خدمات کا صلہ جلد پا!

والسلام سوگوار دعا گو

عبدالماجد

(ص:۲۷۰)

(مکتوب الیہ نے اپنے بہنوئی اور دو بھانجوں کے موٹر کے حادثے سے اچانک موت کا حال لکھا تھا اس کے جواب میں مندرجہ ذیل تعزیت نامہ گیا)

عزیزم سلمہ! السلام علیکم

تازہ خط پڑھ کر دل پر جو کچھ گزری لفظ وعبارت سے اس کا اظہار دشوار ہی ہے. انا للہ ثم انا للہ. خط پڑھنا مشکل ہو گیا کس مشکل سے اسے ختم کیا لڑکوں لڑکیوں میں سے جس کسی کو اسے پڑھنے دیا سب کا یہی حال ہوا. المیہ ہوا ہی اس قدر سخت ہے کہ غیر بیگانہ بھی جو پڑھے اس کا دل بھر آئے.

اپنوں کے دلوں پر کیا کچھ بیت کر رہی ہوگی اور اب بھی بیت رہی ہوگی اس کا تو تصور اور اندازہ کرنا بھی روح فرسا ہے. بار بار اسی انا للہ کی تکرار کرنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔اکیلے بہنوئی یا داماد یا شوہر کا خود ہی ہلاکت کا صدمہ کیا کم تھا کہ اکبارگی پہاڑ پر پہاڑ ٹوٹ پڑے!۔۔۔۔معمولی اور عام بندوں کا کام تو اس درجہ شدید صدمہ کو سنبھال لے جانے کا نہیں. امتحان کس درجہ صبر آزما امتحان! ایسے امتحان تو بس کاملین اور بڑے ہی عالی ظرف مومنین کے کیے جاتے ہیں. جذبات پر جو کچھ گزر جائے عقلی حیثیت سے آپ لوگوں یعنی سارے خاندان کو مبارک ہو مشیتِ الٰہی میں آپ لوگ اتنے سخت امتحان کے اہل وقابل سمجھے گئے.

یقین کیجیے اور بلاشبہ وریب وشک یقین کیجیے کہ ابتلا جس درجہ کا ہوتا ہے صدمہ وانعام بھی اسی مرتبہ اور اسی وزن کا مرحمت ہوتا ہے. درد وغم صدمہ وحزن عارضی وفانی ہیں. جس طرح خوشی ولذت دم بھر میں ختم ہو جاتے ہیں حزن والم بھی ختم ہو جائے گا. اس کا وہ صلہ وانعام ملے گا جو کبھی ختم ہونے میں نہ آئے گا. آپ لوگوں کے ہر اندازہ ہر تخمینہ سے کہیں بڑھ کر ایسا کہ اسے دیکھ کر خود حیرت

میں غرق ہو جائیں گے اور تمنا یہ کرنے لگیں گے کہ کاش یہ امتحان اس سے بھی سخت تر ہوا ہوتا. یہ اللہ کی طرف سے وعدے ہیں. بس انھیں مستحضر رکھیے. آگے سارا بیڑا پار ہے ان سچے اور حقیقی وعدوں پر ایمان جس قدر واثق اور واضح ہوگا بس اسی درجہ میں قلب کو تسکین بھی انشاء اللہ حاصل رہے گی.

ہم سب کے سب، ہمارے مال ہماری اولاد، ہمارے گھر بار، ہمارے اعزہ، ہماری باتیں، ہماری راحتیں ولذتیں سب اللہ ہی کی ہیں اور اللہ ہی کے لیے ہیں. ہماری اپنی کوئی ملک ہی نہیں. انا للہ وانا الیہ راجعون ۔اور ہم سب آگے پیچھے چل تو اسی ایک منزل کی طرف رہے ہیں. کوئی صبح گیا کوئی شام، جدائی کیسی، بچھڑنا کا کیا سوال یا فراق کا کیا سوال. سب بے اختیار ایک ہی منزل کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

(ص:۳۱۴)

(یہ خط کوئی تعزیت نامہ نہیں لیکن مؤثر ہونے کی وجہ سے تعزیت ناموں میں شامل کرلیا گیا ہے. مکتوب الیہ مولانا دریابادی کی بیگم کے چہیتے بھتیجے تھے مولانا کو ان سے بڑی محبت تھی اور مرحومہ بھی ان کو بہت چاہتی تھی)

عزیزم سلمہ!

دو چار دن سے مرحومہ کی یاد اور زیادہ آنے لگی خصوصاً سہ پہر کے وقت بعض دن تو یہی معلوم ہونے لگتا ہے کہ میں یہاں نہیں باندے میں ہوں اور وہاں بھی گھر میں نہیں بغیا میں۔۔۔۔وہیں جہاں اپنا سب سے بڑا خزانہ راحتِ حیات کا سرمایہ اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کر آیا ہوں یہ کیسے کیا؟ وہ جسم مجھ سے قبر میں اتارا کیسے گیا؟ قبر کو بند ہوتے مجھ سے دیکھا کیسے گیا؟ جنازہ کو کاندھے مجھ سے دیا کیسے گیا؟ وہ کفن پوش، بے حس وحرکت اور خاموش جسم مجھ سے دیکھا کیوں کر گیا؟ چہرہ کے رنگ وروپ کا اندازہ تو میں نیم اندھارات میں کیا کرتا، لیکن باوقار سڈول پن کا اندازہ تو اس عالم میں بھی ہوگیا. ہائے جامہ زیبی کس غضب کی تھی کہ کفن پوشی پر پھٹی

پڑتی تھی. الوداعی نماز پڑھاتے وقت ہوش وحواس کیسے قائم رہے؟ یہ ساری اَن ہونی باتیں کیسے ہوکر رہیں؟ جدائی ۵۲ سال کی رفاقت میں کبھی پورے دو مہینے کی بھی ہوکر نہیں رہی. زیادہ سے زیادہ جو ہوئی وہ کل ۵، ۶ ہفتے کی اور وہ بھی پوری عمر میں کل دو بار. یہ مہینوں کی جدائی کا معاملہ میں کیا جانوں اسے اب برداشت کیسے کر رہا ہوں.

ہائے ان کا دل کتنی بار کس کس طرح میری وجہ سے دکھا ہے ان کی کتنی حسرتوں اور ارمانوں کا خون میرے ذمہ ہے سوچتا ہوں اور جیسے زمین میں گڑ جاتا ہوں. اللہ نے تھوڑی بہت قوت ایمانی جو بخش دی ہے (اور وہ بھی شاید خدمتِ قرآن کے طفیل میں) اس کے لحاظ سے عقلاً بحمد اللہ تمام تر صبر واطمنان ہے اور بعدِ حیات کے جو کچھ بھی آثار ظاہر ہیں ان سے پورا اعتماد مغفورہ اور جنتی ہونے کے ہیں.

تم مرحومہ کی سگی اولاد سے کم نہ تھے. اور اللہ نے آخر وقت کی ساری خدمت کی سعادت بھی تمہارے ہی نصیب میں لکھ دی تھی لڑکیوں سے بات کر کے کبھی کچھ رو دھو لیتا ہوں اور وہی اثر تمہارے نام کے خط سے ہوتا ہے. یہ جواب طلب ذرا سا بھی نہیں محض اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ہے سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ ۵۲ سال کی ساری مدت محض ایک لطیف وخوشگوار خواب تھی. بات بات کی میں کٹ گئی۔

کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہوگئی بات کی بات میں

دعا کو
عبدالماجد

(ص:۳۵۷)

(یہ خط مولانا سید سلیمان ندوی کے سانحۂ ارتحال پر مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے نام ہے)

مخدوم ومکرم! السلام علیکم

حادثۂ کبریٰ جسے سنے ہوئے آپ کو اس وقت ۲۴ گھنٹے ہو چلے ہوں گے، پر کیا لکھوں. انا للہ

ثم انا للہ . میں کل لکھنؤ میں تھا وہیں صبح سویرے یہ سناؤنی سن لی تھی. بے چارہ سیاست کان پور کی زبانی. لکھنؤ کے کسی انگریزی اخبار کو تو کیا توفیق ہوتی کسی اردو اخبار کو بھی اس وقت تک نہ ہوئی. بہرحال میرا آپ کا حال یکساں ہے۔

آ عندلیب! مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

تعزیت نامہ میں آپ کو کیا لکھوں اُلٹے آپ ہی کے قلم سے تعزیت کا مستحق ہوں. ایک ہی منزل پر ہم سب دوڑتے بھاگتے پہونچ ہی رہے ہیں. جو آگے نکل گئے ان پر صدمہ منانے کے باوجود ایک طرح کا رشک بھی آتا ہے۔

والسلام دعاگوئے مغفرت
عبدالماجد

(مکتوبات ماجدی جلد سوم ص:۱۵۶)

فصل سوم

دلچسپ علمی مکتوبات

محمد احمد غریب صاحب

برادرم! السلام علیکم

قرآن مجید کی خدمت سے تجارت ومنفعت ہرگز مقصود نہیں. جتنا قبول کر لیتا ہوں سخت شرمندہ رہتا ہوں اور اپنے کو نفرین کرتا رہتا ہوں. فقہاء نے جو گنجائش کھینچ تان کر نکالی ہے وہ وقت کی قیمت یا وقت کا معاوضہ ہے ورنہ نفس عبادت پر معاوضہ کیا. بہر حال اصل مقصود صرف اس قدر ہے کہ کوئی بڑا فرم اتنا سرمایہ تفسیر کی چھپائی میں گوارا کر لے اور مسودہ کی صفائی وغیرہ کا خرچ نکل آئے. بس قصہ ختم۔

آپ کو یہ اس لیے لکھ دیا کہ آپ کہیں بر بنائے اخلاص ومحبت کچھ زیادہ حاصل کرنے کی فکر میں نہ ہوں. پیمبروں کی شان تو ہوتی ہے وما اجری الا علی اللہ . میں دنیادار اس مرتبے کی تو گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تاہم طمع سے تو اپنے کو روک ہی سکتا ہوں۔

والسلام دعا گو ودعا خواہ

عبدالماجد

(مکتوبات ماجدی جلد دوم ص:۷۵)

بنام مولانا عبدالباری صاحب ندوی

برادرم! السلام علیکم

ہاں حضت فقہیات ہوں یا کلامیات محض نقل پر اکتفاء تو اس خاکسار نے وہاں کی ہے جہاں دل کو شبہ یا تردد پیدا ہوا یا اصل مسئلہ ذہن کے سامنے ناصاف یا دھندلا رہا مثلاً مسئلہ رضاعت یا غلامی یا کفارہ وغیرہ کے جزئیات اور جہاں سرے سے کوئی تردد ہی نہیں وہاں اللہ کا نام لے کر اپنی ہی

بصیرت کو مسئول سمجھا ہے۔

اس خاص چیز میں اب کیا عرض کروں کیا کچھ اپنی ہی تفسیروں میں صیغۂ مجہول میں نہیں زور شور کے ساتھ پڑھ چکا ہوں کہ فلاں فلاں صحابہ کا مذہب فلاں فلاں تابعین کا مسلک فلاں فلاں مفسر کا رجحان یہ تھا۔اب رہا مسلک جمہور تو اسے کیا کروں کہ خود اس بارے میں کیسے کیسے اقوال ملتے ہیں حضرت خضر کی نبوت کے سلسلہ میں روح میں فالجمهور علیٰ انه علیه السلام نبی .اور اسی قطعیت کے ساتھ معالم میں ہے لم یکن الخضر نبیا عند اکثر اهل العلم .اور الفاظ جمہور تو یہ حضرات اس بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کر جاتے ہیں کہ حیرت ہی ہوتی ہے .جہاں اپنے دو چار ہم خیال مل گئے بس وہیں اتباع اور اتفاق چاہا ہے.بڑی طویل داستان ہے کئی نمبروں کے مقالے میں آسکتی ہے۔

طنزیاتِ قرآن پر جی میں آتا ہے کہ ایک مستقل مقالہ معارف یا صدق کے لیے لکھ دوں. منافقوں اور کافروں کے حق میں عذاب الیم کی بشارت کم از کم دس بارہ آیتوں میں تو ضرور آئی ہے.اور پھر اور آیتیں ذُق انک انت العزیز الکریم الخ قسم کی یا آخرت میں منافقین کے لیے خطاب قیل ارجعوا وراء کم الخ کل آیات تیس سے کم تو بہر حال نہیں اور اگر مکر الله....خادعهم ....اکید کید اوغیرہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو میزان کہیں زیادہ ہوتی ہے.بدھ ازم وغیرہ سے متأثر ہو کر جس طرح غصہ اور جذبہ جنس دونوں کو معیوب سمجھ لیا گیا ہے اور بزرگ کی تصویر ذہنوں میں یہ جم گئی ہے کہ وہ کسی حال میں نہ استغاثہ قبول کریں نہ ان کی قوتِ مردانہ کبھی حرکت میں آئے اسی طرح طنز کو یکسر ایک غیر اسلامی فعل سمجھ لیا گیا ہے اسے صاف کرنے کی اور اس کے حدود و قیود بتانے کی بڑی ضرورت ہے۔

سوانح قاسمی کمال اشتیاق کے باوجود کہیں آٹھ دس دن میں ختم کر پایا وقت آخر کہاں سے لاتا۔۔۔۔ہمارے مولانا گیلانی پر جذب تو معمول سے کچھ زیادہ ہی نظر آیا اور دماغ تو خاص یورپین طرز کا ہے ہی.کہاں کہاں سے قیاس آرائی اور استنباط کر کے بات کہاں سے کہاں پہنچادی ہے.مولانا

طیب کے حاشیے سوائے ایک دو مقامات کے عموماً بہت سنبھلے ہوئے اور متوازن ہیں. حضرت قاسم کے سارے کمالات اور کرامات کو تسلیم کرنے کے بعد وہی ہائے حکیم الامت!

میں نے اپنے ظرف اور اپنی تن آسانی کے لحاظ سے حضرت کی زندگی سے بجائے عبادات و ریاضت کے سبق صرف زندگی بہ عافیت گزارنے کا حاصل کیا. حضرتؒ کی باوجود سارے دنیوی علائق کے پرسکون واطمنان کی زندگی مجھے بہت ہی بھائی اور اس میں بڑا دخل حضرتؒ کی اس روش رواداری کا پایا واذا مرّوا باللغو مرّوا کراما پر پورا پورا عمل. بڑی سے بڑی گندگی کا ڈھیر سڑک پر لگا ہوا ہے اور وہ ہیں کہ آنکھیں نیچی کیے سلامت روی سے چلے جا رہے ہیں. اور یہ حضرت ہی کا صدقہ ہے کہ باوجود بہت طبعًا غصہ ور ہونے کے بھائی، بہن، بیوی لڑکیاں، بھتیجے، بھانجے، داماد اور رشتہ کے بھائیوں، پڑوسیوں، برادری والوں، کاشت کاروں سے عموماً بالکل کہنا چاہیے کہ ۹۵ رفی صدی سے اوپر نہایت ہی صلح وآشتی سے اتنی زندگی گزر گئی. غصہ آتا فوراً ہے لیکن اگر اتفاق سے دو چار منٹ کا وقفہ مل گیا تو بحمد اللہ اتر بھی فوراً جاتا ہے بلکہ قصوروار کی طرف سے کوئی معقول توجیہ وتاویل بھی ذہن میں آجاتی ہے.

آپ نے بھی توقعات کو گول اور مجمل رکھ کر تشنگی کا جواب تشنگی ہی سے دیا. میرے لیے تو مولانا کا یہ مختصر فقرہ سہ پہر کی نشست میں بڑا ہی سبق آموز رہا کہ میں نے علماء کو دیکھا کہ تفسیری مسائل پر خوب گفتگو کر لیتے ہیں لیکن تلاوت قرآن نہیں کرتے.

نکتہ چینی ہلکی سے ہلکی ہو اور نرم سے نرم تر لفظوں میں اس کی تاب بہت ہی کم لوگ لاتے ہیں اس لیے ناخوش ہی ہو جاتے ہیں سالہا سال کا تجربہ یہی ہے. کتابوں پر تنقید تک سے لوگ ناخوش ہو جاتے ہیں عمر بھر میں کل تین مثالیں اس سے مستثنیٰ اس وقت یاد پڑ رہی ہیں. ایک شیخ الحدیث مولانا زکریا. ایک بار ان کی کتاب پر کچھ نکلا. جب ملاقات ہوئی تو الگ بُلا کر مجھے لے جانے لگے میں ڈرا کہ اب شکوہ شکایت کا دفتر کھلے گا اس کے برعکس تنقیدی حصہ کا شکریہ ادا کیا. دوسری مثال غلام محمد کراچوی کی ہے سیرت سلیمان کی داد کے ساتھ ساتھ اچھی کڑی تنقید بھی میں نے لکھ کر بھیجی جواب میں شکریہ کا خط آیا. اور تنقید کے بڑے حصہ کو قبول کر لیا. ان دونوں سے بڑھ کر عالی ظرف مثال خود آپ کی ہے بہ سلسلۂ مکتوباتِ سلیمانی۔

لیجیے جو بات سب سے پہلے لکھنے کی تھی اس کی نوبت سب سے آخر میں آ رہی ہے. حسن عاقبت کی دعا تو ہر حال اور ہر سن میں ہونا چاہیے.

والسلام دعا گو و دعا خواہ

عبدالماجد

(متفرقات ص:۲۱۸تا۲۹۵)

بنام قطب الدین احمد صاحب

(مکتوب الیہ کی ملازمت ختم ہو گئی تھی اور اس کی وجہ سے ان کو مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا)

عزیزم سلمہ اللہ! وعلیکم السلام

اب کی خط ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا قدرۃً اس کے لیے وقت کئی دن کے بعد ہی نکل سکا. اب کی تمہارا خط تھا بڑے مزے دار. مکرر پڑھا. وسعت کے بعد عسرت، خوشحالی کے بعد تنگی اللہ کا کوئی معمولی انعام نہیں جو بندے اپنے ظرف کے لحاظ سے اس کے لیے چن لیے جاتے ہیں. یہ انعام انھیں کے نصیب میں آتا ہے. خوش ہو کہ تمہارا شمار انھیں چنے ہوئے بندوں میں ہو گیا **وما یلقاھا الا الصابرون**.

جس شہر میں اور جن سڑکوں سے انسان ابھی موٹر پر اور ابھی کل تک گزرتا رہا ہو انھیں پر آج پیدل چلنا کوئی معمولی مجاہدہ نہیں ۔۔۔۔ اور اس آغاز کا انجام اجر ہی اجر، انعام ہی انعام۔

والسلام دعا گو

عبدالماجد

(ص:۳۷۳)

بنام مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

عزیزم مکرم! وعلیکم السلام

اپنے لیے ہر وقت سوچا کرتا ہوں کہ فرصتِ عمر اب کتنی کم باقی رہ گئی ہے اور کام ابھی کرنے کو کتنے پڑے ہیں. اپنے لڑکوں میں کوئی انہیں پورا کرنے والا نہیں نظر آں عزیز ہی پر پڑتی ہے. اجمالاً دو ایک چیزیں لکھے دیتا ہوں خود نہ کر سکا تو ان کاموں کو اپنے ذمہ سمجھیں.

۱۔ النساء والصبیان فی القرآن ۔۔۔ یہ عنوان دو ہفتے سے دماغ میں چکر لگا رہا ہے اس کے دو حصے ہوں. ایک میں مطلقہ عورتوں اور لڑکیوں کا ذکر، ان کے احکامات و مسائل کا بیان، نکاح، طلاق، خلع، وراثت، زنا،

قذف، حجاب، یتیمی وغیرہ۔ دوسرے میں متعین افراد مریم، امرأۃ نوح، امّ موسیٰ، زوج آدمؑ ھٰذا غلام حلیم وغیرہا۔

۲۔ طبقات المفسرین ۔۔۔ حضرات مفسرین کا مفصل تذکرہ، ان کے مختلف خانوادے، مثلاً البیضاوی صاحب بحر، صاحب روح المعانی ایک سلسلے کے ہیں۔ صاحب معالم، خازن ایک سلسلے کے وقس علیٰ ہذا۔ ان کے نجی حالات، اندلسی مفسرین کی خصوصیات، علوم عصریہ سے تاثر وغیرہ۔

۳۔ ہندوستانی تراجم پر مفصل تبصرہ ۔۔۔ خاندانِ عزیزی کے ترجموں کا تجزیہ شیخ الہند وحکیم الامت کے کام کی خصوصیات۔

یہ کام خوش عقیدگی سے ہٹ کر خالص تحقیق کی راہ سے کرنے کا ہے۔ آخر انہی حضرات نے ایک دوسرے کے کام کو نا کافی سمجھ کر جب ہی تو خود ہاتھ لگایا ہے۔ ایک کو دوسرے میں کیا کمی نظر آئی اور کتنی جگہ نظر آئی۔ سب پر کھل کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

والسلام دعا گو ودعا خواہ

عبدالماجد

(مکتوبات ماجدی جلد سوم ص: ۷، ۸)

نواں باب

نشریاتِ ماجدی

مولانا دریابادیؒ کا ادیبانہ قلم تفسیر ہو یا صحافت، آپ بیتی ہو یا سیاحت، تأثرات ہو یا مکتوبات اور وفیات ہو یا نشریات، غرض تحریر کے جس کوچہ میں قدم رنجہ ہوا میر کارواں بن کر رہا۔

مولانا دریابادیؒ نے برادرانِ وطن تک انسانی فطرت کی صحیح آواز پہونچانے کے لئے عام علماء کی روش کے خلاف ریڈیائی تقریروں کے ذریعۂ ابلاغ کو بھی پسند فرمایا۔ زیادہ تر نشریے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن ہی سے نشر ہوئے اور کچھ دہلی اسٹیشن سے۔ موضوع عام طور پر دینی، اخلاقی، ادبی یا تأثراتی ہوا کرتا تھا نشریات کی زبان ادب وانشاء کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہونے کے ساتھ ساتھ مکالمتی انداز کی ہوتی۔ جو نشریات کی جان کہی جاسکتی ہے۔

۳۵ تقریروں پر مشتمل مولانا دریابادیؒ کے یہ نشریات دو حصوں میں کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس باب میں عنوان کو جوں کا توں برقرار رکھ کر مرتب نے اس کے ادبی شہ پارے نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور اخیر میں ''مولانا کہلانے سے قبل'' والا نشریہ جو ملک جنرل غلام محمد صاحب کی فرمائش پر آپ نے پاکستان کے سفر کے موقع پر کراچی ریڈیو اسٹیشن کو دیا تھا اس کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ہماری زندگی اور اس کے رنگ ڈھنگ

ہاں وہی مشرق جہاں ہر صبح مسجدوں میں وضو ہوتے ہیں اور دریاؤں میں اشنان۔ جہاں ہر شام مسجدوں میں اذانیں ہوتی ہیں اور مندروں میں گھنٹے بجتے ہیں۔ جہاں صبح آفتاب نکلنے

سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے اور جہاں شام و صبح دن چھپنے کے ساتھ ہی آ جاتی ہے. جہاں یہ نہیں ہوتا کہ سائنس کا کمال رات کو دن بنا دے اور آرٹ کی ''جنت نگاہ'' دن میں رات کے سارے مزے بھر دے. یہ وہ زمین ہے جس پر کبھی آسمان کو بھی ناز رہ چکا ہے. نبی اور ولی اور بڑے بڑے رشی گیانی کسی زمانہ میں اسی زمین پر چلے پھرے، رہے بسے ہیں اور گیان دھیان کی سمادھیوں کو رچائے ہوئے ہیں. یہ وہ خطہ ہے جہاں اب تک عزت ہو رہی ہے برقعے اور گھونگھٹ کی، نقاب کی اور چادر کی. جہاں اب تک شوہر کو سرتاج اور سوامی کہا جاتا ہے. اور باپ کو قبلہ و کعبہ لکھا جاتا ہے۔

یہاں والوں کا اب تک یہ عقیدہ ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے اور ماں کو ادب کے ساتھ سلام کرنا، اس کے قدموں سے آنکھیں ملنا دستور میں داخل ہے. اولاد کا سلسلۂ پیدائش روکنے کی جگہ یہاں اب تک بیٹا ''لختِ جگر'' اور بیٹی ''نورِ نظر''! غیرت یہاں اب تک سب سے بڑھ کر ماں کی، بہن کی اور بیٹی کی دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے اور ان کی بے حرمتی کی طرف اشارہ شریفوں کو چھوڑیئے بازاریوں اور آوارہ مزاجوں کی زبان میں بھی سب سے بڑی گالی ہے. ادب یہاں اب تک بڑوں کا چلا آتا ہے. محلّہ کا ہر ''ادنیٰ'' اگر سن میں بڑا ہے تو ''اعلیٰ'' ہے. استاد اور گرو کا حق مانا جاتا ہے۔

یہاں اب بھی انکسار، فروتنی اور عاجزی کو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے. یہاں شریف اسے سمجھا جاتا ہے جو زندگی کی دوڑ میں دوسروں کو ڈھکیل کر، گرا کر اپنا راستہ صاف کرنے میں ہر جگہ اپنے کو پیچھے رکھتا ہے. خود ہٹتا جاتا ہے اور دوسروں کو آگے بڑھاتا جاتا ہے اپنے کارناموں کو مشتہر کرنے اور اپنے کمالات کا ''مینی فیسٹو'' شائع کرنے کے فن میں بھی ابھی وہ بالکل ناآموز، بالکل اناڑی. اس کے یہاں اپنے لئے دستور اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کا ہے ''حقیر پُرتقصیر، کمترین، مسکین، خاکسار، ذرّۂ بے مقدار، خادم آثم'' اور جب کوئی اسے آگے بڑھانا چاہتا ہے تو جواب اس قسم کا سننے میں آتا ہے: ''یہ محض آپ کا کرم ہے، حسنِ ظن ہے، بندہ نوازی ہے، عزت افزائی ہے، یہ خاکسار ہے کس قابل''۔

یہ صبح سویرے جب آنکھ کھولتے ہیں تو خدا کا نام لیتے ہوئے اور رات کو جب سونے لیٹتے ہیں تو اپنے تئیں خدا کو سونپتے ہوئے۔ یہاں کی چڑیاں تک جب چہچہاتی ہیں تو یہ بول اٹھتے ہیں کہ وہ دیکھو خدا کا نام جپ رہی ہیں۔ کوئل کی کوک میں، مُرغ کی بانگ میں، پپیہے کی پکار میں، قمری کے زمزمہ میں، بلبل کے نغمہ میں، مور کے شور میں سب میں انھیں پروردگار کے نام کی تسبیح ہی سنائی دیتی ہے۔

کوئی بیمار پڑتا ہے تو گھر والے اس سے وحشت اور دہشت کھا کر بھاگتے نہیں اور یہ نہیں ہوتا کہ گھر کی مالکہ گھر کے مالک کو نرسوں کے حوالہ کر، خود شام کو ٹینس یا شام کی تفریح کے لئے تشریف لے جائیں۔ مریض کی خدمت اور تیمارداری پر گھر بھر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور اسے بیمار پر کوئی احسان نہیں خود اپنے لئے باعث سعادت سمجھا جاتا ہے اور گھر والوں میں کوئی اس قابل نہ ہو تو محلہ والے ہجوم کر کے آ گھستے ہیں، اتنے رضا کاروں (والینٹروں) کے ہوتے ہوئے باضابطہ ٹرینڈ نرسوں کی فوج کی فوج قدرتاً یہاں تیار نہیں ملتی۔

ان کے ہاں عورت کے لئے نظریں نیچی رکھنا اور جسم کو ڈھکے رہنا اب تک شرافت کا نشان اور عصمت کی پہچان ہے۔ یہاں تک کہ ان میں جو بدنصیبی بالکل بازاری ہو جاتی ہیں وہ بھی دنیا کا شرم ولحاظ رکھتی ہیں اور عام مجلسوں میں بیباک نہیں ہوتیں۔ یہ دقیق علوم ان کی سمجھ میں اب تک نہیں آئے ہیں کہ کالج کے ایک ہی کلاس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں زانو بہ زانو بیٹھ کر پڑھیں گے تو ان کا دماغ زیادہ روشن ہو جائے گا یا ان کی عقل کو زیادہ جلا ہو جائے گا یا عورتیں اگر اپنے جسم کا بڑا حصہ قید لباس سے آزاد کیے بازاروں میں، اسٹیشنوں پر، سینما کے تماشہ گھروں میں پھریں گی تو اس سے ان کے اخلاق بلند ہو جائیں گے! ابھی تک یہاں کی عورتیں اپنا مقصدِ زندگی صرف خدمت سمجھ رہی ہیں۔ خدمت ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی، شوہر کی اولاد کی، اور خوش نصیب سمجھی جاتی ہیں وہ سہاگنیں جو خدمت کرتی ہوئی شوہروں کی اٹھ جائیں۔ یہاں کے اخبارات عدالت میں طلاق کی کاروائیوں سے لبریز نہیں ہوتے۔ یہاں لڑکی جب بیاہ کے بعد اپنا گھر چھوڑ سسرال جاتی ہے تو ساس کی شکل میں اسے دوسری ماں اور سسر کی صورت میں اسے دوسرا باپ میسّر آ جاتا ہے اور اس طرح ان دونوں کو بہو

کے قالب میں ایک اور بیٹی مل جاتی ہے، یہاں کے نظام خاندان کی بنیاد کشمکش (Struggle) پر نہیں یاری و مددگاری (Alliance) پر ہے۔

قناعت اور زہد و تقوی کا اب تک ان کے ہاں بڑا درجہ ہے۔ یہاں زبانِ خلق مقدس انھیں کو ٹھہراتی ہے جو بڑے بڑے بینکوں کے ڈائرکٹر اور بڑی بڑی کمپنیوں کے شیئر ہولڈر نہیں بلکہ جو دنیا سے منہ موڑے اور ہوس دنیوی کو چھوڑے ہوتے ہیں۔ عقیدت کے پھول انھیں آستانوں پر چڑھتے ہیں جو فقر اور مسکنت کے تاجدار ہوتے ہیں۔ اعتقاد دواؤں سے بڑھ کر دعاؤں پر رہتا ہے اور پھر بھروسہ تدبیر سے زیادہ تقدیر پر۔ بلاؤں کے وباؤں کے دور کرنے کے لئے یہ محض ڈاکٹروں حکیموں کے سہارے نہیں رہتے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں کرتے ہیں۔ روزوں کی منت مانتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں خیرات کرتے ہیں۔

یہ ہمارے یعنی مشرقیوں کی سوسائٹی کا دھندلا سا خاکہ اور پرانی دنیا والوں کی مجلسی زندگی کا مختصر سا نقشہ۔ لیکن قریب ہے کہ یہ حال ماضی ہو کر رہے۔

(نشریاتِ ماجد حصہ اول ۱۲ تا ۱۵)

قرآن کیا ہے؟

قرآن محض کتاب العقائد نہیں۔ ایمانیات، عبادات، معاملات، فقہ، قانون سب کا جامع زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے۔ اور اس لحاظ سے سرڈینی راس کا یہ لکھنا بالکل برحق ہے کہ قرآن کی حیثیت مسلمانوں کے نظر میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے جو بائبل کی مسیحیوں کی نظر میں ہے۔

قرآن کی اعلیٰ اور مرکزی تعلیم توحید ہے۔ سیکڑوں کیا ہزاروں آیتوں میں اسی ایک مضمون کو دہرادیا ہے۔ ہر ہر ڈھنگ سے کہ خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، سب اس کے مخلوق، سب اس کے بندے، کوئی نہ اس کا مظہر نہ اس کا بیٹا۔ قدیم صرف اس کی ذات، باقی سب حادث و فانی۔ روح و فرشتہ و پیمبر سب اس کے محتاج، وہ خود سب سے بے نیاز، سب اسی کے اشارے پر نیست سے ہست ہوئے۔ وہی سب کو عدم محض سے وجود میں لایا بغیر روح، مادہ یا کسی سہارے

کے۔

قرآن کے نقشۂ زندگی میں شراب اور اسی طرح کے نشے قطعی منع، مرد وعورت کے آزادانہ خلا ملا کی ساری راہیں بند. بدنظری پر پہرا بیٹھا ہوا. گندی نظمیں، گندے کھیل تماشے، ناٹک سوانگ، گندی تصویریں الگ رہیں قرآن ایسے تذکروں اور چرچوں کا بھی روادار نہیں. غیبت، جھوٹ، بہتان، دل آزاری، بدعہدی، تجارتی دھوکا دھڑی، سب کی روک تھام کے لئے سخت سے سخت سزائیں اور وعیدیں موجود. ایک سے زائد شادی کرنے اور طلاق دینے کے باب میں نہ اتنی تنگی کہ کسی حال میں اور کسی ضرورت سے بھی ان کی گنجائش ہی نہ نکلے اور نہ اتنی آزادی کہ جب بھی جس کا جی چاہے بغیر کوئی ذمہ داری محسوس کئے کر گزرے. دینِ فطرت کے دستور العمل میں فطرتِ بشری کے مطابق ہر جگہ مناسب قیود، ہر قدم پر مصلحت وحکمت کے حدود. عورت کو نہ اتنا دبایا کہ بیوی کو باندی بنا کر چھوڑا، نہ اتنا چڑھایا کہ شوہروں پر دھوکہ زن مریدوں اور زن پرستوں کا ہونے لگے. ان کے حقوق ان کے اوپر، ان کی ذمہ داریاں ان کے سر. ہر معاملے میں زور حق سے کہیں زیادہ فرض پر. خرچ میں نہ اسراف کی اجازت، نہ بخل کی حمایت، ہر چیز نقطۂ اعتدال پر نہ افراط یا زیادتی کی لعنت، نہ تفریط یا کمی کی شامت. کوئی چوری کرے تو اپنے ہاتھ سے ہاتھ دھو بیٹھے. نکاح کے دائرہ سے قدم باہر نکالے تو جیتا بھی نہ بچنے پائے. ماں باپ کی خدمت کی تاکید شدید، عزیزوں، مسکینوں، پڑوسیوں، ہمسایوں سب کے حقوق ادا کرنے واجب. بلاضرورت اور بغیر مقصد صحیح کسی مخلوق پر بھی ہاتھ اٹھانا جائز نہیں. اور جب شریعت کے مطابق ضرورت آپڑے تو پھر خدا کی راہ میں بندہ بڑھ بڑھ کر اپنی جان دے. اور دوسرے کی جان لے۔

(ص:۲۱،۲۲)

عید الفطر

آج مسلمان کے یہاں خوشی کا دن ہے اور اس کو اپنی بول چال میں عید کہتا ہے. عید اس

کے یہاں سال میں دو بار آتی ہے۔ آج کی عید کا نام عید الفطر ہے۔ افطار اور افطاری کے محبوب نام اسی فطر سے نکلے ہیں۔ مسلمان کا دن ہر روز فجر کے وضو سے شروع ہوتا تھا آج غسل سے شروع ہوگا۔ وضو اور غسل دونوں کے لئے مستقل دعائیں ہیں کہ جسم کی صفائی کے ساتھ ساتھ روح بھی دُھلتی اور نکھرتی چلی جائے۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ کیسا جامع پروگرام ہے اور کیسا مکمل نظام! جسم کا سنگھار بھی روح کا نکھار بھی، اِدھر تفریح، اُدھر تسبیح، ادھر جسم کی جلا، ادھر روح کی ضیاء!

عیدگاہ پہنچے، یہاں کے جماؤ کا کیا کہنا۔ کوئی معمولی قصبہ ہے تو مجمع سیکڑوں کا، شہر ہے تو ہزاروں کا، بڑا شہر ہے تو ہزار ہا ہزار کا اور کلکتہ و بمبئی ہے تو نوبت لاکھوں کی! امیر بھی فقیر بھی، بڑے بھی چھوٹے بھی، شہری بھی دیہاتی بھی، بوڑھے بھی جوان بھی، چہروں سے ایمان کی مسرت ٹپکتی ہوئی۔ بُشرہ سے ادائے فرض کی بشاشت جھلکتی ہوئی۔ کوئی وضو کر رہا ہے، کوئی راہ کے گرد و غبار سے ہاتھ منہ دھو رہا ہے۔ کچھ لوگ آپس میں ہنس بول رہے ہیں، کچھ مصلوں پر قابض ہو کر ذکر درود کی تسبیح میں لگ گئے ہیں اور کوئی صاحب ہیں کہ جوتوں کی فکر و انتظام میں لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔ صحن عیدگاہ سے باہر کا منظر بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ سودے والوں کا ہجوم، خوش غلاف گاہکوں اور تماشائیوں کی دھوم! خوانچہ والوں کی بہار، پھیری والوں کی چیخ و پکار۔ ادھر سرخ سرخ کباب سیخ پر لگ رہے ہیں۔ ادھر پکوان کے گھان کڑھائی سے اتر رہے ہیں۔ حقہ، پان، سگریٹ کی حلوائیوں کی دوکانوں کے ٹھاٹھ، کہیں چائے والے اپنے دم سے محفل گرمائے ہوئے، کہیں برف کی قلفی والے اپنا رنگ جمائے ہوئے! اور سب سے بڑھ کر بچوں کے کھلونوں، غباروں، جھنجھنوں والوں کا شور و غل چیخ و پکار، بچوں کے ساتھ خود بھی بچہ بنے ہوئے۔

عیدگاہ نہ کوئی سر بفلک عمارت، نہ یہاں کوئی جگمگاتا ہوا ہال، نہ کوئی عظیم الشان دالان، سرے سے چھت تک نہیں، پوری چار دیواری بھی نہیں صرف ایک لمبی دیوار مغرب کی سمت کھنچی ہوئی، آگے چبوترہ، بس یہ کل کائنات، سادگی کی انتہاء، دین فطرت کی سادگی کا نمونہ! اور اس پر اس کی دل کشی اور دلآویزی کشش کی محبوبی! کسی دوسرے مجمع کے مقابلہ میں اور کسی دوسرے منظر کو

مثال میں بتلایا جائے. حد یہ ہے کہ شاعر کی دنیا میں عیدگاہ دوسرا نام ہے کوئے یار کا، دیارِ محبوب کا!

عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

نماز ختم ہوئی اور دو رکعتوں کے بعد امام نے سلام پھیرا اور منبر پر جا خطبہ شروع کر دیا. خطبے وہی دو ہوتے ہیں جمعہ کی طرح. دونوں خطبوں میں ہوتا کیا ہے؟ نہ پھڑکتی غزلیں، نہ رنگین افسانے، نہ ادبِ لطیف کے نمونے، نہ پرجوش ترانے. وہی رب کی نعمتوں کا شکر اور اس کا اقرار. ترغیب توبہ اور تلقین استغفار. اس سے وعظ، اس کے لئے وعید، ایک کو بشارت دوسرے کو تہدید. کہیں جنت کے پھولوں کی مہک، کہیں جہنم کے شعلوں کی لپک، نیکوں کو دلاسے اور خوش خبریاں اور بدوں کو ڈراوے اور دھمکیاں، کچھ فقہ و شریعت کے مسائل کچھ رمضان و عید کے فضائل، غرض وہ سب کچھ جس کے ذکر و فکر سے شاندار اور نامور روزناموں کے صفحات خالی رہتے ہیں اور آرٹ اور سائنس کے باتصویر میگزینوں کے اوراق کورے۔

(ص:۲۸)

عیدِ قرباں

اللہ اللہ دو مہینے دس دن کی مدت بھی کوئی مدت ہے. بات کہتے کٹ گئی اور شوال کی پہلی کی یاد ابھی مٹنے نہ پائی تھی کہ ذی الحجہ کی دسویں آ گئی. وہ مسلمان کی پہلی سالانہ عید تھی یہ دوسری اور آخری. وہ عید الفطر تھی یہ عیدِ قرباں یا عید الاضحٰے (غلط العوام میں عید الضحٰے) وہ عید میٹھی تھی آج کی نمکین.

لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک. تاریخ کی زبان سے روایت یہ سننے میں آئی ہے کہ آج سے کچھ اوپر پانچ ہزار سال قبل کلدانیہ کے ملک میں، بت پرستوں کی قوم میں بت تراشوں کے گھرانے میں ایک مقبول برگزیدہ اور نہایت برگزیدہ بندہ ابراہیم نامی آباد تھے. بندہ کے امتحانات طرح طرح کے مالک کی طرف سے ہوئے اور ابراہیم ہر آزمائش میں پورے اترے. آخر اللہ کے پیمبر ہی تھے. کچھ روز بعد حکم ہجرت کا ملا. سرزمین شام پر پہنچے اور پھر مصر ہوتے ہوئے حجاز کی خشک اور پتھریلی وادی میں آئے. علاقہ ویران. پانی کا نام نہ نشان. سبزہ کی جگہ ہر

طرف ریگستان. نیچے تپتی ہوئی زمین اوپر دہکتا ہوا آسمان. حکم ملا کہ یہیں ایک گھر بناؤ اس مٹی اور پتھر کا، لیکن اپنے لئے نہیں، ہماری عبادت کے لئے اور ہاں ذرا یہ کرنا کہ اسے منسوب ہماری جانب کر دینا. ہم گھر اور در کی قید سے ماوراء، مکان اور چھت کی نسبت سے بھی برتر و بالا، لیکن ذرا اسی گھر کے ساتھ ہمارا نام ڈال تو دو اور ہماری ہی بسائی ہوئی دنیا کو آواز دے دو کہ اس گھر کو آ جایا کرو. واذن فی الناس بالحج. فرمانبردار بندے نے پکار دی اور اس وقت پکار کی جب نہ تار تھا نہ ٹیلی فون، نہ وائر لیس، نہ لاؤڈ اسپیکر، نہ لوگ نشریات (براڈ کاسٹنگ) کے قانون سے واقف تھے. نہ گھر گھر ریڈیو لگے ہوئے تھے. ابراہیمؑ کی پکار خدا معلوم کس لاہوتی میٹر پر اور کس ملکوتی لہر (Wave Length) سے نشر ہوئی کہ آج تک اس کی تھرتھراہٹ فضائے کائنات میں آپ خود سن رہے ہیں۔

ڈاکٹر جب مریض کو آپریشن کی میز پر لٹاتا ہے تو پہلے آپریشن والے عضو کو دوا لگا کر سن کر دیتا ہے یا مریض کو کلوفارم سنگھا کر بے ہوش. مسلمان بھی جب جانور کو ذبح کرنے کے لئے قبلہ رُخ لٹا کے گلے پر چھری چلاتا ہے تو روح کو ایک مختصر دو لفظی نغمہ سنا مست کر دیتا ہے بسم اللہ ،اللہ اکبر ! ۔۔۔۔ سنتے ہیں کہ فوج کے سپاہی جنگ کے میدان میں فوجی بینڈ اور وطنی ترانہ کی آواز سن کر ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ جان کی پروا نہیں رہ جاتی اور بندوق کی گولیوں، توپ کے گولوں، سنگینوں کے وار کے لئے بے تکلف اپنے سر و سینہ کو پیش کر دیتے ہیں. اللہ کے نام کی کشش روح کے لیے اتنی بھی نہیں! جاننے والے تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ روح اس اسم پاک سے ایسی مست و بے خود ہو جاتی ہے کہ خود حالت طرب میں ہنسی خوشی باہر آ جاتی ہے، گو جسم دیکھنے والوں کی نظر میں تڑپتا لوٹتا رہے. آخر کلوفارم کا کام آپریشن میں بھی تو یہی ہوتا ہے کہ رگوں پر رگیں جسم کی کٹتی رہیں خون پر خون بہتا رہے لیکن مریض کا احساس اذیت و کرب مردہ ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں ایک بار ان ہی کعبہ کی تعمیر کرنے والے آگ میں کود پڑنے والے حج کی پکار کرنے والے ابراہیمؑ نے بھی قربانی پیش کی تھی. یہ قربانی بکرے کی نہ تھی مینڈھے کی نہ تھی. اونٹ کی بھی نہ تھی چہیتے اور لاڈلے نورِ نظر اسمٰعیلؑ کی تھی. خواب میں حکم محبوب ترین ہستی کی قربانی کا ملا. پیمبر

کے خواب بھی الہامی ہوتے ہیں. صبح اٹھ مشورہ اسمٰعیل سے کیا اس سے کیا جو آنکھوں کا تارا بڑھاپے کا سہارا تھا. مشورہ خود اسی کے ذبح کے باب میں اسی سے کیا. دنیا کی تاریخ میں کب کسی عزیز نے عزیز سے اس کے قتل و ذبح کے باب میں مشورہ کیا ہے؟ کب کسی شفیق اور عاشق زار باپ نے اپنے لختِ جگر کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہے؟ ہر صاحبِ اولاد ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچے. بیٹا بھی کس باپ کا تھا، فوراً آمادہ ہو گیا اور عرض کیا "ابا جان! آنکھوں پر پٹی باندھ لیجئے گا ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر میرا چہرہ دیکھ آپ کی ہمت جواب دے جائے". باپ نے آنکھوں پر پٹی باندھ خدا معلوم دل پر کون سے پتھر کی سِل رکھ حلق پر چھری چلائی. مگر قدرتِ حق سے نورِ نظر کی جگہ ایک جنت کے مینڈھے نے لے لی. اور چھری گو پھیرنے والے نے پھیری اسمٰعیل کے گلے پر، لیکن چلی وہ اس غیبی مینڈھے کے حلق پر اور اسمٰعیلؑ و فدیناہ بذبح عظیم کا پروانۂ بشارت پا کر زندہ جاوید ہو گئے۔

(ص:۴۱)

محمد علی

خوش نصیب تھے وہ جنھوں نے محمد علی کو دور سے سردارِ قوم کی حیثیت جانا، پیشوائے ملت کی حیثیت سے پہچانا. خوش نصیب تر تھے وہ جنھوں نے قریب سے دیکھا بہ حیثیت دوست کے، عزیز کے، انسان کے، ان دیکھنے والوں نے کیا کچھ دیکھ لیا کیا کچھ پالیا، ایک صداقتِ مجسم، پیکرِ اخلاص، جرأت و ہمت و بے خوفی کا مجسمہ! پاس والے جتنے قریب سے دیکھتے گئے جوہر کے یہی جوہر اور زیادہ کھلتے گئے، ابھرتے گئے. کہتے ہیں کہ اہلِ سیاست وہ ہوتے ہیں جو کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں. اگر یہ سچ ہے تو محمد علی قطعاً سیاسی نہ تھے، ایک بار نہ تھے ہزار بار نہ تھے. محبت کے پُتلے تھے. مہر و اُلفت کے بندے. بیوی بچوں دوستوں رفیقوں کے عاشقِ زار عزیزوں کے جاں نثار، اجنبیوں تک کے مونس و غم گسار. کہا کرتے تھے کہ شہرت میں کیا رکھا ہے میں تو محبت کا بھوکا ہوں. عالم اسلام کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ افریقہ میں کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے اور اس کی چبھن محمد علی دہلی میں بیٹھے محسوس کریں. "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے". سب کے حق میں شاعری ہوگی ان کے حق میں

واقعہ لوگوں کو مہمان بنانے، کھانا کھلانے خاطریں کرنے کے حریص خود اپنے گھر میں مفلسی و ناداری، مہمان اور دوسروں کو پکڑ پکڑ لا رہے ہیں اور زبردستی کھانا کھلا رہے ہیں۔

لڑکا کوئی نہ تھا لڑکیاں چار ایک سے بڑھ کر ایک لاڈلی، ۲۳ء میں ابھی جیل میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان شادی شدہ دق میں مبتلا ہوگئی اور مرض روز بروز بڑھتا گیا مجبور و محصور صدہا میل دور باپ پر کیا گزری ہوگی! جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا وہ اپنی نازوں کی پالی، نورِ نظر کے واسطے کیسا بلبلایا ہوگا، تلملایا ہوگا، پھڑ پھڑایا ہوگا! کچھ اور زور نہ چلا تو عالم خیال میں بیٹی سے کہنے لگے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

اور پھر اپنے دل کو یوں سمجھانے لگے ؎

امتحان سخت سہی پر دلِ مؤمن ہی وہ کیا جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلا اہل تسلیم و رضا کا دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نورِ نظر دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر عرض کر رہے ہیں ؎

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے قرآن میں کیا تخرج الحی من المیت مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں دور آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ تقدیر کا نوشتہ کسی علاج و تدبیر سے مٹ نہیں سکتا شعر کہنے سے پہلے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیتے ہیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

(ص: ۵۳، ۵۴)

امیر خسروؒ

خالق باری کا نام بھی آج کے لڑکوں نے نہ سنا ہوگا کل کے بوڑھوں کے دل سے کوئی

پوچھے! کتاب کی کتاب ازبر تھی. زیادہ نہیں پشت در پشت ادھر کی بات ہے کہ کتاب تھی مکتب میں چلی ہوئی گھروں میں پھیلی ہوئی. زبانوں پر چڑھی ہوئی. گویا اپنے زمانہ تصنیف سے صدیوں بعد تک مقبول وزندہ، مشہور وتابندہ!۔۔۔۔دست قدرت نے جس کی زبان میں یہ موہنی رکھ دی تھی، جس کے کلام کو حسن قبول کی دولت دے دی تھی. اسی کا نام تھا امیر خسرو. امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار. شعروادب اس کی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبہ سے آگاہ. سرِ مشاعرہ آجائے تو میرِ محفل اسے پائیے. خاندان چشت اہل بہشت کے کوچہ میں آنکلے تو حلقۂ ذکر وفکر میں سرمسند جلوہ، اس کا دیکھئے. اچھے اچھے شیخ دم اس کا بھر رہے ہیں معرفت وطریقت کے خرقہ پوش کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں۔

والدین نے نام ابوالحسن رکھا. شہرت عام کے نقیبوں نے امیر خسرو کہہ کر پکارا. والد بزرگوار کا نام امیر شمس الدین محمود شمسی چنگیز خان کے زمانہ میں ترکِ وطن کر ہندوستان پہنچے. شادی یہیں ہوئی بستی کے نامور اور درویش منش رئیس اور ضلع کے منصب دار نواب عماد الملک کی صاحبزادی کے ساتھ. یہیں امیر کی پیدائش بھی ہوئی۔ تاریخ خوش اعتقادی کی زبان سے روایت یہ بیان کرتی ہے کہ پڑوس میں کوئی مجذوب رہتے تھے صاحبِ کشف. یہ لوگ خرقہ میں لپیٹ کر بچہ کو ان کی خدمت میں لائے دیکھتے ہی بولے یہ کس کو لے کر آئے یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر رہے گا!۔۔۔۔مجذوب صاحب کی نگاہ کشفی شاعری کی حد تک رہی. بچہ نے بڑے ہو کر فقر ودرویشی میں وہ مقام حاصل کیا کہ شاعری منہ دیکھتی رہ گئی۔

کہتے ہیں کہ آج سے پہلے. بہت پہلے کوئی چھ سات سو برس پہلے باہر سے آئے ہوئے ایک امیر کبیر مسافر ایک سرا میں آکر اترے. کنیزیں خدام، زر وجواہر، بیش قیمت مال واسباب سب کچھ ساتھ. اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک دوسرا مسافر مفلس ومفلوک الحال دہلی سے واپس آتے ہوئے اسی سرا میں ٹھہرا رئیس کو بوئے انس محسوس ہوئی بڑھ کر پوچھا کہ کدھر سے آنا ہوا؟ جواب ملا دہلی سے. پوچھنے والے کا اشتیاق دہلی کا نام سن کر تیز ہوا. پوچھا اس شہر میں ایک درویش خواجہ نظام الدین ہیں

وہاں بھی حاضری کا اتفاق ہوا تھا؟ مفلس بولا ''اتفاق کیسا انھیں کے پاس تو گیا تھا. حاجت مند ہوں چاہتا تھا کہ کچھ مل جائے میری قسمت کہ وہاں کچھ موجود ہی نہ تھا. پیر کی پہنی ہوئی جوتیاں تھیں وہی میرے حوالہ کر دیں انھیں کو لئے چلا آ رہا ہوں'' سننے والا اب شوق واشتیاق سے بے خود تھا، بولا ''خدا کے لئے وہ جوتیاں میرے حوالہ کر دو اور یہ میرا ساز وسامان سب تمہاری نذر ہے'' سائل دنگ وحیران کہ جوتیوں کے عوض یہ لاکھوں کی دولت؟ رئیس صاحب کہیں مجھ بے نوا سے دل لگی تو نہیں کر رہے ہیں. ادھر رئیس صاحب اپنے ہوش میں تھے کب اور ہنسی اور دل لگی کی سکت ہی ان میں کہاں تھی؟ راوی کہتے ہیں کہ یہ سودا چار پانچ لاکھ روپیہ میں پڑا اور رئیس صاحب نے وہ پیر کی اتری ہوئی جوتیاں آنکھوں سے لگا سر پر رکھ پگڑی کے اندر لپیٹ لیں اور وجد کے عالم میں دہلی چل کھڑے ہوئے ۔۔۔۔ جوتیاں جس محبوب کی تھیں وہ تو وہی ہیں جنھیں زبانِ خلق محبوبِ الٰہی کے نام سے پکارتی ہے اور امیر وہی امیر خسرو تھے جنکا یہ فارسی کا شعر اس وقت سے اب تک خدا معلوم کتنے دلوں کو حال وقال کی محفلوں میں گرما چکا ہے۔

متاعِ وصلِ جاناں بس گراں است گرایں سودا بجاں بودے چہ بودے

(م : ۶۱، ۶۳)

غالب کا فلسفہ

فلسفہ کے نام سے گھبرایئے نہیں. فلسفہ موٹے موٹے نامانوس لغات ثقیل ومغلق اصطلاحات کا نام نہیں. فلسفہ نام ہے خودشناسی کا، زینہ ہے خداشناسی کا. ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ عادات واطوار کیا ہیں؟ خدا کیا ہے؟ ماسوا کیا ہے؟ ہمارے جذبات کیا ہیں؟ ہمارے گردوپیش کیا ہے؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں جن سے ہم کو آپ کو سب کو دوچار ہونا پڑتا ہے. کبھی جان کر اور کبھی انجان. ان ہی کو عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجئے اور لیجئے آپ فلسفی ہو گئے. پھر غالب غریب کینٹ اور ہیگل کی طرح کے تو انسان تھے بھی نہیں ایک خوش باش زندہ دل، خوش فکر،

طبیعت دار آدمی. باتیں کرتے تو ذرا گہری نظر سطح کی نہیں عمق کی عادی، چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں مغز تک پہنچ جانے کی خوگر، سوجھ بوجھ غضب کی. اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے تو کبھی پیاری نثر میں کبھی دلآویز نظم میں. کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے، کبھی نثر کے مائیکرو فون کو منہ لگا لیتے. شہرت شاعری کی زیادہ ہوگئی ورنہ تحقیق کے راوی کا تو یہ بیان ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے، مالک تھے، بادشاہ تھے، جب چاہا ہنستوں کو رلا دیا. شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا، مرجھائے دلوں کو کھلا دیا. فطرت بشری کے سروں میں الاپتے. ابھی آہ کا رنگ جما دیا ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا. یہ تھی ان کی حکمت. یہی ان کا فلسفہ. یہی ان کی شاعری کا پیام، یہی ان کی زندگی کا کارنامہ۔

دل فطرت سے شوخ لے کر آئے تھے اور دماغ بیدار. شعر کم سنی ہی سے کہنے لگے تھے جو رنگ طبیعت کا شروع سے تھا آخر تک رہا. جوں جوں سن بڑھتا گیا پختگی آتی گئی. دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے حقیقتی کا نقش شروع سے دل پر بیٹھ گیا تھا. جوانی کا زمانہ رندی و سرمستی کا ہوتا ہے. جھومتے جاتے ہیں لیکن اس بے ہوشی میں اتنا ہوش رکھتے ہیں۔

قطع سفر ہستی و آرام فنا ہیچ رفتار نفس بیشتر از لغزش پا ہیچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

زبان کی سلاست، ترکیبوں کی صفائی اس سن میں کیسے آسکتی تھی لیکن خیال کی ندرت، طبیعت کی جدت اس نومشقی میں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

عارف اور عاقل سب ہی کہتے آئے ہیں کہ نامحدود کا پورا پتہ کیسے چلا سکتے ہیں اور جو مطلق ہے اسے کوئی مقید اپنے عقل و فہم کی گرفت میں کب لا سکتا ہے؟ یافت ہر ایک کی بس اپنے مرتبہ کے لائق ہوتی ہے غالب نے بھی اس حقیقت کو پایا ہے اور ذرا دیکھئے گا کس شاعرانہ بانکپن سے اسے اپنے انداز میں دہرایا ہے۔

تھک تھک کر ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

(ص: ۸۰، ۸۳)

شکوہ جوابِ شکوہ

اقبال کے شکوہ میں (شاعر اس وقت تک شاعرِ اسلام بن چکا تھا) بندہ اپنے خالق سے گویا روٹھ کر کہتا ہے کہ واہ بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر تو لطف و نوازش کی یہ بارشیں اور ہم اہل توحید کی یہ حالت زار کیا یہی ہماری وفا کیشیوں کا صلہ ہے۔ یہی ہماری توحید پرستی کا انعام ہے؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی — اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی — کس کی تکبیر سے دنیا تیری بیدار ہوئی؟

لیکن ''شکوہ'' نام ہی کا شکوہ ہے۔ مضمون وہی حمد و مناجات کا اس لفافہ کے اندر بھی موجود ہے۔ ہر طنز میں عبدیت کی چاشنی۔ ہر گلہ میں توحید پرستی کی شیرینی۔

اقبال کی اردو شاعری کی شہرت و عظمت کی اصل بنیاد یہی شکوہ ہے۔ خوب چلا خوب پھیلا۔ جو کچھ بھی نہ سمجھے انھوں نے بھی مزے لے لے کر پڑھا اور جو مطلب بالکل الٹا سمجھے انھیں تو گویا آزاد خیالی کے لئے ایک سند و دستاویز ہاتھ آ گئی۔

حکیم ملت کہ ملت کا ناز تھا قوم کے رگ و ریشہ سے واقف تھا، بھانپ گیا جو آب حیات کا قطرہ تھا وہ شیشوں اور گلاسوں تک پہنچتے پہنچتے زہر کی بوند بن گیا۔ معاً پلٹا اور شکوہ کے جواب میں ''جوابِ شکوہ'' کہہ ڈالا۔ جوش و خروش وہی زورِ بیان وہی۔ البتہ حقائق زائد۔ حقیقتوں کی تعبیر کھلی ہوئی اور صداقتوں کا اظہار فاش و برملا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ ''وعدے تو مسلموں اور پرستارانِ توحید کے لئے تھے تم مسلم اور موحد ہو کب؟ نظر قال پر نہیں اپنے حال پر کرو اپنے اعمال پر کرو۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو — پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو؟
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

عوام اپنے جذبات کی ترجمانی ''شکوہ'' میں زیادہ پاتے ہیں اس لیے پست مذاق طبقہ آج تک شکوہ پسند ہی چلا آ رہا ہے حالانکہ ''جوابِ شکوہ'' کی سطح ''شکوہ'' سے کہیں بلند ہے۔ ''شکوہ'' والا اقبال ایک صاحبِ حال سالک ہے ''جوابِ شکوہ'' والا اقبال ایک صاحبِ مقام عارف ہے۔ پہلے کے قدم اقلیم

قلب کی وادیوں میں. دوسرے کی نگاہ فضائے روح کی بلندیوں میں۔

(ص: ۹۱،۹۲)

اکبرالہ آبادی

ایک مختصر سی لیکن صاف ستھری محفلِ مشاعرہ لکھنؤ میں آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال قبل آراستہ ہے. طرح کی زمین ہے ''ازل سے''، ''کل سے''. ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا ۔

الجھانہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے مانگی نہ مدد دل نے مرے طولِ اجل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں. کلام میں بانکپن تھا ہی اس غضب کا اور اس شعر پر محفل لوٹ لوٹ گئی ۔

ان کی نگاہِ مست ہے لبریز معانی ملتی ہوئی تاثیر میں حافظؔ کی غزل سے

نگاہ یار کی مستی بہتوں نے باندھی ہے اور شراب سے اسے بارہا تشبیہ دی جا چکی ہے حافظؔ کی غزل تک اس کا رُتبہ پہنچا دینا یہ اسی شاعر کی جدت طبع کا کرشمہ تھا. اور عجب کیا جو خود خواجہ حافظؔ کی روح بھی یہ اچھوتی داد سن کر وجد میں آ گئی. اور پھر جب اس شعر کی نوبت آئی ۔

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ ہیبت تیرے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

اور معاً بعد اس شعر کی ۔

درجہ متحیر کا ہے خود سے فرو تر ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

تو جو اہلِ دل تھے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور اہلِ معرفت کی زبان پر بے ساختہ مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے جاری ہو گئے. لیکن شاعر نے جب غزل کا یہ مصرعہ پڑھا ع

قرآن شاہد ہے کہ خدا حسن سے خوش ہے

تو سامعین میں ایک بڑے گہرے مذہبی شخص خان بہادر منشی اطہر علی کاکوری مرحوم موجود تھے ان کے

تیور پر کچھ بل پڑنے لگے۔ حساس شاعر فوراً بھانپ گیا اور جھٹ سے پہلے مصرعہ کو مکرر پڑھ پورا شعر یوں سنایا ۔

قران ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے کس حسن سے؟ یہ بھی تو سنو حسنِ عمل سے

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد و تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی۔ اور خان بہادر نے تو بے اختیار اٹھ کر شاعر کو اپنے گلے سے لگالیا۔

ان شاعر صاحب کو آپ نے پہچان لیا؟ یہی تھے سید اکبر حسین اکبر، اپنے وقت کے ایک نامور ترین شاعر ہوئے اپنے رنگ میں فرد، برجستگی اور بدیہہ گوئی کے بادشاہ تھے۔ ایک نمونہ تو ابھی آپ سن چکے ہیں۔ معنٰی آفرینی ان کا حصہ تھی۔ مضمون ہر قسم کے جیسے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے کھڑے رہتے تھے، جب جس مضمون کو چاہا بہترین لفظی صنعت کاری کے ساتھ ادا کر دیا۔ سوچنے میں معمولی بات چیت کے وقت ہم کو آپ کو کچھ نہ کچھ وقت لینا پڑتا ہے انھیں شعر کہتے اتنی دیر بھی نہ لگتی۔

حضرت اکبر بوڑھے ہو چکے تھے عمر ۶۴، ۶۵ سے زائد ہو چکی تھی لیکن ذہانت، شوخی، برجستگی، معنٰی آفرینی، لطافتِ زبان، حسن بیان یہ سب اوصاف اس وقت بھی جوان تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے اور بعض دفعہ بے بات کی بھی بات پیدا کر لیتے۔ گفتگو میں خود ہنستے کم تھے۔ دوسروں کو ہنساتے بہت زیادہ تھے اور ہنستے ہنساتے کبھی رلانے بھی لگتے۔ کوئی چوٹ ایسی دل پہ لگا دیتے کہ سننے والے کا دل درد سے بھر آتا۔ راگوں میں سنا ہے کوئی راگ ایسا بھی ہوتا ہے جو ساز کی جگہ سوز پیدا کر دینے کی تاثیر رکھتا ہے۔

(ص:۹۹،۱۰۰)

کربلا اور اسلام

حکومت و حاکمیت کو خاندان امیہ کے ہاتھ میں آئے ہوئے سالہا سال ہو چکے ہیں۔ اور وسیع و عریض دنیائے اسلام اب دو مستقل کیمپوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک کا مرکز عراق اور اس کا شہر

کوفہ، دوسرے کا مستقر شام اور اس کا شہر دمشق صوبۂ حجاز اور ارض حرمین بین بین میں تخت حکومت پر قابض ایک ایسا شخص جس کا ماضی جو کچھ بھی رہا ہو۔ حال و مستقبل دونوں اخلاقی اعتبار سے دوست و دشمن سب کے نزدیک ایک ناقابل اطمنان اور جس کی زندگی کو ایک معیاری جانشینِ رسول کی نسبت دور کی بھی نہیں۔ عین اسی فضا اور اسی ماحول میں ایک قافلہ ارض حجاز سے سرزمین عراق کی طرف سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سالار قافلہ بنی ہاشم کے سردار اعظم، رسولؐ کے محبوب نواسہ اور نورِ عین۔ خود سے نہیں آرہے ہیں۔ اہلِ عراق کی مسلسل درخواستوں پر متواتر عرضداشتوں پر تشریف لا رہے ہیں۔ قافلہ فوجیوں کا لشکر نہیں اور نہ ساتھ سامانِ جنگ۔ افراد قافلہ، سالارِ قافلہ کے خاندان کی بیویاں، کچھ قریب کے اعزاء اور کچھ مخلص رفیق اور جانثار مخدوم۔ مرد چھوٹے بڑے سب ملا کر ۷۲۔ حکمرانِ وقت کے پیادے اور سوار راہ میں راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک عہدِ اطاعت نہ کرو گے آگے قدم اٹھانے کی اجازت نہیں، رسولؐ کے نواسہ کہتے ہیں کہ ''جنگ و محاربہ ہرگز میرا مقصود نہیں۔ کوئی جنگجو حریف بھلا اس بے سروسامانی کے ساتھ بھی گھر سے نکل سکتا ہے؟ میں تو صرف اس غیر عادلانہ اور فاسقانہ نظامِ حکومت کی اطاعت اور تسلیم و قبول سے معذور ہوں۔ اب ممکن تین صورتیں ہیں۔ یا تو اپنے بادشاہ کے پاس لے چلو کہ میں اس سے سوال و جواب کر لوں گا۔ یہ نہیں منظور تو مجھے ارض حجاز واپس جانے دو، میں سیاست سے الگ گوشہ نشین ہو کر عبادت اور دینی مشغلوں میں مصروف رہوں گا، اور یہ بھی گوارہ نہ ہو، تو مجھے مملکتِ اسلامی کی سرحدوں سے چلا جانے دو۔ میں منکروں اور کافروں سے مقابلہ و جہاد کرتا رہوں گا''۔۔۔۔ دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ مصالحانہ و مصلحانہ، منصفانہ پیام کسی ایک فریق نے کسی دوسرے فریق کو کیوں دیا ہوگا؟

(ص: ۱۱۱)

نیکی کر اور دریا میں ڈال

''نیکی کر دریا میں ڈال'' بہ ظاہر ایک عجیب سی ہدایت معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا کی ذرا اگر

نیکی کے مفہوم وحقیقت پر غور کرلیا جائے تو بات بالکل صاف اور سیدھی نظر آنے لگتی ہے تنکے کے اوٹ پہاڑ ہے۔ نیکی نام کسی مادی خارجی مجسم چیز کا نہیں۔ جس طرح بدی بھی کسی ایسی خارجی چیز کا نام نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو جو قوتیں فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ ان کا صحیح، معیاری صحت مندانہ استعمال ہی نیکی ہے (جس طرح اس کے برعکس ان کا غلط، مریضانہ استعمال بدی ہے) اس کارخانۂ عالم کو اگر کسی نے اندھے کی لاٹھی اور بالکل بے مقصد سمجھ لیا ہے تو اس سے گفتگو تو کسی اور موقع پر کی جائے گی لیکن اگر یہ دنیا اور اس کے سارے موجودات کچھ مقصد وغرض رکھتے ہیں جیسا کہ ہندو، مسلم، بودھ، مسیحی، سکھ اور پارسی سب ہی مانتے چلے آئے ہیں تو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ انسان سرآمد کائنات ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی مقصد اور بہت بڑا مقصد اپنے وجود کا رکھتا ہے اور اسے جسم وروح، عقل وہوش، دل ودماغ کی جتنی بھی قوتیں عطا ہوئیں ہیں سب اسی مقصد کے انجام تک پہونچانے کے لئے ملی ہیں۔ اور نیکی یا عبادت یہی ہے کہ انسان اپنی ہر خداداد قوت کو اس کے صحیح مصرف میں یعنی خدا کے بتلائے ہوئے مصرف میں لائے۔

اور جب نیکی کی یہ حقیقت ایک بار ذہن نشین ہوگئی تو اب وہ ''دریا میں ڈالنے'' والی ہدایت بھی روزِ روشن کی طرح صاف اور بے غبار ہوگئی۔۔۔۔ فرض کیجئے کہ آپ کے پڑوس میں ایک صاحب فاقہ سے ہیں اور آپ کے پاس فراغت کے ساتھ کھانے، پینے دینے کو کئی کئی کھانے موجود ہیں تو اب جس طرح اپنا فاقہ توڑنے اور اپنی جان کو زندہ سلامت رکھنے میں آپ کی امداد قبول کرنے میں مجبور ہیں۔ اسی طرح آپ کی اپنی انسانیت کی تکمیل کے لئے اور اپنی حیاتِ روحانی کو قائم وبرقرار رکھنے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ آپ ان کی امداد کریں۔ اخلاص کے معنی بھی یہ ہیں کہ جو کچھ بھی دیا جائے، اپنے مالک وپروردگار کی رضاجوئی کے لئے ہو کہ اسی میں تکمیل اپنی عبدیت وبشریت کی ہوتی ہے۔ اور اسی سے ''قربِ حق'' کی منزلیں طے ہوتی ہیں تو اگر کسی کے ساتھ سلوک کرتے ہوئے آپ کو خیال اس سے معاوضہ وصول کرنے کا آ گیا تو یہ صاف سوداگری بلکہ سودابازی ہوگئی۔ اور عبادت باقی ہی کہاں رہی! عبادت کا تو جوہر ہی اخلاص یا تعمیلِ ارشادِ ربانی ہے۔

بائبل کے جو دو ٹکڑے ہیں ایک یہود کے لئے سند اور دوسرا عیسائیوں کا مستند. دونوں کے اوراق اسی آواز سے گونج رہے ہیں. اور آپ کی سرزمین ہند کی کتاب معرفت بھگوت گیتا کا تو پوچھنا ہی کیا سری کرشن جی کی تعلیم اسی سے اول سے آخر تک لبریز ہے کہ جو کچھ کرو اپنا دھرم، اپنا فرض سمجھ کر کرو. اپنی ڈیوٹی کو ہر حال میں ادا کرتے رہنا ہی عبادت ہے. یہی عبادت ہے. یہی نیکی ہے. یہی جنت کی راہ اور یہی روحانیت وسعادت کے تکملہ کی شاہ راہ ہے۔

بات بالکل صاف اور سیدھی ہے کاش ہم سب کی سمجھ میں آجائے اور ہمیشہ یاد رہے! بات ختم ہونے سے پہلے ایک چھوٹی سی بات اور سُن لیجئے. جنگِ عظیم سے کچھ دن پہلے ایک نامور ہندوستانی طالب علم جرمنی گئے ہوئے تھے اتفاق کی بات کہ اجنبی شہر میں خاصی رات گئے یہ نیچے گلی کوچے سے بالکل ناواقف ریل ہی سے ساتھ ایک جرمن کا ہو گیا تھا وہ ان پردیسی کو ایسے ناوقت سواری کر کے ہوٹل لے گیا اور وہاں ہر طرح کا پورا بندوبست ان کے آرام کا کیا اور جب اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کرنے کے بعد ان سے رخصت ہونے لگا تو قبل اس کے یہ کچھ کہہ سکیں بولا کہ اگر آپ شکریہ ادا کرنا چاہیں گے تو مجھے تکلیف ہوگی یہ دنگ رہ گئے کہ اس دنیا میں اب بھی اس ظرف کے لوگ پڑے ہوئے ہیں!۔۔۔۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال محض ایسی ہدایت نہیں جو کتابوں ہی کی زینت ہوئی ہے. برتنے پر آجائے تو ہم آپ سب ہی اسے برت سکتے اور اپنے سرمایہ سکون وراحت میں بے انتہا اضافہ کر سکتے ہیں۔

(حصہ دوم ص: ۱۳)

مذہب اور قومیت

انسان الجھنے اور جھگڑنے پر آئے تو ہیرے میں بھی کیڑے نکال سکتا ہے اور کوئی سینہ زور جی پر رکھ لے تو دو اور دو چار کی جگہ پانچ بھی ثابت کر دکھانے کا دعوی کر سکتا ہے لیکن ہے یہ کہ مذہبیت اور وطنیت کے درمیان کوئی شے آپس میں ٹکرانے کی اور ایک دوسرے سے الجھنے الجھانے کی ہے ہی

نہیں قوم کی دوستی ہوئی یا ملک ووطن کی محبت یہ تو ایک جذبہ ہے فطری اور طبعی، گورے، کالے، بڑے چھوٹے، صاحب اور ''نیٹو'' امیر غریب، بوڑھے بچے سب کے دلوں میں موجزن. بلکہ انسان تو انسان ہے. سمجھ دار حیوان تک اس سے خالی نہیں کتے کو دیکھئے تو اپنی گلی کا دیوانہ، بلی پر نظر کیجئے تو اپنے ٹھکانے کی حریص، گھوڑے پر نگاہ دوڑائیے تو اپنے تھان کا عاشق. تو یہ تو ہوئی وطن کے ساتھ جنم بھومی کے ساتھ مرز بوم کے ساتھ طبعی، فطری، جبلی محبت. اب رہا مذہب تو وہ اس سے بالکل الگ نام ہے ایک آئیڈیل کا جس کے ماتحت زندگی کا ایک ایک قدم اٹھایا جائے، نام ہے ایک راستہ کا جو مخلوق کو خالق سے ملادے اور خاکی کو جنت تک پہونچادے وہ راستہ جس پر چل کر زندگی کا ایک ایک نشیب وفراز، ایک ایک پیچ وخم، امن وسلامتی کے ساتھ، دل کے سکھ اور چین کے ساتھ بسر ہو اور یہ دل کا چین ابدی ہو، یہاں کی زندگی ختم ہو جائے اور یہ نہ ختم ہو. یہ نور دوسری زندگی میں بھی ساتھ دیئے جائے بلکہ یہاں سے وہاں ہزار درجہ بڑھ جائے۔

مذہب سوفی صدی ایک مقصدی چیز ہے اور اس کی ایک اہم اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عقیدہ اور کردار کی جن چیزوں پر بھی فلاح ونجات کا دارومدار ہے وہ سب کی سب اختیاری ہیں. یہ اختیاری احکام اور فرائض کہیں بھی انسان کے جبلی تقاضوں اور فطری مطالبوں سے آ کر نہیں ٹکراتے. مذہب کے قانون کی یہ کوئی سی بھی دفعہ نہیں کہ پیاس کے وقت پانی نہ پیا جائے بھوک کے وقت کھانا نہ کھایا جائے اور نیند کے وقت سویا نہ جائے. سچا مذہب تو ان فطری جذبات کی اور قدر کرتا ہے. ان کی پرورش میں لگا رہتا ہے اور ان کی پاس داری کو اپنے نقشۂ ہدایات میں ایک ممتاز ومعزز جگہ دیتا ہے۔

(ص: ۱۸)

ہمہ گیر اخوت

اگر یہ سچ ہے کہ سارے انسان چاہے گورے ہوں یا کالے، لال ہوں یا پیلے، امیر ہوں یا غریب، مشرق کے ہوں یا مغرب کے، چین کے ہوں یا فلسطین کے، بولی انگریزوں کی بولنے والے ہوں یا بر ماوالوں کی، اولاد ایک آدمؑ اور ایک حواؑ کی ہیں تو یہ بات صاف اور نتیجہ ظاہر ہے کہ سب

آپس میں بھائی بھائی ہیں، ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں، ایک ہی دریا کی لہریں ہیں، ایک ہی پھول کی پتیاں ہیں .اور یہ عقیدہ روئے زمین کے مسلمانوں کا عیسائیوں کا یہودیوں کا تو خیر ہے ہی، دوسرے بھی جتنے مذہب ہیں سب نے کسی نہ کسی طرح اسی کو مانا ہے لفظوں کے الٹ پلٹ اور اصطلاحوں کے ہیر پھیر سے کہیں حقیقتیں تھوڑی ہی بدل جاتی ہے۔

یہ تو ہوئی مسئلہ پر گفتگو ذرا مذہبی بنیاد ہر، اب محض عقلی حیثیت سے سوچیے ساری دنیا میں فطرت کی طرف سے جو نظم ونظام اور ضابطہ وانتظام ہے وہ ہمیں کس نتیجہ کی طرف لے جاتا ہے؟ ہر شے دوسرے کی محتاج، ہر وجود قدم قدم پر دوسرے کے مدد کا حاجتمند .بڑے چھوٹے کی کوئی خصوصیت نہیں .سردار کے بغیر فوج اگر بے سری رہ جاتی ہے تو خود افسر بھی بغیر سپاہیوں کے ایک بلا بارات کا دولہا .رعایا اگر چتر شاہی کے سایہ کے بغیر منتشر وآوارہ، بے والی وبیوارث تو بادشاہِ سلامت بھی بغیر رعایا کے لفظ بے معنٰی وسایہ بلا جسم وہم بغیر حقیقت، چمار اور موچی مہتر اور دھوبی، گھسیارے اور نائی اگر یہ اپنے اپنے کام چھوڑ دیں تو پھر دیکھیے وکیل صاحب اور ڈاکٹر صاحب ڈپٹی صاحب اور کلکٹر صاحب ،نواب صاحب اور راجہ صاحب کی کیا گت بن کر رہتی ہے .ان کے کام ان سے اٹکے ہوئے .ان کی ضرورتوں کی زنجیر ان کے دامن سے بندھی ہوئی .نہ کوئی کسی سے بے نیاز، ہر فرد دوسرے فرد کی طرف ہمہ احتیاج تو سوا اس کے کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ عمل میں ایک دوسرے کو بھائی بنائے، دل سے بھی بھائی سمجھے اور زبان سے بھی بھائی کہہ کر پکارے۔ بات اتنی صاف اور موٹی ہے کہ اب اس کو زیادہ پھیلایا کیا جائے .سوا اس کے کہ اب یہ دیکھ لیا جائے کہ اس راہ میں حائل کون کون سے پتھر ہوتے ہیں اور ہو سکے تو انھیں دور کر دیا جائے۔

ہمہ گیر اخوت کا سب سے بڑا دشمن نیشنلزم یا قومیت کا چلا ہوا تصور ہے .رہی دوستی یا قوم پروری بجائے خود بری چیز نہیں بلکہ انسان کے لئے تو عین ایک جذبہ فطری ہے جیسے گھر بار کی محبت ویسے ملک وقوم کی محبت اور وہ انسان ہی کیا جس کا دل اس جذبہ طبعی سے خالی ہو .نیشنلزم کا جو عام اور چلا ہوا تخیل یہ ہے کہ اپنی قوم دوسروں سے برتر وافضل اور اپنا ملک دوسروں کا سرتاج ہے اور ان پر

ایک افسرانہ فوقیت اور بالا دستی رکھتا ہے یعنی یہی پندارِ تفوق جس طرح اپنے میں پیدا ہوجاتا ہے دوسروں میں بھی اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے ملک سے متعلق پیدا ہوجاتا ہے اور یہی سے ابتدا باہمی تصادم کی ہوتی ہے۔

مذہب نے اس کا علاج یہ بتایا ہے کہ نظر خلق سے زیادہ خالق پر اور کثرت سے زیادہ وحدت پر رہے اور اصل کو بہر حال بہر صورت شاخوں پر مقدم رکھا جائے ۔۔۔۔تاریخ اور تجربہ دونوں کی یہ شہادت ہے کہ مذہب کا بتایا ہوا یہ نسخہ تیر بہدف اور یہی علاج اب تک اکسیر ثابت ہوا ہے۔

جاہلیت کو بے سوچے سمجھے آج ہم سب برا کہنے کو تیار رہتے ہیں لیکن غور کیجئے آج ہم بھی ٹھیک اسی سطح پر ہیں یا نہیں. وہاں بھی لڑائی کے لئے بہانے ڈھونڈے اور الزامات تراشے جاتے تھے اور ایک قبیلہ دوسرے سے اتنی سی بات پر بھڑ جاتا اور اس کی جان کو آجاتا تھا کہ اس نے چشمہ پر اپنے مویشیوں کو، اپنے گلّوں کو پانی پہلے کیوں پلالیا. اس پر ہنسئے مسکرایئے نہیں. آج بھی جو بڑی بڑی مہذب قومیں ایک دوسرے پر چڑھائی کرنے کے لئے اپنی ذہانت، طباعی، باریک بینی کے جوجوہر دکھاتی رہتی ہیں وہ کیا اگلوں کی حیلہ تراشیوں سے کچھ کم ہے!۔

غرض یہ کہ برادر نوازی اور عالمگیر صلح وسازگاری تو فرد کی جسمانی صحت کی طرح ہر قوم کے لئے ایک طبعی، فطری چیز ہے. ہر قوم کا قدرتی رجحان اور فطری تقاضا یہی ہونا چاہیے اور یہی رہتا بھی ہے لیکن ہر انسان جس طرح بد پرہیزیاں کر کے اپنے کو بیمار بناڈالتا اور اپنے جسم کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی اپنے اصل مزاج اور صحیح وصالح فطرت کو مختلف اخلاقی بے احتیاطیوں اور بد پرہیزیوں مثلاً کبر وحرص وہوس، رشک وحسد سے بگاڑ لیتی اور اپنے کو خواہ مخواہ جنگ وجدل، فتنہ فساد پر آمادہ کرلیتی ہیں. یہ صورت حال محض ان کی مریضانہ ذہنیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور انجام اکثر یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی تباہی وبربادی کی دھن میں ان کے ساتھ اپنی بھی تباہی وبربادی کا سامان کرلیتی ہیں۔

قلب حق آگاہ اور دیدہ عبرت نگاہ، عقل عافیت کوش اور گوش بنصیحت ہوش کا تقاضا یہ ہے

کہ قومیں اپنے کو پہچانیں، اپنی شخصیت کے حدود و قیود کو جانیں، خود شناسی کو کام میں لائیں فطرت کی طرف سے ڈھیل اور مہلت پر نہ جائیں عبدیت سے بغاوت نہ کریں. الزامات اپنے ہمسایوں پر نہ گڑھیں دوسروں کے حقوق اپنے سے سمجھیں انانیت کے نشہ میں سرشار ہو کر ان سے نہ الجھیں. خودی خود پرستی کو مٹائیں، عبدیت و خدا ترسی کو بڑھائیں. دنیا کو جنت کا نمونہ بنائیں، شر و فساد کے دوزخ سے اپنے کو اور سب کو بچائیں۔۔۔۔ یہی ہے زندگی کی راہ اور بندگی کی شاہراہ!۔

(ص: ۲۲)

ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

ہاں صاحب کیوں بدلیں؟ ایک بار نہیں سو بار کہتے ہیں کیوں بدلیں؟ وہ تو اپنے طور طریقے بدلنے سے رہے. الٹی ہم سے فرمائش کہ اپنی وضع قطع رسم یک قلم بدل ڈالیں آخر کیوں بدلنے لگے؟ کیا ہم ایسے ویسے ہیں؟ ہماری وضع داری گویا کوئی چیز ہی نہیں ٹھہری. ہماری خودداری کے جیسے کوئی معنٰی ہی نہ ہوئے! خوب رہی. نا صاحب ہم وضع بدلنے والے نہیں اور ہزار بار نہیں!۔۔۔۔ تو شاعر کا مصرعہ

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

تو اسی تیکھے طنزیہ مفہوم میں ہے اور اگر اس کی شرح کرنا ہے تو لامحالہ یہی تیور یہی دم خم اختیار کرنے پڑیں گے بہ قول شخصے ع

شرح وہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو!

لیکن شاعری کی خیالی رومانی فضا سے اتر کر اگر حقیقت پسندی کی ٹھوس زمین پر قدم اٹھاتے رہنا ہے تو البتہ یہ بات سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ہے کہ ہم اپنی گھریلو وضع بدلیں یا نہ بدلیں اور بدلیں بھی تو آخر کیوں بدلیں؟

لیکن جواب کی منزل سے پہلے ایک لفظی الجھاؤ اور ہے. پہلے تو چھٹکارا اسی سے حاصل کیجئے. وضع بدلنے کے معنٰی حاشا و کلا یہ نہیں کہ آپ وضع داری کی شریفانہ عادت چھوڑ دیجئے اور

خدانخواستہ بدوضعی کی پستی میں اتر آیئے!۔۔۔۔یہ زبان کا جیتا جاگتا عجائب گھر بھی کسی بھول بھلیاں سے کم نہیں معمولی سے لفظ کے مادہ میں ذرا اگل پچھل کر دیجئے اور معنٰی ومفہوم کی شگوفہ کاریوں کے مزے لینے لگیے۔ بھلا کہاں وضع کی سادہ ہیئت ہر رنگ وکیف سے الگ، نہ اس میں نہ اس میں۔ اور کہاں جو تمکنت کے ساتھ اس پر قائم رہ گئے تو وضع داری کے بام فلک نما پر جا پہنچے اور پھر خود ذرا پھسلے تو ننگ وناموس کو لٹاتے ہوئے چٹ بدوضعی کے کوچہ میں آ گرے! توبہ ہے!

اب اس لفظی چکر سے نکل کر آیئے تو سامنا اسی سوال کا، بال بال ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ کہ اپنی گھریلو زندگی میں تبدیلیاں کیوں کی جائیں؟ جواب مختصر سا لیکن کافی یہ ہے کہ کیوں نہ کی جائیں اور خیر یہ نفی واثبات کی بحث الگ رہی تبدیلیاں تو خود بخود ہو رہی ہیں ہم چاہیں یا نہ چاہیں زمانہ کے موکل کا زبردست ہاتھ تبدیلیاں کرائے بغیر مانتا کب ہے؟ زمانہ کے گزرنے کے معنٰی ہی یہ ہیں کہ گھر ہو یا باہر مکین ہو مکان، جو کل تھا وہ آج نہیں ہیں اور جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا۔

یہ روزمرہ کی بیتی ہوئی سرگزشت ہے چند سال کی مدت میں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے اور دنیا والے کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ دوسو برس ادھر کمرے کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ بڑے بڑے امیروں کی حویلیاں، بیگمات اور بادشاہوں کے محل تک چھان ڈالئے سب کھلے ہوئے دالانوں اور شہ نشینوں اور بغیر کواڑ اور دروازہ کے سائبانوں اور دیوان خانوں ہی میں گزرتے تھے اور محض پردے ڈال ڈال کر مع اپنے پورے خاندانوں کے زندگی بسر کر لے جاتے تھے۔ لڑکیوں اور داماد لڑکے اور بہوئیں بھائی اور بھابھیاں سب کے سب، عروسی زچگی وغیرہ کے مرحلے کہنا چاہیے انھیں کھلے ہوئے مکانوں میں طے کر لیتے تھے۔ اب ہم سے کوئی اس طرح کا بے کمروں والا مکان کہے تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آئے۔ بغیر کمرے کے ننگا بوچا سا مکان بھی کوئی مکان ہوسکتا ہے اور کمرہ بھی ایک نہیں اندر باہر ملا کر دو چار تو ہوں۔

زمانوں کے اثرات مکان پر کیسے نہ ہوں یہ ایک ہلکی سی مثال تو تعمیری تبدیلیوں کی بیان ہوئی۔ اب اس پر قیاس اور دوسری چیزوں کا کیجئے۔ ایک قریب اور سامنے کی چیز مکان کا فرنیچر ہے پہلے

مکان کی آرائش کے لئے فرش فروش تھے. معمولی گھروں میں چارپائیاں اور بنس کھٹیاں چٹائیاں اور دریاں. اس سے اونچے ہوئے تو سوزنی اور چاندنی جاجم اور قالین تخت اور مونڈھے اور آگے بڑھے تو گدّے اور اب جب ''صاحب'' سے خلا ملا بڑھا اور ان کی تہذیب و معاشرت نے آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنا شروع کی تو چوپالوں بیٹھکوں، دیوان خانوں کے بجائے ڈرائنگ روم سجنے لگے. میز اور کرسیوں کا چلن عام ہوگیا. دفتر اور اسکول والے اسٹول، بنچ اور ڈسک سے ناآشنا نہ رہے اور آگے بڑھ کر کوچ اور صوفے اور آرام دہ کرسیاں، طرح طرح کی آرام دہ اور پر تکلف، مخملی، گدے دار اور کمانی دار کرسیاں بہار دکھانے لگی. کہاں تو جھونپڑیوں کو چراغ اور ڈیوٹ اور محلوں کو شمع کافوری اور فانوس جھاڑ اور کنول اور گلی کوچہ کو مشعلیں دار قندیلیں روشن کئے ہوئے تھیں اور کہاں جب نئی روشنی کی آندھی آئی تو یہ سب ٹمٹمانے لگے. اور پھر جب دیکھنے والوں کی آنکھ کھلی تو دیکھتے کیا ہیں پہلے مٹی کے تیل کی لالٹینیں اور لمپ، شیشہ کی چمنیوں اور گلوب کے ساتھ رات کو دن بنائے ہوئے ہیں. اور اس کے بعد جو دور آیا تو گیس کے ہنڈے اور بجلی کے قمقمے آسمان کے تاروں پر چشمک زنی کرنے لگے! مکانوں کے در و دیوار پر کہاں تو باپ دادا کے وقت بڑی خوش خطی اور صناعی سے لکھے ہوئے قطعے اور طغرے یا مقاماتِ مقدس کے نقشے لٹکتے رہتے تھے اور کہاں اب جو نئی تہذیب نے پر پرزے نکالے تو ڈرائنگ روم اور بڈروم میں ان کی جگہ طرح طرح کی تصویروں اور مرقعوں نے لے لی. بعض شائستہ اور شریفانہ اور بعض اب بس کیا کہا جائے ''ناگفتہ بہ'' ہی کا جامع لفظ ان کے لئے ہے۔

زمانہ کا ہاتھ کون پکڑ سکا ہے. ہم چاہیں یا نہ چاہیں. تمدن معاشرت تہذیب تعلیم بلکہ سیاست کی بھی آئے دن کی تبدیلیوں کا اثر ہمارے گھروں کے ظاہر و باطن پر پڑنا لازمی ہے. اس سے چارہ نہیں اور نہ کوئی راہ بچنے کی ہے لیکن تبدیلیوں تبدیلیوں میں فرق ہے. بعض کو آپ نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے اور بعض ایسی ہیں کہ آپ ہاں ہاں کرتے ہی رہے اور وہ گھستی ہوئی پلٹتی ہوئی چلی آئیں. کوشش اپنی والی اس کی رکھیے کہ قابل قبول صرف انھیں تبدیلیوں کو سمجھیے جو عقل سلیم کے معیار پر پوری اتریں اور آپ کی روایات اخلاق و حکمت کے مطابق ہو۔۔۔ اندھا

دھند ہر نئی چیز پر نہ گریئے اور نہ ہر نئے نام کے سایہ سے بدکیے. سلامتی کا راستہ عقل واعتدال کا ہے۔

(ص: ۳۲)

خانہ کعبہ

مسلمانوں کا خدا، آپ جانیے کہ ہر لطیف سے لطیف تر، کوئی مکانی ومقامی خدا تو ہے نہیں. مکان ومقام کی ہر قید سے آزاد، سمت وجہت کے ہر شائبہ سے بے نیاز.

اے دوکمال حسن عجب تر ز ہر عجب!

تو ایسا خدائے بے ہمتا پتھر اور چونے کی کسی عمارت کو "اپنا" گھر کہہ کر پکارے، تو فرمایئے کہ فخر وامتیاز، اور امتیاز کیا معنی، صاحب یہ کہئے کہ ناز کا کوئی درجہ اس کے آگے اور اس سے اونچا باقی رہ سکتا ہے؟ یہ "اپنائیت" کی نسبت یقیناً مجازی ہے. اور ایک مجاز کیا. یوں کہئے کہ مجاز در مجاز کے ستر پردوں میں لپٹی ہوئی. پھر بھی ایک نسبت ہے تو! کتنی بڑی اور کیسی پیاری. کتنی لطیف اور کیسی عزیز. دنیا کی کوئی سی بھی عمارت اس مرتبۂ مخصوص میں نہ اس کی حریف!۔۔۔۔طور تو ایک پہاڑ تھا. تاب دم بھر کی برق تجلی کی نہ لاسکا. ریزہ ریزہ ہوگیا. اور ایک ہمارا کعبۃ اللہ ہے، ہر آن اور ہر لحظہ ایک تازہ تجلی کا حامل، شانِ جمال وکمال کا مستقل تجلیہ اور پھر جوں کا توں قائم ودائم. اللہ اللہ. بیت اللہ کا ظرف۔

اب ذرا چشم تصور کے سامنے ایک مسجد کا نقشہ لے آیئے. خوب عریض خوب طویل، لمبان کوئی ساڑھے پانچ سو فٹ کی اور چوڑان بھی کوئی پونے چار سو فٹ کی. اس لق ودق مسجد کے صحن کے بیچوں بیچ ایک اونچا کمرہ بنا ہوا ہے. چوکور سا اور سیاہ پتھر کا اور پتھر آس پاس کی خشک پہاڑیوں سے کاٹ کر لائے ہوئے. نیچے کرسی سنگ مرمر کی ۱۰ انچ دبیز. عمارت مربع نہیں صرف مربع نما، طول عرض سے کچھ نکلا ہوا. لمبان کی دیواریں ۴۰ فٹ اور چوڑان کی ۳۵ فٹ کی اور عمارت کی اونچائی ۵۰ فٹ کی. چاروں زاویئے چار مختلف ارکان سے موسوم. شمالی زاویہ کا نام رکنِ عراقی، جنوبی زاویہ کا رکنِ یمانی، مغربی کا رکنِ شامی اور مشرقی کا رکنِ اسود. مشہور معروف پتھر حجر اسود اسی دیوار میں نصب، زمین سے

۵ فٹ کی بلندی پر طواف کے وقت اسے بوسہ دیجئے اور اپنے دل کا ارمان نکالئے۔ داخلہ کا دروازہ صرف ایک۔ جس پر چھوٹا سا زینہ چاندی کا لگا ہوا ملحقات کعبہ بھی سب کعبہ کے ذیل وضمن میں معزز ومحترم ہیں۔ حطیم، ملتزم، مطاف، مقام ابراہیم، چاہ زمزم وغیرہ، اور عظمت وتقدس کو ذرا دیر کے لئے الگ رکھئے۔ زیبائی اور دلکشی کے لحاظ سے بھی سب سے بڑھ چڑھ کر خود یہ سیاہ پوش خانہ کعبہ ہے۔ ہر سال تازہ سیاہ غلاف اس کے زیب وزینت میں اضافہ کرنے والا۔ ایک پیکرِ حسن وجمال ایک مجسمہ خوبی ومحبوبی۔ جب تک چاہے گرداگرد چکر لگائیے اور جان نچھاور کرتے جایئے۔ پیر تھک جائیں گے دل نہ بھرے گا یقین کی تجلیٔ جمال کی تاب تو کوئی اہل دل ہی لاسکتا ہے۔ مکان کے جمال بے مثال کا مشاہدہ ہم اہل ظاہر بھی کرسکتے ہیں۔ بلا کی دلکشی غضب کی جاذبیت! لیلیٰ شب رنگ کی دلکشی اور محبوبی ایک معمائی ہوئی ہے ہمارے شاعروں نے بہت ٹامک ٹوئیں مارے۔ زمین وآسمان کے قلابے ملائے۔ یہ سیدھی دوٹوک بات کسی کے منہ سے نہ نکلی کہ محبوبوں کی سرتاج ہم رنگ خانہ کعبہ کی تھی۔

(ص:۳۶)

حضرت ابراہیمؑ

آج سے کوئی بیشتر ۴ ہزار ایک سو ۲۴ سال ہوئے کہ ہمارے دیس ہندوستان سے بہت پچھم کی طرف جو ملک عراق ہے اور اسی کا نام کسی زمانہ میں کالدیا یا کلدانیہ بھی رہ چکا ہے وہاں ایک شریف اونچے گھرانے میں ایک بزرگ پیدا ہوئے نام ان کی قوم کی بولی میں ابرام یا ابراہام اور ہمارے آپ کے بول چال میں ابراہیم۔ ملک تہذیب وتمدن کی ترقیوں میں گل وگلزار بنا ہوا فنونِ لطیفہ کے ذوق سے ایک ایک دل ودماغ رچا ہوا لیکن روحانیت کی آنکھیں بند صدائیں فسق وشرک کی ہر طرف سے بلند۔ سنگ تراشی کی صنعت کاری بت تراشی کی طرف لائی۔ اور بت تراشی نے راہ بت پرستی کی دکھلائی۔ سارا ملک ایک بتکدہ بنا ہوا عقیدت کے مندروں میں ہزار بت جما ہوا۔ ایسے میں ابراہیمؑ کو پیمبری کا منصب عطا ہوا۔ اور حکم توحید کی منادی کا ملا۔

ملک کے تخت پر جلوہ افروز نمرود نامی ایک شقی اور جابر وقاہر کے آواز کان میں پڑی کہ

ابراہیم نامی ایک نوجوان قومی دیوتاؤں کو جھٹلاتے ہیں. صدا توحید کی لگاتے ہیں. توہین باپ دادا کے دین کی اور ملک وقوم کے آئین کی. سن کر بادشاہ آگ ہو گیا. حکم ہوا کہ آگ کی بھٹی تیار کرو، اور ایسے باغی طاغی کو اس میں جھونک فی النار کرو۔

لاؤلشکر نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی. توحید وایمان کے زندہ جان پتلے کو دہکتے ہوئے انگاروں اور لپکتے ہوئے شعلوں کی نذر کر دیا! آگ پر حکم بادشاہ کا نہ چلا، آگ تابع وفرمانبردار اپنے خالق وپروردگار کی رہی خود جلی مگر جلا نہ سکی. باطن کے نورِ ایمان کی ٹھنڈک نے ذرا بھی آنچ ظاہر کی آگ کی آنے نہ دی اور جو صبر کرتا ہوا داخل ہوا تھا شکر کرتا ہوا صحیح وسالم باہر نکل آیا۔

(ص: ۶۰)

ابوالکلام کی شخصیت

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق وباطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

کوئی اور مؤمن اس آن، اس شان، اس سج دھج، اس خوبو کا ہو یا نہ ہو. ان آنکھوں نے ایک تصویر اقبال کے قلم حقیقت رقم کی کھینچی ہوئی اپنے زمانے میں دیکھ لی. اور تصویر بھی کیسی! سجی سجائی، نک سک سے درست، نوکِ پلک سے آراستہ. سنج کی محفلیں ہوں یا یارانِ بے تکلف کا مجمع، تو آپ دیکھتے مولانا کے منہ سے پھول کس طرح کے جھڑ رہے ہیں. لطیفوں پر لطیفے دینی، سیاسی، ادبی، علمی، شخصی ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے. لطیف وشگفتہ ایک سے بڑھ کر ایک شعر سنا رہے ہیں. کہیں بول چال کی نثر کو شعر بنائے ہوئے ہیں. اور طبیعت کی آمد ہے، کہ بس پکار رہی ہے

ہے زبان میری ابرِ گوہر بار

گھنٹوں نہیں، پہروں بیٹھئے اور دل نہ گھبرائے، نہ اکتائے، نہ پچھتائے. اور جو کہیں موقع اس کا آ گیا تو چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر، اب سماں ہی دوسرا. ایک شیر

ہے کہ گرج رہا ہے. خطابت کی آگ برسا رہا ہے. اور زبان ہے کہ اب پھر صدا لگائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار !

لیکن جوش وخروش کے عالم میں بھی، شروع جوانی کے دور کو چھوڑ کر قلم یا زبان سے باہر نہیں. قابو کے اندر نطق اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا. اشتعال کے سمندر سے جیسے لہریں اٹھ رہی ہیں اور حلم ومتانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی آ رہی ہیں!

ایک دفعہ کی بہار سنئے. لیکن چشم تصور کے سامنے زمانہ آج سے ۴۳ سال قبل ۲۰ء کو لے آیئے وقت تحریک خلافت وتحریک ترک موالات کی بھرپور جوانی کا، بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پُر جوش نعرے اور ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو'' کے ترانے. لیکن یوپی ہی کا ایک معلوم ومعروف دینی مرکز اینٹی خلافت مرکز بھی. اس کے ایک مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدود کفر میں داخل اور اس کے علم بردار دائرہ اسلام سے خارج ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنی ایک کانفرنس عین اس شہر میں کیجئے ۔۔۔۔ اچھا صاحب جلسہ ہوا اور گویا مخالفین کے طبل جنگ پر چوب پڑ گئی. مخالفین بیڑا اٹھا کر چلے کہ آج جلسہ کو جی بھر کر درہم برہم کیجئے اور بیڑے کو غرق ہی کر کے واپس آیئے. اور عبائے خلافت کے دامن کو اپنی مقراض تکفیر سے تار تار کر کے رکھ دیجئے !۔۔۔۔ ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ

آج تو ہے سانپ کے منہ میں انگلی اپنی!

انجام دیکھئے کیا ہو. مناظرہ، ٹکراؤ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے.

لیجئے جلسہ شروع ہو گیا، مخالفین کی طرف سے میدان خطابت کا ایک پہلوان، شہ زور اور پہلٹن اکھاڑے میں اتارا گیا کشتی پر کشتی مارے ہوئے، داؤ پیچ کی استادی میں نام پائے ہوئے. اور اس نے تقریر یہ مارا وہ مارا کے انداز میں شروع کر دی. جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری. اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری! اب یاد نہیں کہ صدر جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور. بہر حال جوابی تقریر کے لئے وہی کھڑے ہوئے. لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لئے لوہا نکلا. اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا. ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر، بلوائیوں کی

متوقع لیکن، لیکن یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہوگئی. اور کہیں نہ تکفیر نہ تفسیق! اور یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں. نہ تعریض، نہ تشنیع، نہ تضحیک، نہ تقبیح شروع سے آخر تک بس تفہیم وتذکیر تشریح، تبیین، نہ مناظرہ، نہ مفاخرہ، نہ مکابرہ، نہ مجادلہ! تقریر دلائل وحقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی. معقولیت اور سلاست روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی! ۔۔۔۔ حریف اب کرتا بھی تو کیا کرتا سارے ارمان پھٹپھٹا کر رہ گئے. غالب کے پرزے اڑنیکی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے علم وتدبر کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی. اور تماشا ہو ہی نہ پایا!

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر بل زصد لشکر ظفرا نگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا. اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی لئے کیا تھا. کم سن ہی تھے کہ تحریر وتقریر کا شہرہ بلند ہو گیا اور دور والے اس دھوکے میں پڑے رہے کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہوگا! اور شاگرد تو علوم وفنون میں کہنا چاہیئے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے. فیض بس مبدءِ فیض سے پائے ہوئے. رسمًا کچھ کسی سے پڑھ پڑھا لیا ہو تو اور بات ہے، ورنہ حقیقتًا شاگردی کے نام سے نا آشنا اور مصداق

شاگردِ رشید حق تعالیٰ

کے بنے ہوئے!

کسی دوسرے کی شخصیت سے مرعوب بلکہ متأثر ہونا تو شاید ابوالکلام نے عمر بھر جانا ہی نہیں. الٹے اپنی ہی شخصیت سے دوسروں کو متأثر کرتے رہے. نظریاتی اختلاف کیا دینی اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا، وہ ہونا بالکل قدرتی تھا لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخالفت میں ہونے دیا!

مولانا آزاد

ادب عالیہ یا کلاسیکل کی اصطلاح تو اردو میں بعد کو چلی ہے باقی یہ کلاسیکل اور عالی قدر ادب تو مولانا کا جیسے حصہ تھا۔ان کے قلم کا شروع سے ہی ایک امتیازی خاصہ تھا۔

تیور مردانہ، لہجہ شریفانہ، ترکیبوں میں جزالت، الفاظ میں جلالت، تشبیہوں میں جدت، استعاروں میں ندرت، خیال میں بلندی، بیان میں صفائی، مطالب فکر انگیز، اسلوب ولولہ خیز، نثر ہر جگہ ادیبانہ، کہیں خطیبانہ، خطابت کا مزاج شاہانہ، عبارت کی سطح کہیں حکیمانہ، کہیں حاکمانہ، حکمت کی جگہ حکمت، ظرافت کی جگہ ظرافت، حکایت غم وحزن ہو یا داستان سرور نشاط، لطافت وشادابی سطر سطر سے عیاں، اور آمد اور بے ساختہ پن لفظ لفظ سے نمایاں، مطالعہ میں گہرائی، مشاہدہ میں گیرائی، بات میں بات پیدا کرنے کا وہ سلیقہ اور معمولی جزئیات سے دور رس نتائج نکالنے کا وہ ملکہ کہ دھوکہ حضرت رومیؒ کی مثنوی کے دفتروں کا ہونے لگے۔

دین ومذہب مولانا کے قلم کا موضوع خصوصی سالہا سال تک رہا۔الہلال، البلاغ کے سارے صحافتی اور کتاب تذکرہ کے تصنیفی دور کا حرف اول بھی یہی ہے اور حرف آخر بھی یہی۔ ہائے بسم اللہ بھی اور تائے تمت بھی یہی۔ خشکی مذہبی تحریروں کا ایک لازمی جزو سمجھ لی گئی ہے۔مولانا کا قلم اس علت سے کوسوں دور کیا منزلوں دور رہا۔ یہاں تک کہ جن فقہی عنوانات پر مولانا نے قلم اٹھایا ہے۔ انھیں بھی گل وگلزار بنا کر چھوڑا ہے۔قادر الکلام کا لفظ ہمارے یہاں شاعروں ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔نثر نگاری میں کسی پر اس کا اطلاق اگر پوری طرح ہوسکتا ہے تو وہ ابوالکلام کی ذات ہے۔مضمون خوشی کا ہو یا غم کا۔داستان رزم کی ہو یا بزم کی، موضوع فنی ہو یا شعری، عنوان سیاسی ہو یا فلسفیانہ، یہ سدا بہار قلم ہر انداز بیاں، ہر اسلوب نگارش، ہر پرواز فکر پر یکساں قادر۔غبار خاطر کہنا چاہئے کہ ان کی سب سے آخری کتاب ہے۔

خدانخواستہ اگر ادبیات اردو کا سارا ذخیرہ جل کر خاکستر ہو جائے اور تنہا ابوالکلام کی

''تخلیقات'' (یہ لفظ میرا نہیں) باقی رہ جائے تو انشاءاللہ ادب اردو کی عظمت وجلالت کا اندازہ لگانے کے لئے وہ بس ہوں گی. خدانخواستہ ابوالکلامیات کے بھی دوسرے اجزا معدوم ہوجائیں تو ان کا بھی سارا عطر کھنچا کھنچایا ایک غبارِ خاطر کے اندر موجود ملے گا. اور خود یہ غبارِ خاطر عطیہ کس کا ہے؟ جیل کا! یوسفؑ تو پیمبر تھے. مگر ان کے بھی جوہر کو جلا جا کر کہاں ہوئی؟ قید زنداں کی چہاردیواری کے اندر! تو حیرت نہ کیجئے کہ اس سنتِ یوسفی کا حق اپنی بساط بھر بی بی زلیخا کی ہم نام کے شوہر نے ادا کیا. جو اپنی نوجوانی میں خود یوسف جمال مشہور تھا!

(ص:۷۰)

مولانا کہلانے سے قبل

نیم حکیم خطرۂ جان کے وزن پر نیم ملا خطرۂ ایمان کی کہاوت بھلا کس نے نہ سنی ہوگی. آج اسی طرح کے ایک بنے ہوئے اور نام کے مولانا کی داستان حیات کا ایک ٹکڑا چند منٹ میں خود اسی کی زبان سے سُن لیجئے.

اپنی آنکھ جس ماحول میں کُھلی وہ اچھا خاصہ مذہبی تھا. گھرانا کھاتا پیتا ساتھ ہی پورا دیندار، یہ قصہ اٹھارویں صدی آخر کا ہے یا پوری گنتی سننا چاہتے ہوں تو ۱۸۹۲ء کا، عادتیں اپنی بھی قدرتاً مذہبی قسم کی پڑ گئیں. نماز روزہ کی پابندی، قرآن مجید کی تلاوت، دینی کتابوں کا مطالعہ وغیرہ اور یہ سب بہ طور خشک معمول کے نہیں بلکہ عقائد میں پختگی اور جوش بھی ساتھ ساتھ، اپنے ساتھیوں کو دین کی تبلیغ بلکہ ان سے مباحثہ ومناظرہ بھی. اسکولی زندگی میں اسلامیت کا یہی عالم رہا. پڑھنے لکھنے کا شوق بھی گویا پیدائشی تھا. عنوانات مذہبی بھی پیش نظر رہے اور باتیں خود سے سوچتا تو خیر کیا اوروں کی لکھی ہوئی پڑھتا اور انھیں کو اپنے قلم سے دُہرا دیتا. اب کسی کو یقین آئے یا نہ آئے. واقعہ تو بہرحال یہ ہے کہ بُری بھلی مضمون نگاری بارہ سال کے سن سے شروع ہوگئی تھی. ہائی اسکول پاس کر کے داخلہ کالج میں ہوا. اب ۱۹۰۸ آ گیا. اب مستقل رہنا سہنا لکھنؤ میں شروع ہوا جہاں نہ کتابوں کی کمی تھی اور نہ انگریزی

قسم کے کتب خانوں کی، ادھر لپکا کتب بینی کا پڑا ہوا تھا. جو کتاب بھی سامنے آ گئی بس اسے کتاب کے کیڑے کی طرح چاٹ گیا. کوئی بتانے والا تھا نہیں کہ کتاب ہے کس نوعیت اور کس پائے کی. اتفاق کی بات کہ شروع ہی میں سابقہ جس کتاب سے پڑا، وہ ایک سخت ملحد قسم کے انگریز ڈاکٹر کی کتاب (Elements Of Socidd Saencp) تھی. الحاد کا راز تو بہت دنوں بعد کھلا ظالم نے پیرایہ بیان تمامتر عقلی یا بقول سائنٹیفک اختیار کیا تھا، بظاہر مذہب سے یقیناً یا اثباتاً اسے کوئی تعلق ہی نہ تھا، لیکن حقیقتاً اس کی ہر تعلیم کی زد آ کر مذہب ہی پر پڑتی تھی. خصوصاً دینی اخلاق پر. سولہ برس کے سن کی بساط ہی کیا تاثر کے شباب کا زمانہ جوں جوں مطالعہ آگے بڑھا طبیعت اثر قبول کرتی گئی. یہاں تک کہ چند سو صفحوں کی کتاب جب ختم کی ہے تو اندر ہی اندر چپکے چپکے قلب میں ایمان کی نورانیت کی جگہ الحاد کی ظلمانیت لے چکی تھی.

بنیا دیوں پڑی. تائیدی اسباب قدم قدم پر ملتے گئے ..... مل اسپنسر، ہکسلے وغیرہ کی کتابیں اس کڑوے کریلے کو اور نیم چڑھا بناتی گئیں. یہ نشہ دو ایک دن نہیں کوئی آٹھ دس سال متواتر جمارہا ہوتے ہوتے ۱۹۱۸ء آ گیا اور اپنی توجہ کی باگ پہلے بدھ مذہب اور پھر فلسفہ ہندو (خصوصاً تھیا سوفسٹ اسکول) کی طرف مڑ گئی. مسز بسنٹ، آر بندو گھوش، ڈاکٹر بھگوان داس، مہاراج تلک اور اینڈ منڈ ہومر، سال چھ مہینے کے مسلسل مطالعۂ روحانیت نے مادیت والحاد کا طلسم توڑ کر رکھ دیا اور صاف نظر آنے لگا کہ ایک زبردست علم روح اور روحانیت کا بھی ہے. عین اسی زمانہ میں شبلی کی سیرۃ النبی جلد اول شائع ہوئی جس نے پیغمبر اعظم کی پیغمبری نہ سہی تاہم مصلحانہ عظمت و برتری کا پوری طرح قائل کر دیا. اس دور میں اتنا بھی بہت غنیمت تھا اس کے معاً بعد خوش بختی سے رسائی مولانا رومؒ کی بے مثل مثنوی تک ہو گئی اس کے کانپوری ایڈیشن کے چھ یوں دفتروں کو اول سے آخر تک پڑھ ڈالا کو سمجھ میں بیشتر حصہ نہ آیا. پھر بھی اب کیا عرض کیا جائے کہ اس نے کیسی قلب ماہیت کر دی اور پڑھنے والے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور دل میں ابھی مثنوی کے مزے لے ہی رہا تھا کہ مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی تفسیر ترجمۃ القرآن ۱۹۲۰ء میں میری نظر کے سامنے آ گیا اور جو کچھ کسر از سر نو

مسلمان ہونے میں باقی رہ گئی تھی وہ پوری ہوگئی۔انگریزی ترجمہ کا اثر ہی انگریزی خوانوں پر کچھ اور ہوتا ہے۔

اس ساری شمع خراشی سے مقصود صرف یہ عرض کرنا تھا کہ جس طرح ضلالت کے اسباب بے شمار ہیں اور الحاد کیسے کیسے مخفی راستوں سے آتا رہتا ہے اسی طرح ہدایت کے راستے بھی بے شمار ہیں اور روشنی دکھانا ضابطہ کے علماء اور مشائخ کے ساتھ مخصوص نہیں۔اپنے اس دور گمراہی میں میں علماء کے سائے سے بھاگا نہیں ان سے ملتا رہا۔ان کی کتابیں بھی پڑھتا رہا،لیکن اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑا ۔۔۔۔کاش یہ ایک چھوٹی سی، ننھی سی آپ بیتی دوسروں کے لئے سبق کا کام دے!

(ماہنامہ پاکستان میں ص:۱۱۹)

دسواں باب

معاصرین

ہر انسان اپنے معاصرین کے اندر کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور ایسی پاتا ہے جن سے وہ خود مستفید ہو کر چاہتا یہ ہے کہ دنیا والوں کو بھی ان سے روشناس کرائے۔ اور پھر جب کہ وہ معاصرین دینی و دنیوی حیثیت سے کچھ لائق فائق بھی ہوں!

مولانا دریابادیؒ کے اندر بھی جو اپنی دینی، سیاسی، صحافتی اور ادبی مشغولیتوں کی وجہ سے معاصرین کا ایک جمِ غفیر رکھتے تھے اس خواہش کا پیدا ہو جانا یقینی سا تھا۔ چنانچہ خواہش ہوئی اور مولانا نے اس کی تکمیل کے لیے معاصرین کا عنوان منتخب کیا۔

کتاب کیا ہے؟ بیسویں صدی عیسوی کی باکمال شخصیتوں کا ایک سرسری تعارف اور مصنف کی معلومات کی حد تک ان کی سیرت کا ایک مختصر سا خاکہ۔ جس میں اس دور کی چلتی پھرتی شخصیتیں یکجا نظر آ جاتی ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کی معاصرت کا زمانہ ۸۲،۸۰ سال کا رہا ہے۔ جس کے مختلف دور ہیں۔ مصنف نے اسی مناسبت سے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

تینتالیس بڑے

انتیس برابر والے

آٹھ چھوٹے

عناوین میں کہیں کہیں یہ جدت اختیار کی گئی ہے کہ اصلی نام کو چھوڑ کر گھریلو یا شخصی زندگی کے کسی خاص پہلو کو سامنے رکھ کر اس کے مناسب ''اسم'' کو جگہ دی گئی ہے۔

والدین

والد ماجد کی وفات ۱۹۱۲ء ہوئی، جب میں ۲۰ کا ہو چکا تھا. اور والد ماجدہ کی ۱۹۴۱ء میں جب میں ۴۸ سال کا تھا.

والد ماجد مولوی حاجی عبدالقادر کی ولادت ۱۸۴۰ء میں ہوئی، جب والیِ اودھ امجد علی شاہ تھے. اس زمانے کو عوامی زبان میں ''نوابی'' کہا جاتا ہے. درسی تعلیم وقت کے مشہور دارالعلوم فرنگی محل (لکھنؤ) میں ہوئی. اُس وقت خاندان لکھنؤ میں رہتا تھا نہ کہ دریا باد میں. تعلقات فرنگی محلیوں سے یوں ہی ہم لوگوں سے بہت زاید تھے، بالکل مثل عزیزوں کے. حد یہ ہے کہ اس وقت پردے کی شدید پابندیوں کے باوجود ان لوگوں سے پردہ نہ تھا.

سلیم الفطرت اور شائق علم شروع سے تھے. کم سنی ہی میں چھوٹی سی ملازمت مُدرسی کی مل گئی. اپنے ذاتی شوق سے انگریزی کا بھی مطالعہ اتنا کرلیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح کام چلا لیتے تھے. نوابی دور واجد علی شاہ آخری تاج دار اودھ پر ختم ہو چکا تھا. اب ۱۸۵۷ء کے بعد باقاعدہ انگریزی راج قائم ہو گیا تھا. یہ کسی چھوٹے سرکاری اسکول میں اپنے ضلع بارہ بنکی میں فارسی کے مدرس ہو گئے تھے. پھر کسی طرح ضلع ہردوئی میں پہنچ گئے تھے. وہاں کسی انگریز افسر کو نجی طور پر فارسی پڑھائی اس نے خوش ہو کر انھیں ایسا سرٹیفکٹ دے دیا جس سے یہ بجائے تعلیمی صیغہ کے صیغۂ عدالت میں منتقل ہو آئے. اور پھر جلدی ترقی کر کے تحصیل داری کے عہدے پر پہنچ گئے. سندیلے کی تحصیل داری کئی سال تک بڑی نیک نامی، خوش انتظامی اور ہر دل عزیزی کے ساتھ کی اور حکومت اور رعایا دونوں کو مطمئن بلکہ خوش رکھا۔

۱۹۱۰ء میں ایک عزیز تعلقدار ضلع بارہ بنکی کے ہاں نائٹ ریاست ہو کر لکھنؤ آ گئے، اور قیصر باغ میں رہ کر شتم پشتم ڈیڑھ دو برس گزارے. پھر مستعفی ہو گئے. پانچ سال کا معاہدہ تھا. تین، ساڑھے تین برس کی رقم کئی ہزار مل گئی. والدہ و ہمشیرہ کو لے کر حج کو چلے گئے، اور اللہ نے قبولیت اس درجہ عطا کی کہ عرفات کی حاضری دے کر منیٰ ہی میں تھے کہ وقت موعود ہیضے کی شکل میں آ گیا، اور

دو دن کی بیماری کے بعد ۱۳ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، جنازہ مسجد حرام کے زیر سایہ رکھا گیا، اور جسد خاکر کو جگہ جنت المعلٰی میں عبدالرحمٰن بن ابوبکر کے پائیں میں ملی. مشہور شاعر اکبر الہ آبادی نے قطعہ تاریخ وفات میں کہا ؎

اس قدر مصروف ذکر و شغل تھے
''شغل'' ہی میں نکلی تاریخ وفات

غیب کا حال کسی کو کیا معلوم، بہ بظاہر موت اولیاء اللہ کی سی نصیب ہوئی، مغفوریت اور مقبولیت کے اتنے اسباب بہت کم اکھٹے ہوتے ہیں۔

والدہ ماجدہ بی بی نصیر النساء شادی سے قبل اپنے شوہر کی چچازاد بہن تھیں. ابتدائی قیام زیادہ لکھنؤ ہی میں گزرا. بڑی صابر و شاکر، غم خوار، تہجد گزار، عبادت گزار تھیں. اپنی پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں، شادی کے بعد عموماً پردیس میں شوہر کے ساتھ رہا کیں.

گھر میں تمدن شہری نہیں، قصباتی رنگ کا تھا شرم وحیا کا انتہائی لحاظ. پردہ آواز تک کا تھا اور نامحرموں سے انتہائی سرے کا. چند قدم کا بھی طے کرنا بغیر ڈولی میانے کے ناممکن. شریف سے شریف بیبیوں سے بھی میل جول، جب تک وہ پہلے سے برادری کی نہ ہوں ناممکن. سیتاپور میں ایک سیدانی بڑے اونچے اور بہت بڑے گھرانے کی سڑک بیچ مہینوں ملاقات کی تمنا میں رہیں، اور مدتوں ان کی طرف سے سلسلۂ نام و پیام رہا، لیکن مرحومہ کسی طرح اس کی روادار نہ ہوئیں، آخر ایک بار وہ زبردستی، اچانک آ اُتریں.

۸۰، ۸۳ سال کا سن ہوگا کہ اپنے بڑے لڑکے کے پاس فیض آباد میں تھیں کہ بیمار پڑیں اور ۴، ۵ دن کی علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں. یہ ننگِ خاندان آخری وقت سورہ یٰسین کی تلاوت کرتا رہا. دریا بادلا کر نماز جنازہ بھی خود ہی پڑھائی، اور رو رو کر مغفرت کی دعا کی.

باپ کو تو اپنی نافرمانیوں سے آخر تک ناراض رکھا. ماں کی تھوڑی بہت خدمت شاید بن سکی ہو. اللہ اُس کو اگر قبول سے نواز دے تو زہے کرم!

(ص ۱۳۰، ۱۳۱)

حکیم الامتؒ

بزرگ میں نے اپنی عمر میں بہت دیکھ ڈالے اور تذکرے بھی بہتوں کے اس تفصیل واستناد سے سُنے کہ گویا انھیں بھی دیکھ لیا. عابد وزاہد بھی، چلہ کش ومرتاض بھی، صاحبِ کشف وکرامات بھی، ان میں یقیناً بہت سے اچھے لوگ بھی ہوں گے. اللہ کے برگزیدہ، جنتی اور مغفور، لیکن مُصلح، مُربی، اصلاح کرنے والا اور تربیت سے لگانے والا، حضرت تھانوی کا مثیل ونظیر کوئی نظر سے نہیں گزرا، اور نہ سُننے میں آیا.

شیخ کی تلاش، جب سے میں ازسرِ نو مسلمان ہوا (تقریباً ۱۹۲۰ء سے) جب ہی سے تھی. جس کا نام سنتا، اس کی طرف لپکتا. حضرت تھانوی کا شروع شروع بالکل معتقد نہ تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاسی اختلافات کی بناپر دل کو آزردگی سی تھی. اور مُریدین نے تشدد کے وہ وہ قصے بیان کر رکھے تھے کہ نام سے وحشت ہونے لگی تھی. ۱۹۲۷ء تھا کہ ایک محترم دوست (سید مقبول حسین وصل گرامی) نے حضرت کے کچھ چھپے ہوئے وعظ پڑھنے کو دیے اور کہا کہ تجربۃً ہی ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیجیے. بے دلی کے ساتھ اس پر عمل شروع کیا، لیکن اب کیا بیان ہو کہ پہلی ہی نشست میں دل لگنے لگا، اور ایک ایک بات دل میں اُترنے لگی! مولانا کا رنگ صوفیوں، عارفوں، سے الگ نظر آیا. شوق بڑھا، وعظ پر وعظ لے کر، مانگ کر پڑھے، اور بے اختیار خط وکتابت شروع کر دی.

جولائی ۱۹۲۸ء میں تھانہ بھون حاضری کی اجازت مل گئی. آمد ورفت شروع ہوگئی۔۔۔۔ دیکھا تو دیدشنید سے بھی بڑھ کر رہی اور زیارت سماعت سے کہیں بہتر نکلی. کشش اس درجے کی کہ طبیعت ملنے سے ہرگز نہ اُکتائے. اور مل جانے پر رخصت کا جی ہرگز نہ چاہے.

اتفاق سے کچھ ہی روز بعد بھائی صاحب کا تبادلہ سہارنپور کا ہوگیا. اور اس سے قدرتاً سفر اور قیام دونوں میں بڑی سہولت ہوگئی. اور سفر بار بار ہونے لگا. بھائی صاحب کا قیام سہارنپور میں ۴، ۵ برس رہا. اور میرا سفر تھانہ بھون کوئی ۱۵، ۲۰ بار تو ضرور ہوا، کبھی مختصر دو ایک دن کا، اور کبھی طویل مہینے سوا

مہینے کا مختصر میں حضرت مولانا کا ذاتی مہمان ہوتا اور طویل میں ایک مکان مستقل لے لیتا۔ کبھی تنہا ہوتا اور کبھی رفیقۂ زندگی کو رفیق سفر بنالیتا۔ خیر میرے لطف سفر کا تو کہنا ہی کیا، گھر والی بھی ساتھ جا کر بڑی ہی محظوظ و مسرور ہوتیں۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ والدہ ماجدہ اور ہمشیر مرحومہ وغیرہ سارے گھر بار کو سہارنپور سے لے کر گیا، اور سب بہت خوش آئے۔

نظم و انتظام کے تو آپ بادشاہ ہی تھے۔ افراط و تفریط اکثر بزرگوں اور اولیائے امت میں ہوا کرتی ہے۔ کوئی کسی خصلت میں بہت زیادہ بڑھا ہوا اور کوئی کسی خصلت میں۔ توازن و اعتدال حضرت انبیاء کا خاصہ ہوتا ہے۔ اسی سیرت انبیائی کی جھلک آپ میں دیکھنے میں آئی۔ ہر کام اپنے وقت پر، ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر۔ کھانے پینے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، سب کے ضابطے، سب کے آداب، ہر گفتگو ایک مقصد لیے ہوئے، بے مقصد گفتگو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ زبان پر اتنا قابو، میں نے کسی بزرگ کا نہ پایا۔ اوراد و وظائف پر جو زور دوسرے آستانوں پر رہتا ہے اُس کا یہاں نام ہی نہ تھا۔ رسوم سے اجتناب، نمایشی تکلفات سے احتراز، بس اپنے کام سے کام، دوسروں کو زحمت سے بچانے کا کامل اہتمام، بندوں کی خدمت عبادت کے درجے میں۔ بس یہی خصوصیات مجلس اشرفی کی دیکھنے میں آئے۔

حضرت بہ طور میزبان بھی ایک مثالی قسم کے انسان تھے، یہ نہیں کہ اندھا دھند بس رسمی خاطر داری، ہی کرتے چلیں اور مہمان کی اصل راحت، سہولت، ذوق طبعی اور معمولات کا لحاظ کیے بغیر، بس اپنی طرف سے اصرار ہی کرتے چلے جائیں۔ ایک بار کیا ہوا کہ میں سہارنپور سے کوئی قریب ۹ بجے صبح چل کر ۱۱ بجے پہنچا حضرت کے ہاں کھانے کا وقت بھی تھا فرمایا ''کھانا کھاؤ گے؟'' میں نے عرض کی کہ ''کھا کے تو چلا تھا'' سکوت فرمایا، اور مجھ سے اصرار نہ کیا۔ میں نے ''کھانا'' تو اصطلاحی معنی میں کھایا نہ تھا، ناشتہ البتہ خوب ڈٹ کر کرلیا تھا جو کھانے ہی کا کام دے۔ گرمی کا موسم تھا غالباً جون کا مہینہ تھا، اُس وقت بھوک واقعی بالکل نہ تھی، کچھ دیر خواہش ذرا معلوم ہونے لگی کوئی ایک کے قریب وقت تھا کہ بھوک خاصی تیز ہوگئی۔ مہمان خانے میں تنہا لیٹا ہوا تھا، کہ عین اُس وقت مولانا کے خادم خاص

میاں سلیمان ایک بڑی پلیٹ میں دو بڑے قلمی آم اور کئی تخمی مع چاقو وخوان پوش کے پہنچے اور یہ پیام دیا کہ ''بعض دفعہ بھوک اُس وقت نہیں ہوتی لیکن کچھ وقت کے بعد پیدا ہوجاتی ہے، مجھ سے فرمایا ہے کہ سامان جا کر اُن کے پاس رکھ دینا۔ اور رکھ کر چلے آنا۔ جی چاہے گا تو بے تکلف کھالیں گے۔ کسی کے سامنے بے تکلفی نہیں ہوتی ہے''۔ حکیم الامت کی یہ تشخیص اپنے ہر جزئیہ کے لحاظ سے حکیمانہ تھی، بھوک واقعی اتنی دیر میں لگ آئی تھی۔ اور کسی اور کی موجودگی بھی ایک حد تک مُخل ہورہی تھی۔۔۔۔ یہ ایک ہلکا سا نمونہ پیش کردیا گیا۔ دن رات نہ معلوم کتنی ایسی ہی چیزیں پیش آتی رہتی تھیں۔ ہر چیز حضرت کی حکمت اور دقیقہ سنجی کی مُظہر ہوتی۔

علوم ظاہری میں جو پایہ تھا خصوصاً تفسیر میں، اس کی نظیر بھی ہر دور میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔ تفسیر اس قابل ہے کہ اس کی بھی شرحیں اور حاشیے لکھے جاتے۔ اور کم سے کم اس کے وقتِ اشاعت تک تو بے نظیر ہی سمجھا جاتا، تفسیر تو خیر تفسیر ہے، ترجمہ قرآن تک زبان وسلاست کے پہلو سے بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

جہاں تک علوم باطنی کا تعلق ہے۔ یعنی اسلامی سلوک (معرفت وروحانیت تصوف سے الگ) اصلاح نفس کا تعلق ہے، انشاء اللہ اس دعوے کی لاج رکھ لے گا، کہ تاریخ امت میں کوئی ہستی، مرشد، مربی ومصلح، ان سے برتر نظر نہیں آتی۔ غزالی کا مرتبہ بے شک بہت بلند ہے، بلکہ کہنے دیجیے کہ امام تھانوی کے زمانے سے قبل انھیں کا مرتبہ بلند ترین ہے، لیکن تربیت السالک وغیرہ میں جیسی جیسی گتھیاں سلجھ کر آ گئی ہیں، ان کے بعد امام تھانوی کا پلہ کچھ بھاری ہی نظر آئے گا۔ ''حکیم الامت''، جس کسی نے ان کا لقب اول بار رکھا وہ بجائے خود بھی ایک حکیم اور عارف اور ترجمانِ حقیقت تھا!

(ص:۱۵ تا ۲۱)

احمد شریف شیخ سنوی

نوجوانی میں شیخ سنوی کا نام اخباروں میں اکثر نظر سے گزرتا رہتا تھا۔ اتنا معلوم تھا کہ یہ کوئی بڑے شیخ طریقت ہیں، اُن کے ہزارہا مرید ہیں، خود شیخ طرابلس میں رہتے ہیں، جس کی

سرحدیں حکومت اٹلی سے ملحق ہیں، اور شیخ فرنگیوں سے جہاد وقتال میں مصروف رہا کرتے ہیں. خیال بھی نہ گزرتا کہ شیخ کی زیارت بھی کبھی ہو سکے گی.

۱۹۲۹ء میں حج بیت اللہ کے لیے جانا ہوا. حیرت اور بڑی ہی مسرت کے ساتھ اس خبر کو سنا کہ شیخ کا قیام ان دنوں یہیں ہے. دل کے شوق وعقیدت نے فوراً ان کے لیے صدائے لبیک بلند کرنا شروع کر دی. ملاقات کی گھڑی آ گئی. فرش پر تکیے سے متصل ایک پیکر نور جلوہ گر تھا، رنگ سُرخ وسفید، گول چہرہ، نورانی داڑھی، عمر کوئی ۶۹، ۷۰ کی نظر آئی. میں نے بزرگ اور بھی دیکھے ہیں، کسی اور سے قلب اتنا حاثر ومرعوب نہیں ہوا (استثناء اگر کیا جا سکتا ہے، تو حضرت تھانوی کی پہلی زیارت کا) اللہ اللہ! ایک سچے مجاہد کی شبیہ نظر آ رہی تھی، ایک صحابی رسول کا نمونہ. زبان کیا کھلتی، جسم میں ایک کپکپی سی تھی. کتنی دیر حاضری رہی یہ تو اب کہاں یاد، بہر حال خاصی دیر تک رہی اور جتنی دیر بھی رہی، میں عقیدت میں غرق صرف چہرۂ انور ہی دیکھتا رہا۔

دل کو تسلی ہوگئی کہ ایک نمونہ جلوہ صحابیت کا دیکھ لیا! اللہ ان کا مرتبہ تو بڑا سا بڑا بلند ہی کرے، اور ان کے سائے میں ان کی زیارت کرنے والوں کو سمیٹ لے۔

(ص:۲۳)

اکبر الٰہ آبادی

اکبر کا کلام اس کم سنی میں سنا کہ اب وہ زمانہ بھی یاد نہ رہا. کوئی ۸، ۹ سال کا سن ہوگا. ان کے دل لگی کے شعر ایک ایک کی زبان پر تھے، خیال یہی تھا کہ شاعر صاحب بڑے ہنسنے ہنسانے والے ہوں گے، اور ہر وقت ہنستے رہتے ہوں گے. ۲۰ کے سن میں ۱۹۱۲ء میں جب ملاقات ہوئی یہ خیال بے بنیاد پایا. ہنساتے تو بے شک تھے، لیکن خود بہت کم ہنستے، اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنستے تو شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔

مارچ یا اپریل ۱۹۱۲ء تھا، جب میں بی۔اے کا امتحان دینے الٰہ آباد گیا. بی۔اے کا امتحان دینے الٰہ باد جانا ہوتا تھا. گیا اور وقت نکال کر حضرت اکبر الٰہ آبادی کی خدمت میں ایک سے زائد بار

حاضری دی،سراپا کرم وشفقت نکلے .بڑے ہی خُلق ولطف سے ملے.میں سن میں اُن کے صاحبزادے سے بھی ۸،۱۰ سال چھوٹا تھا،لیکن وہ پیش آئے، کہ جیسے میں کوئی ان کے برابر کا ہوں.اپنا کلام سنایا،میرے مذہبی خیالات سے بھی کچھ واقف ہو چکے تھے .کچھ بند بند اشارے ادھر بھی کیے .الٰہ آباد سے لوٹ کر لکھنؤ آیا تو اب راستہ کھل گیا تھا،مراسلت شروع کی،اور اچھی خاصی مستعدی سے اور پابندی سے جاری رکھی.جواب جلد جلد آتے اور مفصل بھی ہوتے۔

یہ خوب یاد رہے کہ ۱۹۱۲ء میں اور اس کے کئی سال بعد تک زمانہ میرے الحاد و بے دینی کا رہا ایک مرتبہ بولے کہ" کیوں صاحب آپ کو اللہ میاں سے متعلق جو کچھ شک وشبہات رہے ہوں، یہ فرمایئے کہ" کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے" سوال سنتے ہی میں چکرا گیا اور دب دبا کر بولا کہ" جی نہیں اس میں تو کبھی شبہ ہوا ہی نہیں،اور شاید یہ ہوسکتا بھی نہیں ہے". بولے کہ بس اتنا ہی کافی ہے.اپنی عبدیت کا اقرار کیے جایئے.رہی اللہ کی ذات وصفات تو وہ آج تک کس کی سمجھ میں آئی ہیں؟ جنھیں بڑے سے بڑے عالم و عارف کہا جاتا ہے،وہ بے چارے انھیں بحثوں میں حیران وششدر نظر آتے ہیں،جبھی تو میں نے کہا تھا ع

"بندگی حالت سے ظاہر ہے،خدا ہو یا نہ ہو"

میں قائل تو مغا کیا ہوتا،البتہ سوچ میں اسی وقت سے پڑ گیا اور دماغ کو ایک نیا موضوع سوچنے کا مل گیا۔

ایک بار جب میں از سرِ نو مسلمان ہو چکا تھا اور اکبر صاحب کا مہمان بن کر انھیں کے دولت خانے میں ان کے ساتھ نماز ظہر میں پہلی بار شریک ہوا تو بہت خوش ہوئے ،دعائیں دیں اور بولے کہ" آپ کے والد مرحوم کو فرشتوں سے آپ کی نماز کی خبر سن کر کس درجہ مسرت ہوئی ہوگی"!

ایک بار کچھ عرصے بعد اس زمانے میں جب میرے اوپر مثنوی رومی کا اثر غیر معمولی تھا اور گویا قرآن مجید سے بھی بڑھ کر مثنوی کو سمجھ رہا تھا،اور بار بار اپنی گفتگو میں حوالہ حضرت رومیؒ کا دیتا تھا اُکتا کر حضرت اکبر بولے کہ" اچھا صاحب یہ بتایئے کہ اللہ میاں بڑے ہیں،یا مولانا رومی؟ ظاہر ہے کہ لاجواب ہو جانے کے سوا میں اس کا جواب ہی کیا دے سکتا تھا.اس پر بولے کہ" آپ کی زبان سے بجائے اللہ کے ذکر کے نام مولوی رومی کا سنتا رہتا ہوں،میں سمجھا کہ شاید وہ اللہ میاں سے بھی

بڑے ہوں. آپ یہی سمجھ رہے ہیں کہ مولانا نے آپ کو ہدایت دی اور اللہ تک وہ آپ کو لے آئے. سوچ کا طریقہ بدلیے، یہ سمجھیے کہ اللہ نے مولانا کو ذریعہ آپ کی ہدایت کا بنایا.

مغربی تہذیب وتمدن کے لائے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے، مگر یہ اُن کے یا کسی کے بس میں کہاں تھا، اور مشرقی تہذیب اور اسلامی ثقافت کی تبلیغ بڑے دل چسپ، مؤثر و دل نشیں انداز سے کرتے رہتے. علماء عصر میں حضرت تھانوی کے دل سے قائل تھے اور ایک حد تک دوسرے دیوبندی حضرات کے. مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے علمی کمالات کے قائل تھے، مگر اس کے آگے نہ بڑھتے. فرما گئے ہیں ؎

ہے دل عارف مثال دیوبند
اور ندوہ ہے زبان ہوش مند

خود گاندھی جی کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے. انتہا یہ کہ اقبال کے بھی سو فیصدی مداح نہ تھے، جابجا لطیف چوٹ کر جاتے، مثلاً ؎

کالج میں ہو چکا ہے جب امتحان ہمارا — سیکھا زبان نے کہنا ہندوستاں ہمارا
رقبے کو کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے — ہندوستان کیسا سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم — جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

وقت اخیر آیا، تو خواجہ حسن نظامی پاس بیٹھے ہوئے تھے، اُن کا بیان ہے کہ نبض پر میرا ہاتھ تھا، میں کلمہ **لا موجود الا اللہ** کہتا، تو ڈوبتی ہوئی نبض ایک بار پھر تیز ہو جاتی تھی. ستمبر ۱۹۲۱ء میں یہ پیر ظریف دنیا کو یاد آخرت اور توحید اور ترکِ معاصی کا سبق دیتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا.

اکبر اگرچہ آپ کا بُرا نہ لے گیا
لیکن خدا کے دین کی گواہی تو دے گیا

بہ طور مکرر یہ عرض ہے کہ سخن فہمی اس نااہل کو آئی ہی کب، لیکن برائے نام جو کچھ بھی آئی یہ طفیل صرف دو رگوں کا ہے. ایک مولانا شبلی کا اور دوسرا اکبر کے شعر کا. ظاہری معنی و مطالب، ساخت

وترکیب، نشست الفاظ کی لفظی وادبی خوبیاں کا جہاں تک تعلق ہے۔ یہ مولانا شبلی کا فیض ہے۔ اکبر شعر کو کبھی ترنم کے ساتھ نہ پڑھتے۔ ہمیشہ سادہ، تحت اللفظ طریقے سے پڑھتے۔ مگر اس طرح ٹھہر ٹھہر کر، کہ پورا مفہوم واضح ہو جاتا۔ اور شعر کی معنویت آئینہ ہو کر رہتی۔

(ص:۲۵)

مولانا شوکت علی

شوکت علی کی بڑائی کے لیے یہی کافی ہوتا، کہ وہ محمد علی کے بڑے بھائی تھے، لیکن ان میں بڑائی کے کچھ اور اوصاف خود بھی تھے اور اس نے لوگوں کو ان کے گرد اکٹھا کر لینے میں بڑی مدد دی۔ لوگوں میں اپنی وقتی شہرت و ہر دل عزیزی اُن پر قابو حاصل کر لینے میں ملکہ حاصل تھا۔ موتی لال نہرو اور مالوی جی تک کو اُن سے گرویدگی تھی۔ علی گڑھ کرکٹ ٹیم کی کپتانی شروع شروع انھیں کیا مل گئی تھی کہ وہ ملت بلکہ قوم وملت دونوں کی ہر ٹیم کی کپتانی کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔

لحیم وشحیم، گراں ڈیل، دیو پیکر، زباں بھی قد وقامت ہی کی مناسبت سے لمبی، اور تیز۔ چندہ وصول کرنے کے فن میں استاد کامل، چندہ مانگنے کی مستقل عادت، سرسید اور محسن الملک کو اللہ معاف کرے کہ انھیں سے شوکت علی نے لی۔ اور یہ لت کچھ ایسی تکلیف دِہ کہ لوگ اُکتا جاتے اور بڑے بڑے بے تکلف اور مخلص دوست بھی سامنا کرنے اور چندہ باز سے کترانے لگتے۔ اور چندہ مانگنے والا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی نظر میں حقیر اور بھک منگا اور یوسف بے کارواں ہو کر رہ جاتا!

شوکت صاحب محمد علی کو بہت ہی جی جان سے زیادہ چاہتے تھے۔ سن میں سات آٹھ برس کا فرق ہونے کے باوجود بڑی بے تکلفی تھی۔ خود محمد علی کا تخلص جوہر تھا، اور بڑے بھائی ذوالفقار کا تخلص گوہر۔ یہ منجھلے بھائی شاعر نام کے بھی نہ تھے۔ ان کا تخلص محمد علی نے رکھ دیا تھا شوہر۔ بے تکلفی ہم جولیوں کی سی تھی۔ اس کے باوجود سن کی بڑائی سے فائدہ اٹھانے میں حضرت چوکتے ہی نہ تھے۔ بعض دفعہ ڈانٹ بھی بری طرح دیتے تھے۔ باپ محمد علی کے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ تعلیم تربیت پھر ولایت

بھجوانے کا انتظام سب انھیں بڑے بھائی ہی نے کیا تھا۔اخبار والوں نے دونوں بھائیوں کو ملکی وملی تحریکوں میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اور وابستہ دیکھ کر ''علی برادران'' لکھنا شروع کر دیا تھا۔پہلی نظر میں یہ دھوکا ہوتا کہ کوئی تاجر ہیں،اور فرد کا نام مشترک رکھتے ہیں محمد علی ہی نے بڑے بھائی کو انگریزی پریس میں Big Brother کے لقب سے مانوس ومعروف کر دیا تھا۔

''آم'' کی دعوت کہہ کر شروع برسات میں گشت کیا کرتے تھے،ایک مرتبہ ۱۹۲۵ء میں میں نے بھی دریا باد بلایا اور اصلاً مدعو تو محمد علی کو کیا تھا،انھیں طفیلی سمجھ رہا تھا لیکن عین وقت پر اتفاق سے محمد علی بیمار ہو گئے اور تنہا یہی آئے۔جو کچھ جوڑ بٹور کر چندہ جمع کیا تھا انھیں کے کام آ گیا۔بہت خوش واپس گئے۔کھانے کی فرمائش زبان سے غضب کی کرتے تھے۔بیزبان بے چارہ ڈر جاتا کہ پورا دیوالہ نکلوا کر رہیں گے،لیکن واقعتاً بہت کم کھاتے،کھانے کا ہنگامہ ہی زیادہ مچاتے۔ذیابطیس کا مرض تھا۔پرہیز اچھا خاصا رکھتے۔نماز میں ناغہ نہ ہونے دیتے۔الٹی سیدھی جیسی بھی بن پڑتی،وقت ہی پر پڑھ لیتے ۔۔۔۔اپنی ذات میں بالکل منفرد تھے۔

(ص:۴۵)

حسرت موہانی

پورا نام سید فضل الحسن،بی ایک (علیگ) تھا۔تخلص نے ایسا دبایا کہ لوگ اصل نام کو بھول ہی گئے۔علی گڑھ میں اس زمانے میں پڑھا جب عام مسلمانوں میں خیالات علی گڑھ کی طرف سے خراب ہی تھے۔چہرے کے جمیل اور بشرے کے شکیل کسی معیار سے بھی نہ تھے۔اور چہرے پر داڑھی طالب علمی کے زمانے میں بھی تھی۔اور سر پر پٹے رکھے ہوئے اس وقت بھی تھے۔تواضع وانکسار اور جذبۂ خدمت میں مست ومستغرق۔ایک چھوٹا سا پاندان ساتھ،لڑکوں میں نام ''خالہ جان'' غلبۂ شفقت ومادریت کی بنا پر پڑ گیا۔

بی۔اے کر کے علی گڑھ ہی میں رہنا شروع کیا۔شغل کے لیے تجارت شروع کر دی۔طبیعت میں قناعت وبے طمعی حد درجہ کی تھی اور اسی درجہ کی غیرت مندی اور خودداری۔اس لیے جو کچھ بھی ملتا

اس پر قانع وصابر ہی نہیں شاکر بھی رہتے۔

ذاتی زندگی میں بڑے بے نفس، لیکن سیاسی خیالات میں ویسے ہی کڑے اور متشدد تھے۔ انگریزی حکومت کی مخالفت میں شاید ہر چیز جائز ہی سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ریل پر بے ٹکٹ سفر کرنا خفیہ پولیس کا آدمی جو ہر وقت نگرانی پر تعینات رہتا تھا، اسے ہر طرح غچا دینا جائز سمجھتے۔ سیاسیات میں مقلد گاندھی جی کے آخر تک نہ ہوئے۔ پہلے مہاراشٹر کے تلک مہاراج کے پیرو رہے۔ پھر خود ہی مجتہد بن گئے۔ جیل گئے، بار بار گئے اور اس وقت جیل جانا شروع کر دیا تھا جب گاندھی جی نے اسے آسان اور داخل رشک فیشن نہیں کیا تھا ذاتی زندگی میں سادگی وقناعت کے پیکر مجسم تھے، اور قابل رشک۔ عقائد میں ''اہل بدعت'' کے ہم نوا تھے۔ یعنی درگاہی وخانقاہی رنگ سے رنگین۔ عُرسوں کے شیدا۔ اخیر عمر میں حج بیت اللہ بھی ہر سال کرنے لگے تھے۔ لوگ پھبتی کستے کہ اللہ میاں کا عُرس منانے جارہے ہیں۔ فرنگی محل میں قادری رزاقی سلسلے میں مرید تھے اور اسی مناسبت سے درگاہ بانسہ (بارہ بنکی) کے بھی بڑے معتقد تھے۔ غزل گو اور شاعر اعلا درجے کے تھے، اور اسی درجے کے نثار وسخن فہم بھی۔ اپنے لیے شاعری میں راہ مومنؔ وسلیمؔ دہلوی کی اختیار کر رکھی تھی۔ اور خود شاگرد امیر اللہ تسلیمؔ کے تھے۔ زبان کے فاضل بلکہ محقق۔ کئی کئی چھوٹے دیوانوں کے مصنف۔ اس کے علاوہ معائب سخن ومتروکات وغیرہ پر بھی کئی رسالے لکھے ہیں۔

(ص:۵۵)

بوڑھا کنوارا

نام عبدالحق، لقب بابائے اردو۔ وطن ہاپڑ ضلع میرٹھ۔ عمر کا بیشتر حصہ دکن میں گزرا۔ ۸۰ اور ۹۰ کے درمیان عمر پائی۔ کتابیں دوسروں سے لکھوائیں زیادہ۔ دیباچے اور مقدمے اس کثرت سے لکھے کہ لوگوں نے ''مقدمہ باز'' کی پھبتی جمادی! سہ ماہی رسالہ اردو اس شان ومرتبت کا نکالا، کہ اس سے پہلے اس کے بعد بھی ویسا نہ نکل سکا۔۔۔۔ بچارے نے بہت چاہا کہ سیاسیات سے بالکل الگ تھگ ہو کر خدمتِ اردو کے لیے اپنے کو وقف رکھیں، اسی پر جئیں اور اسی پر دنیا سے اُٹھیں، پوری طرح

کامیاب نہ ہو پائے. پاسپورٹ ہندو پاکستان دونوں کے بنوالیے. بہت چاہا کہ ایک قدم دہلی اور علی گڑھ میں رکھیں، دوسرا کراچی ولاہور میں. لیکن دونوں ملکوں میں کام کسی طرح ممکن نہ ہوا، مجبوراً اپنے کو کراچی میں محصور کرلیا. طوفانی دوروں سے ڈھاکہ اور چاٹگام تک کو ہلا ڈالا. سرگرم جوش عمل سے مُردوں کو جلا دیا. کتنوں کو گمنامی کے قعر سے گھسیٹ کر بام شہرت پر لے آئے. کتنوں کے نام چمکا دیے. فلک کج رفتار کو اس کی بے ہمتائی نہ بھائی اور اپنوں ہی نے مخالفت کی ٹھان لی. وہ ایک ہمت کا دھنی کسی سے ہار نہ مانا، تن تنہا سب سے مقابلہ کرتا رہا، ایک ایک سے ٹکر لیتا رہا. عمر کی ۸۰ سے زائد منزلیں طے کر کے عالم آخرت کو سدھارا. دنیا اس کی تحقیق کی داد دیتی رہے گی. اور نسلیں اس کے عزم وفرض شناسی کی بلائیں لیتی رہیں گی.

عمر بھر شادی نہ کی، تجرد میں گزاری. سالہا سال ایک محبوبہ دل نواز کی چاہت میں گزار دیے زندگی اُس پر تج دی، دن رات اس کے فراق میں گرفتار. نہ یہاں قیام نہ وہاں قرار ع

دن کہیں، رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

کا مصداق. بہ قول کسی عامی سیلانی کے ؎

سالہا سال ہوئے ترے پیچھے پھرتے

جنوری تو ہے تو اے ماہ دسمبر ہم ہیں!

اس بے پناہ عشق واشتیاق والفت کی دُھن میں ایجاب وقبول کی فکر کسے اور قاضی اور شاہدین کا ہوش کہاں! محبوبہ کا نام ہے زبان اردو، اور اس پر دل دینے والے کا نام عبدالحق بوڑھا کنوارا، بس نام ہی کا ''کنوارا'' نکلا۔۔۔۔ عبدالحق نے جتنی گہری اور جتنی وسیع خدمت اردو کی کی، اگر اس کا جائزہ لینے پر آیئے تو خود ایک عمر کی چھان بین اور برسوں کی مشقت کی ضرورت ہے. دیکھیے کب اور کون اتنی ہمت کر پائے!

(ص:۸۸)

خواجہ حسن نظامی

ابھی اسکول کے کسی درجہ کا طالب علم ہی تھا کہ یہ نام بہ حیثیت مضمون نگار کے کان میں پڑنے لگا، کالج میں تھا کہ مولانا شبلی کی زبان سے ان کی ''بھاشا آمیز اردو'' کی تعریف سنی. دل پہلے ہی سے ان کی طرف کھنچا ہوا تھا کہ اب تو اتنی بڑی سند بھی ہاتھ آ گئی. اور ایک مضمون کی تمہید میں مولانا ابوالکلام کے قلم سے بھی ان کی مدح دیکھی. مولانا شبلی کی داد بجائے خود کیا کم تھی، کہ اب وہ شہادت اور موثق ہوگئی. ان کا ہر مضمون ہر اخبار شوق واشتیاق سے پڑھنے لگا.

۱۹۱۳ء میں ایک بار دہلی جانا ہوا، اتفاق سے آگے تانگہ خواجہ صاحب کا جارہا تھا، نظر پڑتے ہی پہچان لیا، تصویر بار بار دیکھ چکا تھا، اور زُلفوں والا چہرہ بھولنے والا نہ تھا. اب یہ یاد نہیں پڑتا کہ ملاقات کب اور کہاں ہوئی. غالباً دہلی ہی میں ہوئی. میں پرانی دہلی کے کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا. وہیں ہوئی. سنہ بھی کوئی ۱۴ یا ۱۵ ہوگا اور تھوڑے ہی دن میں تعلقات یگانگت کی حد تک پہنچ گئے. مرے مرزے کے خط آتے، ان کی بزرگی اور درویشی کا میں کچھ زیادہ قائل نہ ہوسکا، لیکن ان کے صاحب قلم ہونے کا احساس برابر بڑھتا رہا. ادیب تو اُردو میں بہت دیکھنے میں آئے. لیکن خواجہ صاحب، صاحب طرز تھے اور سلیس اردو، صحیح، عام فہم زبان لکھنے میں انھیں ملکہ تھا.

پیرزادگی اور صوفیت کا کاروبار ان کے ہاں بڑے پیمانے پر جاری رہا. بہ قول بعض خوش عقیدہ مریدوں کے ع

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں!

البتہ ان کی انشاء پردازی کا سکہ دل پر اور زیادہ ہی بیٹھتا رہا. اور ادب اردو کے اُن ظالم تاریخ نگاروں پر غصہ اور افسوس ہی کرتا رہا، جنھوں نے خواجہ صاحب کے ذکر سے اپنی تاریخوں میں پرہیز کیا ہے.

بہ حیثیت مجموعی وہ بڑے بامروت، خوش اخلاق، مہمان نواز، اور بڑے دلچسپ وباغ

وبہار آدمی تھے۔عقل دنیا بھی خوب رکھتے تھے۔حضرت اکبر الہ آبادی سے نیاز مندی میں میرے کامیاب حریف تھے،وہ شعر ملاحظہ ہو ۔

حسن نظامی اکبر کا کلام سن کے بولے
تجھے ہم ولی سمجھتے جو تو خرقہ پوش ہوتا

ایک حسن نظامی یہ تھے،میرے دوست اور مخلص،محسن وعنایت فرما،متواضع ومنکسر،فیاض ومہمان نواز،اُردو کے مایہ ناز انشاء پرداز،لیکن ایک دوسرے حسن نظامی بھی تھے۔دینی شخصیتوں کی توہین کرنے میں،اہل سنت کی دل آزاری کی پروانہ کرتے۔اور مجاہد امت اور پیشوائے ملت محمد علی مرحوم کو نیچا دکھانے میں ناگفتہ حدود تک پہنچ جاتے۔ان دوسرے حسن نظامی کا معاملہ بس اللہ ہی کے حوالے کرتا ہوں اس دعا کے ساتھ کہ ان کی خوبیوں اور ان کی شان جمالی کے طفیل میں ان کی لغزشوں اور بشری کمزوریوں کو دامن عفو میں ڈھانپ لیا جائے اور ان کی نیکیوں کو ان کا شافع بنالیا جائے۔

(ص:۹۵)

راشد الخیری

ٹریجڈی یا غم نگاری کے بادشاہ تھے،میں نے جب دہلی جا کر دیکھا تو سن سفید ہو چکے تھے۔ پھر بھی ہاتھ پیر کے ڈیل ڈول کے۔پہلے کچھ افسانے لکھ لکھا،رسالوں میں چھپوائے،پھر ناول تابڑتوڑ شروع کر دیے۔جوہر قدامت،صبح زندگی،شام زندگی،شب زندگی،نوحۂ زندگی وغیرہ۔پبلک نے قدردانی کی،یہ جام پر جام چڑھاتے چلے گئے ۔

ساقی جو دیے جائے یہ کہہ کر کہ پیے جا
تو میں بھی پیے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیے جا

تعلیم نسواں کے ابتدائی گنہگاروں میں تھے۔بڑے ٹھسّے سے ماہ نامہ عصمت نکالا۔چلے تھے شرافت کا درس دینے،اسلامیت کو از سر زندہ کرنے،دیکھتے ہی دیکھتے بات قابو سے باہر ہوگئی۔حجاب و

عصمت نہیں تبرج، بے حجابی، فسق، عریانی ہی مقصود بن گئی۔اور جو کل تک آگے بڑھنے والا تھا، راہ دکھانے والا تھا، اس کا شمار رجعت پسندوں میں قدامت پرستوں میں ہونے لگا۔اور یہی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔

دین کی خدمت کوئی تفسیر وحدیث کی راہ سے کرتا ہے، کوئی کلام ومناظرے کے راستے سے۔راشد الخیری کی فسانہ نگاری بجائے خود ایک عبادت تھی اور ان کا ''جھوٹ'' تمامتر ''سچ'' ہی تھا۔عجب کیا جوان کی مغفرت کے لیے ان کے ناولوں کے چند ہی ورق کافی ہو گئے ہوں۔ہر ناول کا ماحصل یہی نکلتا تھا کہ آخرت کی یاد تازہ کر دیں۔اور پڑھنے والے کو خوف سے رُلا چھوڑیں۔۔۔۔ ۱۹۱۸ء تھا اور میرے اوپر الحاد و بے دینی کا عفریت سوار تھا اور بڑے سے بڑے طبعی صدمے کو بھی دل کی کمزوری ہی سمجھتا تھا۔ایک روز کیا ہوا کہ ''شب زندگی'' پڑھنے کو لے بیٹھا۔شروع کرنا تھا کہ معلوم ہوا سوتا پھوٹ پڑا، صبر کا زعم، ضبط کا غرہ ٹوٹ گیا۔بڑی خیر ہوگئی کہ کمرے کے اندر کوئی اور نہ تھا۔بڑی شرم اس کی تھی کہ اس غم آزردگی کی حالت میں کوئی دیکھ نہ لے۔غم ناکی اور اثر انگیزی اس بلا کی کہ سطر سطر پر طبیعت آخرت کے لیے گرمائے۔۔۔۔بڑے سے بڑے واعظ اور اہل دل کی صحبت میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ طبیعت کا سوز و گداز بڑھ جاتا ہے۔

خوش اطوار، خوش مزاج، رقیق القلب، رحمدل، ہمدرد، متواضع، سادگی پسند، اور تمکنت سے خالی انسان نہ تھے۔قلم سے جو لکھتے تھے، وہی دل میں بھی رکھتے تھے۔جو راستہ دوسروں کو دکھاتے، اس پر خود بھی گامزن تھے۔تحریر دل کے تقاضے سے تحریر کرتے، آرٹ کی نمائش مقصود نہ ہوتی۔صاحبِ قال نہ تھے، صاحب حال تھے۔رومی روشن ضمیر (کاروانِ عشق و مستی کے امیر) نے اخلاق وتہذیب کے بہترین سبق حکایت وافسانے کے ذریعہ سے تو دیے ہیں یہاں تک کہ فحش بیانی سے بھی کام لیا ہے۔پھر آخر راشد غریب نے کیا قصور کیا، جو کہانیوں اور آپ بیتیوں سے کام حکمت وموعظت کی بزم میں لیا۔اور ''حدیثِ دیگراں'' میں ''سرد لبراں'' کو سمو دیا؟ کمال در کمال یہ کہ ان کی بیان کی ہوئی داستانیں اتنی صاف ستھری، شریفانہ، دلچسپ اور دل آویز ہوتی کہ کیا بوڑھے کیا جوان، کیا لڑکے، کیا

لڑکیاں، کیا مرد، کیا عورتیں، سب ہی ان کو سنتے اور سب ہی کو یہ سناتے. قابل فخر و نازش ہے اردو زبان کہ اسے راشد الخیری سا عبرت آموز و دردمند اہل قلم نصیب ہوا!

(ص:۱۰۴)

راجہ صاحب

ابھی بچپن ہی تھا اور سیتا پور اسکول کے کسی نیچے درجے میں تھا کہ ولی عہد صاحب محمود آباد سیتا پور آئے. اور اسی کوٹھی میں ٹھہرے، جس میں والد ماجد کرائے پر رہتے تھے. اس کوٹھی کے دو کمرے راجہ صاحب کے لیے مخصوص رہتے تھے کہ اتفاق سے اگر کبھی آجائیں تو وہیں فروکش ہوں.

یہی ولی عہد راجہ ہو کر ایک دن سیتا پور رات گئے پہنچے. ریل کے سوا اس وقت موٹر وغیرہ کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا. پہنچے اور ذرا پریشانی کے ساتھ، خدا معلوم ساتھ کے ناشتے وغیرہ پر کیا افتاد پڑی کہ پیچھے چھوٹ گیا تھا اور راجہ بھوکے تھے. سیتا پور کوئی بڑا شہر نہیں تھا کہ بڑے بڑے ہوٹل ہوتے، دو ایک ٹٹ پونجیے سے تھے بھی، وہ بھی بند ہو چکے تھے. ساتھ میں دو ایک مصاحب اور دو ایک خدمت گار تھے، کھانا رات کا ہمارے ہاں بھی ہو چکا تھا اور میں خود سو ہی چکا تھا. نماز عشاء کے بعد لیٹنے کی تیاریاں گھر بھر کی تھیں. راجہ صاحب کے نام کا غلغلہ سن کر سب چونک اٹھے اور گھر میں یہ داستان غریب سن کر ایک کھلبلی مچ گئی۔۔۔۔ گھر میں مرغیاں پلی ہوئی موجود تھیں، انڈے جلدی جلدی تل دیے گئے. گھر میں بھینس بھی پلی ہوئی تھی، دودھ، دہی، گھی سب گھر میں موجود تھا. فیرینی بھی اسی دودھ کی تیار ہو گئی. غرض غریبانہ سامان چٹ پٹ کھانے پینے کا ہو گیا. راجہ صاحب اس دعوت شیراز سے بہت خوش ہوئے اور برسوں تک اسے یاد رکھا. اس وقت تو میں سو گیا تھا صبح اٹھ کر یہ قصہ سنا.

دعوت عام کے موقع پر جو سفید بارہ دری (قیصر باغ) میں ہوتی تھی، اس میں کھانے ایک ایک کے سامنے اتنی تعداد میں لگے ہوتے تھے کہ کھانے والے کا ہاتھ ہر کھانے تک پہنچ بھی نہیں سکتا تھا. کھانے کی روزمرہ صورت راجہ صاحب کے ہاں یہ ہوتی کہ اس ڈرائنگ روم میں کھاتے جس سے یہ کام ڈرائنگ روم کا بھی لیتے. جو آتا لمبی سی میز پر بیٹھ جاتا اور کھانا بھی اسی میز پر اس کے سامنے لگ جاتا.

ہر وقت کھانے کے آٹھ دس قسم کے کھانوں سے کیا کم ہوتے مثلاً قورمہ، قلیہ، دو قسم کے کباب، پلاؤ، بالائی، قلاقند، مربّے وغیرہ متنوع وتعداد کے علاوہ کثرت وافراط بھی ہر کھانے کی۔ بالائی آتی تو طباقوں میں، آم آتے تو ٹوکروں میں، غرض ریل پیل ہر چیز کی ہوتی!۔۔۔فیاض، مہمان نواز، شریف پرور، خرد نواز، متواضع، منکسر ہونے میں اپنی مثال آپ تھے۔

(ص:۱۱۰)

عبدالحلیم شرر

شرر صاحب کے نام سے کان بچپن سے آشنا ہو گئے تھے اور اردو کی شُد بُد ابھی ہوئی ہی تھی کہ شرر کے ناول نظر سے گزرنے لگے۔ انیسویں صدی عیسوی کے شروع کا زمانہ شرر کے اوجِ شہرت کا زمانہ تھا، ان کے ناول اور ان کے مضمون ۱۵، ۱۶ سال قبل سے نکل رہے تھے۔ ان کے ماہنامے ''دلگداز'' کی اشاعت غالباً ۱۸۸۷ء سے تھی۔ پہلی بار دور سے زیارت لکھنؤ میں سٹی اسٹیشن پر غالباً ۱۹۰۶ء میں ہوئی قریب سے زیارت کئی سال بعد ۱۹۱۱ء میں ایک طبی کانفرس کے سلسلے میں ہوئی اور تعارف کا موقع بھی اسی ذیل میں حاصل ہو گیا۔۔۔تعارف ایک پختہ کار ادیب وانشاء پرداز ایک نوعمر طالب علم اور نومشق مضمون نگار کے درمیان جو بی اے کے آخری سال میں تھا!

شرر مرحوم اس وقت بھی بڑے لطف وکرم سے پیش آئے، جیسے میں کوئی ان کے برابر کا تھا! ۱۹۱۲ء میں وہ مولانا محمد علی کے نئے روزنامہ ہمدرد کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے دہلی گئے اور جانے سے قبل خوب مفصل ملاقاتیں رہیں، لیکن جلد ہی واپس آ گئے۔۔۔جو باورچی دیگ اچھی پکاتا ہے، کیا ضرور ہے کہ ہانڈی بھی خوب پکائے؟ اچھے ناول نویس اور انشاء پرداز کے لیے یہ کیا ضرور ہے کہ ایک روزنامے کا ایڈیٹر بھی کامیاب ثابت ہو؟

لوگ شرر اور سرشار کے درمیان موازانہ اور محاکمہ خواہ مخواہ کیا کرتے ہیں۔ جیسے دونوں ایک راہ کے مسافر ہوں! حالانکہ دونوں کے رنگ ہی بالکل الگ الگ تھے۔ لکھنؤ کی بول چال سیکھنا اور لکھنؤ کی زندگی اندر سے دیکھنا ہو، خصوصاً رند مشربوں اور بے فکروں اور بگڑے ہوئے نوابوں اور نواب

زادوں کو جاننا پہچاننا ہو، تو بے شک سرشار کو پڑھیے۔ سرشار اس فن کے امام ہیں۔ شرر صاحب کی راہ بالکل دوسری ہے۔ تاریخ امم، خصوصاً امت کو اگر جاننا ہو اور مسیحیت کی تاریخ سے اگر واقفیت کامل حاصل کرنا ہو، تو شرر صاحب کی تاریخوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(ص:۱۱۷)

مولانا ثناءاللہ امرتسری

موصوف کا نام میں نے اس وقت جانا جب ایک مرتد کی کتاب ترکِ اسلام سے دل بے حد جلا ہوا تھا، اور مولانا اس کا جواب قریبی مدت میں ترکِ اسلام لکھ ڈالے تھے۔ جواب ترکی بہ ترکی، مرتد کی ترکی اسی وقت ختم ہوگئی اور آخر نئے سرے سے اسلام کے دامن میں پناہ لینا پڑی، میں اسکول کے چھٹے درجے کا طالب علم تھا اور عمر ۱۱ سال سے زائد نہ تھی، ایک ہندو لڑکے سے لے کر ترکِ اسلام کی جھلک دیکھ لی تھی، اور اس سے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔۔۔۔ کچھ ہی دن بعد ترکِ اسلام کی زیارت نصیب ہوگئی اور اس نے زخم پر ٹھنڈا مرہم رکھ دیا۔

حریف کی ذہنیت کی نبض شناسی میں مولانا بڑھے ہوئے تھے۔ ایسی بات ڈھونڈ نکالتے کہ آریہ سماجی ذہنیت دنگ ہو کر رہ جاتی۔ اب یاد نہیں کہ کتنے مناظرے کر ڈالے اور ہر جگہ کامیاب ہی رہتے۔ ایک جگہ ایک معروف نامور آریہ سماجی مناظرے نے شروع ہی میں خم ٹھونک کر کہہ دیا کہ ''آپ مسلمان ہی کب ہیں جو اسلام کی طرف سے وکیل بن کر آئے ہیں۔ دیکھیے مسلمان علماء کے فتوے، یہ سب آپ کی تکفیر کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ جب وہ کہہ چکا، تو کڑک کر بولے ''اچھا صاحب! میں اب مسلمان ہوتا ہوں، اور آپ سب مسلمان گواہ رہیں کہ میں سب کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھتا ہوں۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ فرمایئے اب تو کوئی عذر باقی نہ رہا' مسلمان باغ باغ ہوگئے۔ آریہ مناظر سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور مولانا نے اپنا کام چلتا کر دیا۔

(ص:۱۳۴)

اعلیٰ حضرت

جب سے انگلیوں نے قلم پکڑنا سیکھا، کہنا چاہیے کہ جبھی سے شبلی وحالی کی عظمت دل میں جاگزیں ہوگئی اوران پر رشک سا کرنے لگا کہ کیسے خوش نصیب ہیں یہ لوگ! حیدرآباد سے ماہانہ وظیفہ پاکر تصنیف وتالیف کے کام میں لگے رہتے ہیں؟۔۔۔۔اور بے جا بجا یہ خبریں سننے میں آتی رہیں کہ فلاں کتاب کی طبع و اشاعت کا انتظام نظام حیدرآباد نے کرادیا۔۔۔۔حیدرآباد کوئی چھوٹی سی ریاست نہ تھی ایک پورااور مستقل ملک تھا، ڈاکخانہ اور تار گھر اپنا، ریل اپنی نوٹ اور سکے اپنے، اور فرماں روا بھی دیکھتے دیکھتے ہز ہائی نس سے ترقی کر کے ہز اگزالٹڈ ہائی نس ہوگئے۔اردو ترجمہ ''اعلیٰ حضرت'' بھی بدستور رہا۔اور ہم لوگوں کی زبان پر یہی چڑھا ہوا۔

۱۹۱۷ء میں یونیورسٹی کا پیشہ سر رشتہ تالیف وترجمہ قائم ہوا اور فلسفۂ تاریخ، معاشیات۔ ریاضیات وغیرہ کے مترجمین ومؤلفین مقرر ہوگئے۔ بابائے اردو عبدالحق (افسر مترجمین) اور سر راس مسعود، ڈائرکٹر کی طرف سے تار پہنچا کہ تمہارا تقرر مترجم فلسفہ کی حیثیت سے ہوگیا ہے، آجاؤ'' تنخواہ تین سو ماہوار سے شروع ہوگی، ۱۹۱۷ء کے تین سو آج کے ہزار بلکہ ساڑھے تین ہزار کے برابر تھے۔

خیر۔اخیر اگست میں روانہ ہوا اور یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے کام شروع کردیا۔حیدرآباد دلچسپیوں اور رنگینیوں کے لیے مشہور رہا ہے، مگر اپنا دل زیادہ نہ لگا۔نئی بیاہی ہوئی دلہن کو بھی بلالیا تھا۔اس سب کے باوجود جی نہ لگا۔اخیر جولائی ۱۹۱۸ء میں رخصت پر چلا آیا اور یہاں سے استعفاء لکھ کر بھیج دیا۔۸، ۹ مہینے بے کاری کے گزرے ہوں گے کہ شروع مئی ۱۹۱۹ء میں سر امین جنگ بہادر (سیکریٹری پائیگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ ''اعلیٰ حضرت نے تم کو یاد کیا ہے فوراً آجاؤ'' خیر گیا، مگر ڈرتے ڈرتے کہ کہیں کسی بدخواہ دشمن کی یہ حرکت نہ ہو۔حیدرآباد اسٹیشن پر حکم ملا کہ اب کی آزاد وخود مختار نہیں ہو کہ جس کے یہاں چاہو ٹھہرو۔صدرالصدور امور مذہبی نواب یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے ہاں سرکاری طور پر قیام کرو۔بارگاہ خسروی میں حاضری آج ہی پانچ ساڑھے پانچ بجے شام کو ہوگی۔خیر وقت مقررہ پر

پہنچا مگر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہ دیکھیے خدا معلوم کیا پیش آئے. کنگ کوٹھی کے بیرونی پھاٹک پر سواری رُکی. فرلانگ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے برآمدے تک پہنچا. پہنچ کر یہ اطمنان ہوا کہ مصاحبین موجود نہیں، بلکہ اعلیٰ حضرت بالکل تنہا ہیں. کھڑے ہوئے تھے کہ حسب دستور نذر کے پانچ روپے پیش کیے. نذر قبول ہوئی. خود ایک بالکل ہی معمولی سی کرسی پر بیٹھے. اور مجھ سے بھی ایک ایسی ہی کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا. یہ چیز بڑی ہی عزت کی تھی. ورنہ بڑے بڑے ''جنگ'' اور بڑے بڑے ''ملک'' اور ''دولہ'' کھڑے ہی رہتے تھے. گفتگو کوئی ۳۰، ۳۵ منٹ تک جاری رہی. سرسید کی نیچریت سے لے کر خدا معلوم کتنے متفرق موضوع چھیڑے اور میں ہر لحہ ڈرتا ہی رہا، کہ دیکھیے میرا کون سا جواب مردود ٹھہرتا ہے. اس کے بعد ہی فرمان صادر ہو گیا، کہ میرے لیے گھر بیٹھے ۱۲۵ اسکہ انگریزی کی علمی پنشن تاحیات مقرر کی جاتی ہے''.

سالہا سال اس رقم پر گزر کرتا رہا. ۱۹۴۶ء میں جب روپے کی قیمت ایک چونّی کے برابر رہ گئی تھی، یہ رقم سر مرزا اسماعیل کی حسن توجہ سے بڑھ کر دو سو ہو گئی.

رسولؐ کے نام سے تو جیسے انھیں عشق تھا. اور اسی لیے ہر عرب کی خدمت کرنا اپنا فرض جانتے تھے. جو اُن تک رسائی پا سکے. اور ان تک رسائی میں ہرگز ایسی دشواری نہ تھی، جیسی عموماً شاہی شخصیتوں کے ہاں ہوتی ہے. کتنے ہی مفلسوں، حاجتمندوں کی امیدیں اور آرزوئیں اُنھیں کی ایک ذات سے وابستہ ہوتی تھیں. عجب کیا کہ لکھوکھا مخلوق کی دعائیں میر عثمان علی خان کی ذات سے متعلق حشر کے دن عدل خداوندی کو تبدیل کر کے رکھ دیں!

(ص:۱۳۴)

افضل العلماء کرنولی

افضل العلماء کوئی عام تعظیمی لقب نہیں، مدراس یونیورسٹی کی ایک ڈگری کا نام ہے. عربی کے فاضلوں کو امتحان پاس کرنے پر ملا کرتی ہے. عبدالحق کرنولی کے نام کے ساتھ اس کا اضافہ ضروری ہے، بابائے اردو کے نام سے اشتباہ سے بچنے کے لیے. نام عرصے سے سن رہا تھا. اور نام جب سنا تو

ساتھ ہی علم وفضل کے کمال اور دینی ومغربی علوم کی جامعیت کی تعریف بھی سن لی. اسلامیت کے پیکر تھے. غیرت ملی کی داد ہر زبان سے سنی.

کچھ دن کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ خط افضل العلماء کا چلا آ رہا ہے کہ عنقریب دہلی اپنے کام سے آ رہا ہوں لکھنؤ بھی آنا ہے اور اجازت دیجیے کہ میں دریاباد آ کر آپ سے ملاقات کروں اور ان لکچروں کے سلسلے میں بات چیت. جواب عرض کیا گیا کہ ''ضرور کرم فرمایئے مگر اب رمضان مبارک شروع ہو رہے ہیں. شرط یہ ہے کہ آپ روزہ دار بن کر میرے مہمان نہ ہوں، سوکھی اور روکھی مہمانی سے معذور ہوں''. خیر آئے اور لکھنؤ سے دریاباد تک اپنے لکھنوی میزبان کے موٹر پر آئے. دیکھا، تو دیکھنے پر اس سے بھی بڑھ کر نکلے جو سُنے ہوئے تھے. شنیدہ کے بود مانند دیدہ! بڑے مہذب اور بڑے خوش لہجہ. اور سب سے بڑھ کر خوش فکر، خوش اقبال، وخوش گوار شخصیت. عقائد کے لحاظ سے پختہ دیندار اور غیرت ملی سے لبریز. عقل وہوشمندی کو جذبات پر غالب رکھے ہوئے. علی گڑھ کی طرف سے بڑے فکرمند، علمی اصلاح کے لیے بے چین اور وقت کے منتظر. عہدے کے لحاظ سے ریاست مدراس کے پبلک سروس کمیشن کے سینیر ممبر، عنقریب ہو جانے والے صدر. دینی وسیاسی خیالات دونوں میں بڑے متوازن. زبان کے محتاط اور خبردار. خوبیوں کا ایک مجموعہ، خوش خصالیوں کا ایک گلدستہ.

آ کر بالآخر انھوں نے پیام کو اس صورت میں پیش کیا کہ میری مجال انکار کی نہ رہی. سب سے بڑی بات یہ کہ مقالے کی زبان انگریزی کے بجائے اردو کر دی. اور مدت قیام مدراس بجائے دو ہفتے کے، کل ایک ہی ہفتہ رکھی. معاوضہ بھی پورا ایک ہزار کر دیا گویا وقت اور محنت دونوں میں نمایاں کمی کر دی!۔۔۔۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ ادائی فوراً نافذ ہوگی. اور سب سے بڑھ کر نئی بات یہ کہ یونیورسٹی کے فلاں اردو امتحان میں ماڈریٹری بھی انھیں تاریخوں میں، اور اس کی فیس الگ! آمد ورفت کے مصارف اسی مد سے!

لکچروں کا موضوع یہ قرار پایا کہ ''سیرت نبوی قرآن مجید سے'' خاص میری پسند کے موضوع کا عنوان. اور لکچر تیار کرنے کی مہلت کوئی آٹھ مہینے کی! یعنی کہیں جنوری ۱۹۵۸ء میں لکچر

دینے ہوں گے اور گفتگو ہوئی تھی اپریل ۱۹۵۷ء میں! میں اب کیا دیوانہ تھا کہ اتنی نرم شرطوں پر بھی اپنا انکار قائم رکھتا؟ میری رضامندی سے بڑے ہی خوش و مطمئن واپس گئے۔ ادھر میں بھی خوش کہ اسی بہانے اتنی نادر خدمت سیرت نبوی کے سلسلہ میں انجام دینے کا موقع مل رہا ہے! اتنے متواضع، متوازن اور سلجھے ہوئے دل و دماغ والے کے ساتھ موقع کم ہی ملتا ہے!

جنوری ۱۹۵۸ء میں جب پہنچا اور کئی دن قیام رہا، تو یہ تاثر کئی گنا بڑھ گیا۔ اپنے ہاں رکھا اور جگہ بالا خانہ کی تنہائی پر دی۔ جہاں آنے والا آسانی سے اور بغیر مالک مکان کی اجازت و رہنمائی کے پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھ سے مردم بیزار مہمان کے لیے یہ انتظام بڑے ہی آرام و سہولت کا رہا۔ صبح ناشتے کے لیے مجھے دیر تک آزاد تنہا چھوڑے رکھتے۔ ناشتہ مقدار میں وافر اور تنوع میں رنگارنگ، میرے پاس بھجوا دیتے۔ اور جب میں فراغت کر لیتا، تو بھی فوراً نہیں، کچھ دیر بعد اجازت لے کر کمرے کے اندر قدم رکھتے۔ ہر کس و ناکس سے نہیں، بہت ہی مخصوص لوگوں سے ملایا۔ صرف چند ہی جگہیں مجھے دکھانے گھمانے لے گئے مثلاً مزار یا مسجد مُلّا بحرالعلوم لکھنوی۔ یا تھیوسافیکل سوسائٹی کا مرکز ''ادیار'' لکچر پڑھ کر سنانے کی زحمت مجھے نہ دی۔ میری طرف سے خود ہی سناتے رہے، خوب رواں ''فرفر'' گویا لکچر خود انھیں کے لکھے ہوئے تھے! اجنبیت کسی پہلو سے بھی نہ معلوم ہونے پائی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ لکھنؤ کی زبان کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہیں۔ فسانۂ آزاد پورا پڑھے ہوئے ہیں۔

آخری لکچر کے بعد مجھے رضامند کر کے اپنے وطن کرنول ایک دن کے لیے لائے۔ مدراس سے وادی تک ریل پر اور صبح سویرے وادی پر ناشتہ کرایا، ناشتہ کرا کے موٹر سے کرنول میں ایک دن بھر کے لیے لائے۔ یہاں کا پروگرام بھی بہت خوب رہا۔ میزبان کے مولد میں ان کے والد ماجد کی تربت پر فاتحہ پڑھا۔ رات کو طلبہ کے ہوسٹل میں ایک دعوت تھی۔ اس میں بھی مجھے شریک کیا۔ کھانا بہت ہی لذیذ تھا۔ پھر رات کی گاڑی سے مجھے روانہ حیدرآباد کے لیے ہونا تھا۔ مرحوم اسٹیشن تک آئے اور مجھے سوار کر کے رخصت ہوئے۔ مدراس اور کرنول دونوں جگہ اُن کی مقبولیت و مرجعیت دیکھ کر یہ ڈر پیدا ہوا کہ کہیں ان کا نفس خود بھی اس درجہ مدح و داد سے متأثر نہ ہو، چنانچہ دعا تصریح کے ساتھ حفاظت نظر کی کی، اور بڑی ہی

شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ ان سے رخصت ہوا، کچھ ہی دن بعد وہ پبلک سروس کمیشن کے چیرمین ہو گئے۔ خدا معلوم کیا کیا کام کرتے۔ اور پھر علی گڑھ جا کر کیسی کچھ اس کی خدمت کرتے، کہ مشیت کو کچھ اور ہی منظور ہوا، اور مختصر سی بیماری کے بعد انھیں دنیا سے اٹھا لیا گیا، امت وملت کی بدنصیبی کے سوا اس کو اور کیا کہا جائے! بہادر جنگ مرحوم ہی کی طرح ان کی حسرت ناک موت پر کلیجہ مسوس ہو کر رہ گیا!

(ص:۱۵۰)

غازی مسعود

جون ۱۹۰۸ء تھا کہ ہم ایک دوسرے سے ملے۔ میں دسویں درجے کا اسکولی طالب علم تھا اور وہ ندوے کے کسی درجے میں پڑھ رہے تھے۔

اس وقت خوش رو، سبزہ آغاز نوجوان تھے، اور مدتوں خوش روئی کا یہی عالم قائم رہا۔ ذہین، طباع، حاضر جواب، شوخ مزاج تھے۔ آگے چل کر شہرت علم وفضل میں نہیں عملی کمالات اور علم مجلس میں حاصل کی۔ کھاتے پیتے گھر کے تھے۔ ایک حد تک شوقین مزاج، کھاتے اور کھلاتے۔ آج اس کی دعوت، کل اُس انتظام میں پیش پیش ہیں۔ ندوہ میں پارٹیاں آئے دن ہوا کرتیں، ہر بارات کے نوشہ یہی۔ انتظام کا سہرا انھیں کے سر۔

ٹینس بھی اچھا کھیلنے لگے۔ چڑیوں اور جانوروں کے شکار کرنے اور کرانے میں بھی دخل۔ باغبانی اور کاشتکاری دونوں میں نیم ماہر۔ انھیں عملی کمالات کی شہرت انھیں دربار شبلی تک لیے آئی اور بہت جلد ان کا شمار بطور مقرب سلطان کے ہونے لگا۔ اسٹرائک یہ جب چاہیں کرا دیں اور پھر اسٹرائک کے روکنے اور اس کا زور توڑنے کے گُر بھی انھیں ازبر، دارالمصنفین کا جو نقشہ اخیر زندگی میں مولانا شبلی نے بنایا اس کے علمی شعبے کے سربراہ جس طرح مولانا سید سلیمان ندوی رہے اسی طرح اس کے عملی وانتظامی شعبے کے مدارالمہام یہی مسعود ندوی۔ ہم بے تکلف نیاز مندوں کی زبان میں سالار مسعود غازی!

بڑے چاق وچوبند، بڑے مستعد وکارگزار، ہر فن وشعبے میں دخیل، صنعت کاری میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں۔ کم سے کم دو مسجدیں، ایک دارالمصنفین کی دوسری ندوہ کی صناعی وصنعت کاری کے لحاظ سے اپنی

نظیر آپ !۔۔۔۔شاہجہاں کے عہد میں یہ کہیں ہوتے تو عجب نہیں کہ میر تعمیر کے مرتبے تک ترقی کر کے پہنچ جاتے !تحریک ترک موالات میں جب گاندھی کے چیلے بن کر وہ اٹھے ،تو اعظم گڑھ کے ضلع میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں چرخے چلوادیے .اور چندے کی تعداد جوڑ بٹور کر جو بھیجی ،اس کا شمار ہی نہیں.

دارالمصنفین کی دنیا میں سکہ انھیں کا چلتا تھا حکومت انھیں کی تھی ،گو ضابطے سے سب سے بڑے سید سلیمان تھے .ایک زمانے تک حضرت تھانوی کے بڑے مخالف رہے ،پھر جب سن اترا اور زمانے کی گردشوں نے ہر طرح چور اور مجبور کر دیا اور اقبال مندی نے یکسر ساتھ چھوڑ دیا تو دل میں انابت کی لو لگی اور تھانہ بھون کے آستانہ پر لائی .حضرت سے بیعت ہی نہیں ہوئے بلکہ درجۂ دوم کی خلافت بھی حاصل کر لی۔

(ص:۱۵۶)

مولانا عبدالباری ندوی

شناساؤں اور کرم فرماؤں میں کسی کی بھی دوستی کی عمر ان سے زیادہ طویل نظر نہیں آتی .مجھ سے سن میں دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے .دیر سے دیر ۱۹۰۸ء ملاقات ہے .اب ۱۹۷۲ء ہے ،گو کم سے کم ۶۴ سال دوستی کو ہوئے .ایک چھوٹا سا عجوبہ یہ بجائے خود ہے.

میں نے جب شادی کا ارادہ کیا اور شادی کر بھی ڈالی ،تو ان بالکل نجی معاملات گفتہ و ناگفتہ بہ میں بھی میرے راز دار اور شریک کار رہے .اور انھیں جو واردات قلب اس سلسلے میں پیش آئے تو ان میں وہ اپنے اعتماد سے مجھے نوازتے رہے .لکھنؤ میں میرا قیام مستقل تھا .ان کا اکثر باہر رہنا ہونے لگا .کبھی اعظم گڑھ کبھی پونا ،کبھی بمبئی وغیرہ .جب کبھی باہر سے آتے میرے ہی ہاں ٹھہرتے .اور میں کبھی کبھی اپنی بدنفسی سے میزبانی کے فرائض بھی ٹال جاتا .برسوں بعد جب حج کو روانہ ہوا تو یہ بھی مع اپنے والدین اور چھوٹے سے قافلہ کے میرے ساتھ ہی چلے اور ساتھ رہے .اسی طرح اپنی پہلی شادی کی تو میرے صلاح ومشورے سے ،اور میرے دور کے ایک سسرالی عزیز کے ہاں

میری اکثر باتوں پر مجھے بڑے اچھے انداز میں ٹوک دیتے اور میں ان کا احسان مند ہوں کہ بعض ناگفتی معاملات میں انھوں نے مجھے زیادتیوں سے روکے رکھا .اور والد مرحوم کے زمانے میں ان کی نافرمانیوں کی راہ میں بہت دور تک جانے سے باز رکھا .اور میں نے اگر ان کی رائے پر عمل نہ کیا ہوتا ،تو

بڑی خرابیوں میں پڑ گیا ہوتا۔

(ص:۱۶۵)

علی میاں

مرحوم نہیں، ماشاءاللہ زندہ سلامت ہیں اور خدا کرے خدمت دین وملت کے لیے مدتوں اس خاکدان کو زندہ وسرسبز رکھیں۔سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں، لیکن علم وفضل میں، سنجیدگیٔ فکر میں، اخلاص میں، اخلاق وتقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت وطاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل۔رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور بھی لوگوں سے میں واقف ہوں۔باپ اور بھائی کا کیا کہنا، دونوں نور علی نور، پاک صاف، طاہر ومطہر مٹی، اس سے بنے ہوئے۔دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابل قدر وقابل فخر۔۔۔۔یہ اُس تاروں کے جھرمٹ کے درمیان آفتاب!

ندوہ اور دیوبند ماشاءاللہ دونوں کے اکابر سے علم دین حاصل کیا، اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے (اور انھیں میں مائیں اور دادیاں بھی شامل ہیں) اخلاق وروحانیت کا سبق لیا۔ذکاوت و فطانت کے پتلے پہلے سے تھے، چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر رہے۔انگریزی کی بھی بقدر ضرورت تحصیل کر لی۔اور عربی ادب وانشاء میں تو ہندوستان اور عالم اسلام میں نام پیدا کر لیا ہے۔خود اردو شعروادب کا اعلیٰ مذاق رکھے ہوئے۔شامی ومصری صحافت پر بھی سیر حاصل نظر کر لی۔تقریر وحکایت میں ملکہ روانی تحریر سے زاید۔میری طرح کاہل اور جامد نہیں، ندوے کے سے بڑے دارالعلوم کا انتظام بھی کرتے ہیں، اور سارے ہندوستان کا دورہ الگ۔ابھی یہاں ابھی وہاں، اور مقالات وتصنیفات ہیں کہ ساتھ ہی ساتھ کھٹا کھٹ نکلتی چلی آ رہی ہیں۔اردو اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی بلکہ کسی حد تک ترکی میں بھی۔۔۔۔زندگی قابل داد بھی قابل رشک بھی!

ایک بار نہیں، شاید دو ایک بار، اور اشارتاً اور کنایتاً نہیں۔منھ پھوڑ کر پوچھا کہ حضت شاندار مصطلحات تصوف کا مفہوم کچھ تو ہم نیازمندوں پر کھولیے، اور ''تنازل ستہ'' کے چہرے سے

نقاب زرا تو سرکایئے، ''توجہ باطن'' سے قلب کو گرمایئے. کچھ جواب نہ ملا تجاہل سا کر کے ٹال گئے ۔۔۔۔ایسا تجاہل جو دانستہ تغافل سے کم نہیں.

دنیا انھیں مولانا ابوالحسن علی ندوی کہہ کر پکارتی ہے، ہم لوگوں کی زبانوں پر خالی علی میاں ہے، عزیزوں سے بڑھ کر عزیز۔

(ص:۲۷)

عبدالرحمٰن ندوی بلگرامی

معصوم، مذہبی اصطلاح میں نہیں، بلکہ اردو کے عام محاورے میں، اپنی زندگی میں صرف تین ہی دیکھنے میں آئے یعنی ایسے سلیم الفطرت اور اس درجہ نیک و صالح کہ گویا دانستہ معصیت ان کے پاس بھٹکنے بھی نہیں پائی. ان تین میں ایک تو خود میری ہمشیر مرحومہ تھیں دوسرے ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم تھے، اور تیسرے یہی عبدالرحمٰن ندوی مرحوم تھے.

علم و فضل، صلاح و تقوی، تواضع و مسکنت، ایثار ہر لحاظ سے مستحق بھی اسی کے تھے. ہر وقت خندہ رو رہتے، ہر ایک کی خدمت کر کے خوش ہوتے، اپنے ندوی ہونے پر فخر کرتے، اور اس سے زیادہ خود ندوہ اُن پر فخر کرتا. اتنا بے لوث، اتنا بے شر، دنیوی آلودگیوں سے اتنا بلند و برتر نمونہ انسانیت کمتر ہی دیکھنے میں آیا ہے۔۔۔۔ بے ہمہ و باہمہ کی عملی تفسیر!

شروع ۱۹۲۶ء میں نگرامی کچھ معمولی سے بیمار ہوئے اور اپنے ایک عزیز کے پاس جو طبیب بھی تھے، بہرائچ چلے گئے. بیماری کو کئی ہفتے گزر گئے. اس پر بھی کسی خط سے کوئی خاص اہمیت نہ سمجھی گئی. بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ ٹانگ میں درد ہے اور نماز کھڑے ہو کر پڑھنے سے معذوری ہے. ۶/ مارچ کی صبح ہی کو نماز فجر کا سلام پھیرا، تو معاً فرشتۂ اجل کو حاضر پایا. ماں کی گود میں لیٹ گئے اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں ع

مرگے کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند!

اتفاق سے اسی دن خلافت کمیٹی کے جلسے میں شرکت کے لیے لکھنؤ اترنا ہوا. دہلی جا رہا تھا لکھنؤ

خاتون منزل پہنچا، تو ظفر الملک نے یہ خبر سنائی. یک بیک خبر سن کر بجلی سی گر پڑی! انا للہ ثم انا للہ.

معلوم ہوا کہ نعش اسی وقت بہرائچ سے نگرام کے لیے لکھنؤ سے گزرے گی. اسٹیشن گیا، نعش لاری سے جا چکی تھی. اس ریل پر محض عورتوں کا لٹا ہوا قافلہ سوار تھا۔۔۔۔ غسل میت دار العلوم ندوہ کے شیخ الحدیث اور شیخ وقت، مفتی حیدر حسین خان ٹونکی مرحوم نے اپنے ہاتھ سے دیا. کچھ روز بعد خاص اسی مقصد سے سفر کر کے نگرام گیا، اور قبر پر جا کر فاتحہ پڑھا، کچی تربت پر عجب بہار پائی!۔۔۔۔ ظاہر کی آنکھیں بہت روئیں دل کے کانوں نے بہت کچھ سنا۔

عمر کل ۲۷ سال کی پائی. پیدائش ۱۸۹۹ء کی تھی. مجھ سے سات سال چھوٹے تھے. ایک لڑکی چھوڑ گئے تھے، بڑی پیاری بچی تھی. سیانی ہو کر شادی سے قبل وہ بھی گزر گئی۔

( )

گیارہواں باب

وفیاتِ ماجدی

وفیات، مولانا دریابادیؒ کا ایک مستقل موضوع رہا ہے. جس پر وہ بزرگانِ دین، قائدینِ ملت، افرادِ خاندان اور دیگر اعزہ واقربا کے دنیائے فانی سے رحلت فرما جانے پر اپنے ہفتہ واری پرچہ سچ، صدق اور صدقِ جدید میں لکھتے رہے ہیں۔

خیال ہوتا ہوگا کہ موضوع کی طرح کتاب کے مضامین پر بھی مُردنی چھائی ہوئی ہوگی. سیدھے سادھے الفاظ، روکھا پھیکا اندازِ بیان، ترکیبیں سست اور مضامین کی آمد عنقا. نہ کسی طرح کی ادبی رعنائی ہوگی اور نہ کسی قسم کی جاذب نظری. غرض اسی طرح کی چیزوں سے یہ وفیات نامہ بھرا پڑا ہوگا! اور وفیات کا ان چیزوں سے تعلق بھی کیوں کر ہوسکتا ہے؟ آیئے کتاب کے سرِ ورق کو الٹتے ہیں اور فہرستِ مضامین پر نظر ڈالتے ہیں۔

ایں یہ کیا! ''بوڑھی محبوبہ'' ''بوڑھا کنوارا'' ''جشنِ نوشابہ''! موت میں زندگی کے یہ آثار اور عنادین میں یہ جدت وندرت! کیا اب بھی مضامینِ کتاب سے متعلق سابق خیال ذہن میں موجود ہے؟

ان مرثیوں میں مولانا دریابادیؒ نے اپنے اچھوتے اور البیلے انداز میں میت سے متعلق اپنے ذاتی تعلقات وتأثرات کو بیان فرمایا ہے اور تقدیر کے آگے تدبیر کی بے بسی کی پوری مصوری کی ہے. اور دلدوز ادبی مکتوبات ہی کی طرح بات میں بات پیدا کر کے میت کے ورثاء کی تسکین وتسلی کا سامان فراہم کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔۔۔ مرثیات کا یہ مجموعہ وفیات ناموں میں ایک اعلیٰ شاہکار اور انشائے ماجدی کا ایک لازمی جزو ہے، جس کے بغیر دریابادی انشاء کی ترجمانی مکمل نہیں ہوسکتی۔

والدہ ماجدہ

ماہ مبارک ربیع الاول کی پندرھویں ہے اور اپریل کی تیرھویں۔ اتوار کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اور شب دوشنبہ شروع ہونے کو، وطن سے دور پردیس میں ایک اللہ کی بندی پر عالم نزع طاری ہے۔ لڑکی، لڑکوں، پوتے پوتیوں کا حلقہ، زبانوں پر اللہ کا نام، اللہ کا کلام اور توحید کا کلمہ، اُدھر آفتاب غروب ہوا اِدھر وہ روح پاک کی ۸۵ سے زاید منزلیں طے کیے اپنے مالک کے حضور میں پہونچ گئی۔۔۔۔ میری جنت انھیں کے قدموں کے نیچے تھی۔ خوش نصیب تھا میں کہ اتنے عرصہ خدمت کا موقع پایا۔ بدنصیب ہوں کہ قدر اس نعمت کی ایک دن بھی نہ کی اور جو سب سے زیادہ مستحق تھی خدمت کی، اس کی خدمت کا حق ایک بار بھی ادا نہ کیا! حادثہ سخت اور اپنی محرومی و بدنصیبی اس سے سخت تر۔ اردو کی شُد بُد معمولی سی تھی وہ بھی اب بھول گئی تھیں۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھی ہوئی تھیں۔ زیادہ رواں وہ بھی نہ تھا اور اب ضعفِ بصارت کی بنا پر اور زیادہ اٹکنے لگیں تھیں۔ لیکن ہمت میں ذرا فرق نہیں، ذوق وشوق وہی، دُھن وہی، جلی حرف کا قرآن لے کر بعد اشراق بیٹھ جاتیں ایک ایک سطر نکالنے میں ایک منٹ لگ جاتا۔ اپنی ہار بھلا کہاں مانتیں، مذہبی کتابیں آخر عمر میں اپنی پوتیوں سے پڑھ کر سنتیں۔ قویٰ بجز شدید گراں گوشی کے عام طور پر آخر تک اچھے رہے، بے تکلف چلتی پھرتیں، کوٹھے پر چڑھتی اُترتیں، دعا بھی اسی کی کیا کرتیں کہ یا اللہ! ہاتھ پیر آخر وقت تک جواب نہ دیں، ہاتھ میں ذائقہ تھا، کھانے کی مخصوص چیزیں کچھ روز پیشتر تک اپنے ہاتھوں سے پکاتی رہیں اور عینک لگا کر سیتی پروتیں، کپڑے اپنے ہاتھ سے قطع کو یا بالکل آخر تک کرتی رہیں۔

ادھر کئی سال سے اکثر اسی موسم میں بیمار نزلہ و بخار میں ہو جاتیں اور چند ہی روز بعد اچھی ہو جاتیں۔ اب کی بھی یہی دھوکا رہا۔ خیال سن کی طرف گیا ضرور، لیکن جواب نفس نے یہ سمجھا دیا کہ ان کا سن تو ابھی پھر بھی کم ہے۔ ان کی بڑی بہن کی عمر ۹۵ سال کی ہوئی تھی اور ان کی والدہ تو اس سے بھی زاید اور پھر معالجین کا اطمنان مُستزاد۔ غرض کہ پردے پر پردے غفلت کے آنکھوں پر پڑے رہے۔

اور ساعت موعود تو جب بھی آتی ہے ایسی ہی دبے پاؤں اور زیر نقاب آتی ہے! آہ، نادان انسان اور اس کے غلط اندازے!

بیٹے اور پوتے پاس کھڑے پکار رہے ہیں اور کوئی جواب نہیں ملتا! یا اللہ اتنی بے رخی تو زندگی میں بھی کبھی نہیں دیکھی، چہرہ دُھلے کپڑے کی طرح یک لخت سفید خون کی چھینٹ نام کو نہیں. بس نور ہی نور. حالت منٹ منٹ پر کچھ سے کچھ ہونے لگی، تنفس تیز سے تیز تر ہو گیا، نبض کا نظام بگڑ گیا، آنکھ کی پتلیاں جم کر رہ گئیں. ناسوت کے رشتے ٹوٹنے لگے. برزخ کے دریچے کھلنے لگے. حلق نے دوا پانی سب سے انکار کر دیا، بجز آب زمزم کے. اللہ کی کریمی کے قربان کہ اس کے قطرے آخری وقت بھی اتر گئے، چارپائی قبلہ رخ رکھدی گئی، ہاتھ پیر برابر کر دیے گئے. اس نامہ سیاہ نے سورۂ یٰسین آخری بار پڑھنی شروع کی. جب آیتِ کریمہ سلام قولاً من ربّ الرحیم آئی جی نہ مانا بار بار اس کی تکرار کان کے خوب قریب جا کر کی، ادھر زبان پر فسبحان الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون آیا اُدھر روح پرواز کر گئی. گویا اسے انتظار اسی بشارت کا تھا!

(ص ۱۳:۱۳:۱۱)

ناز بردار بھائی

حقیقی بھائی میرے ایک ہی تھے. سن میں مجھ سے آٹھ سال بڑے، نام عبدالمجید. سال ولادت غالباً آخر ۱۸۸۴ء. نیک مزاج، صلح جوئی، بے طمعی، فقیر دوستی والد مرحوم سے ورثہ میں پائی تھی، ابتداءِ ملازمت سے آخر عمر تک قائم رہی. سرکاری عہدوں پر رہ کر اچھے اچھوں کی سیرت و کردار کی قلعی کھل جاتی ہے. یہ ہر جگہ نیک نام اور ہر دلعزیز ہی رہے. حکومت سے کام لینے کے بجائے ہر ایک سے لچ کر ملے اور گھل مل کر رہے. اور دوستی ہی دوستی میں سارے کام انجام دیتے رہے. لکھنؤ کی تحصیلداری یوں بھی بڑے معرکے کی چیز ہے. کلکٹر صاحب کمشنر صاحب یہاں تک کہ لاٹ صاحب کے ہاں سے بھی عجیب و غریب فرمایشوں کا نزول روز ہی ہوتا رہتا تھا. اور پھر تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کا زمانہ تو غضب کا زمانہ تھا. اتنی کڑی منزل بھی یہ اپنی مروت اور دوستانے کے قدموں سے طے کر گئے.

خیر دنیا کے لیے جیسے بھی ہوں اپنے اس شدھ بھائی کے حق میں تو سراپا شفقت وکرم اور پیکر لطف واحسان ہی تھے اپنی اور بیوی بچوں کی ہر خوشی میری خوشی کے آگے گرد کر رکھی تھی. جب تک پنشن نہ ہولی اور میں نے قبول کرنے سے قطعی انکار نہ کر دیا. ہر ماہ ایک معقول رقم سے میری مالی امداد کرتے رہے اور اب تک میں دریاباد سے لکھنؤ جب کبھی جاتا تو ان کے یہاں ایک چھوٹی سی عید ہو جاتی. پُر تکلف کھانے اور ہر طرح کی خاطریں اور واپسی میں ناشتہ کے نام سے کچھ نہ کچھ تحفے ساتھ کر دیتے ضرور تھے. خط میں کسی ہفتہ ناغہ نہیں ہوتا بلکہ بارہا تو خط ہفتہ کے اندر ہی پہونچ جاتا اور آم خربوزہ انگور، آڑو، خوبانی وغیرہ ہر ہفتہ لکھنؤ سے کوئی موسمی پھل پہنچتے رہنے لازمی بن میں اتنے بڑے ہونے کے باوجود برتاؤ میں کہیں سے بھی بڑائی کا پتہ نہ چلنے دیتے. بلکہ صاحب سلامت تک میں اکثر خود ہی سبقت کر جاتے. خاندان بلکہ برادری بھر میں ہم لوگوں کی محبت ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔۔۔۔ محبت مجھے بھی تھی لیکن وہی، جیسی ایک بھائی کو دوسرے بھائی سے ہوتی ہے. ان کی محبت اس سے کہیں بڑھ کر پدرانہ بلکہ مادرانہ شان رکھے ہوئے تھی. میری ناخوشی انھیں کسی حال میں گوارا نہ تھی. بھائی بہت سے دیکھے ہیں لیکن ایسا ناز بردار بھائی کمتر ہی کسی کے نصیب میں آتا ہے.

اتنی طویل مدت میں ایسا نہ تھا کوئی سیاسی، مذہبی یا خانگی اختلافی مسئلہ ہی نہ آیا ہو. کیوں نہیں اس دنیا میں ان طویل سابقوں کے بعد یہ ممکن کیوں کر تھا. بارہا اس کی نوبت آئی لیکن محبت کے غلبہ نے کبھی اسے دیر تک ٹھہرنے کی اجازت نہ دی. بھائی ہونے کے علاوہ ان کے چاروں لڑکوں کی شادیاں میری ہی چاروں لڑکیوں سے ہوئیں. ہر صاحب تجربہ جانتا ہے کہ اس چوہرے سمدھیانے نے تعلقات کو کتنا نازک بنا دیا ہوگا لیکن یہ محض ان کی عاشقانہ محبت کا کرشمہ تھا کہ شیشہ میں بال پڑنے کی بھی نوبت کبھی نہ آئی.

۱۷ر دسمبر (دوشنبہ) کو انھیں اچھا خاصہ چھوڑ کر دوپہر کی گاڑی سے میں دریاباد واپس آیا حسب معمول خدا حافظ کہہ کر مجھے رخصت کیا. شب تک اپنے معمولاتِ روزمرہ کے مطابق پورے کیے. ایک پاکستانی عزیز رخصت ہونے آئے. آٹھ بجے تک ان سے گفتگو کی. نو بجے سونے لیٹے.

ڈھائی بجے شب کو متصل لیٹے ہوئے منجھلے لڑکے کو اٹھا کر کہا اس وقت سانس کی تکلیف زیادہ ہے۔ اس کے بعد کہا "یا اللہ رحم"! انھوں نے دوا پلائی اس کے بعد نیم سجود کی حالت میں تکیہ پر سر رکھ لیٹ گئے۔ یہ سمجھے کہ شاید سو گئے۔ جب کچھ منٹ تک کراہنے اور سانس لینے کی آواز نہ آئی تو انھیں فکر ہوئی اور انہوں نے جا کر اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالقوی کو جگایا۔ انھوں نے آ کر دیکھا تو نبض ڈوب چکی تھی۔ بل چل مچ گئی۔ دوسرے لوگوں نے بھی آ کر دیکھا۔ ایک دوسرے طبیب کو بھی بلا کر دکھایا گیا۔ وہاں اب کیا تھا۔ بندہ اپنے مولیٰ کے پاس پہنچ چکا تھا۔

اطلاع ہونے پر دوپہر کو جب میں پہونچا تو اسی ڈرائنگ روم میں جہاں آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نازبردار بھائی کا چہرہ باوجود بیمار نزار ہونے کے ہمیشہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھتا تھا۔ آہ، وہ پلنگڑی پر نہایا ہوا کفن پوش۔۔۔۔ خاموش لیٹا ہوا ہے۔ آج میری طرف سے یہ بے التفاتی یہ بے اعتنائی۔ چہرہ اب بھی پُر رونق۔ بلکہ ایک حد تک نورانیت لیے ہوئے۔ آنکھ کھلی ہوئی تھی۔

(ص:۱۸، ۱۹، ۲۰)

ہمشیر کی رخصتی

ہمشیر ایک ہی تھیں۔ سن میں ۴، ۵ سال بڑی۔ عمر میں ۶۰ سال کے اندر۔ عابد اور صالحہ ایسی کہ دور دور تک مثال ذرا مشکل ہی سے ملے گی۔ حاجیہ، تہجد گزار، نماز تلاوت کی عاشق۔ غیبت و بدگوئی، لڑائی جھگڑے سے ناآشنا۔ ایک ایک کی ہمدرد و غمخوار۔ ۳۵ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں تھیں۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ وسط اپریل میں لکھنؤ میں بیمار پڑیں، اور بیماری کے وہ شدائد کہ الامان۔ آہ، وہ تیمارداری کی راتیں۔ کبھی مایوسی کی تاریکیاں، کبھی امید کی ہلکی سی شعاعیں۔

اپریل ۴۵ء کی ۲۲ تھی اور جمادی الاول کی ۵ کہ دوپہر کے وقت تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا اور جو صابر و شاکر بندی شاید جنت ہی کے لیے بنی تھی، جنت کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ غم نصیب ناکارسورۂ یٰسین سنا رہا تھا۔ اور ایک جوان صالح منہ میں آب زمزم ٹپکا رہا تھا۔ گزرنے والی کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے دیکھے گئے اور کمرہ رونے کی بے اختیار آوازوں اور سسکیوں کے ساتھ کلمہ شہادت کی صداؤں

سے گونج اٹھا!۔۔۔موت شاید ہر مومنہ کی یوں ہی ہوتی ہے! غسل کے بعد چہرہ پر رونق تھی، معصومیت تھی، کوئی اثر نہ ضعف کا نہ مرض کے شدائد کا! ایسا رونق و شاداب، چہرہ شاید شباب میں ۳۰، ۳۵ سال قبل رہا ہوگا! نمازِ جنازہ لکھنؤ کے مشہور عارف باللہ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری نے پڑھائی۔۔۔۔ سن میں بڑی تھیں، مگر ساری عمر اپنے کو چھوٹا بنا کر رکھا تھا. آج اپنے پروردگار کے حضور میں انشاء اللہ ہر طرح بڑائیوں سے سرفراز رہی ہوں گی!

ماں کے بعد خالص، بے غرض و بے لوث محبت کا اگر کہیں نشان ملتا ہے تو بہن کی ذات میں. ہر بہن رکھنے والا اس کا تجربہ رکھتا ہے. اللہ نے آج وہ نعمت واپس لے لی. نعمت کا حق اتنے دنوں کب ادا ہوا تھا جو اَب کبھی آیندہ اس کی امید قائم کی جاتیں۔۔۔ ہمشیر کی رخصتی ایک شادی کے وقت ہوتی ہے اور ایک یہ. وہ مجاز اور یہ حقیقت!

عقلاً صبر، کیا معنی، تسلیم و رضا داخل ایمان ہے. لیکن طبعی حزن و غم پر بس زندگی میں جو مستقل خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ زندگی بھر کے لیے ہے.

غم اور طبعی غم میں، غم آفریں نے لذت بھی بلا کی رکھی! اور قلب کی قساوت کا تو اس غم سے بڑھ کر کوئی علاج ہی نہیں، کاش اسی کے اثرات میں پائیداری ہوتی! عجب شان حکمت ہے، اور جمال میں کمال، کہ نعمت دیتے ہیں تو ہنسا کر اور عارضی طور پر، واپس لیتے ہیں تو رُلا کر. جسم کی لذت اُس میں، روح کی حلاوت اِس میں!

(ص: ۳۲، ۳۳)

بوڑھی محبوبہ

۱۱ر شوال یوم سہ شنبہ تھا ۱۷ر جنوری کی پہلی تاریخ کہ ساڑھے بارہ بجے شب کے بعد ایک مومن بندی کی روح ۷۱، ۷۲ سال کی عمر میں اپنے مالک و مولیٰ کے حضور میں طلب کر لی گئی.

جون ۱۹۱۶ء میں اس تباہ کار کے عقد ازدواج میں آئی تھی. ۵۲ سال کی مدت رفاقت کچھ تھوڑی نہیں ہوتی. جب کہ رفاقت محض رسم و ضابطہ کی نہ ہو، بلکہ اس کی بنیادیں الفت و محبت پر قائم ہوئی

ہوں!۔۔۔ پیمانِ وفا عمر بھر کا تھا، لیکن خود عمر کی پائداری کتنی!

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

شادی جس وقت ہوئی طرفین ۷۰، ۷۵ برس کے بوڑھے کھپٹ نہ تھے۔ ایک طرف شوخ قبول صورت نوجوان لڑکی تھی۔ ۲۰، ۲۱ سال کی عمر کی اور وقت کے معیار سے خاصی پڑھی لکھی۔ انگریزی کی خُدبُد سے واقف۔ اور لکھنؤ کے اونچے معاشرے کی تربیت یافتہ اور دوسری طرف ۲۴ سالہ نوجوان انگریزیت میں غرق، دین و مذہب کے نام سے بیزار۔

اول ہاتھ میں لینے والی چیز حسن صورت نہیں، حسن سیرت ہوتی ہے اور اللہ نے اس دولت سے وافر حصہ دیا تھا عورت کا جوہر سسرال والوں کی خدمت کرنا ہے۔ اس مرحومہ نے یہاں آتے ہی میری والدہ اور ہمشیرہ کا دل اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جو خاندان مشترک کہلاتا ہے اس میں آپس کے سابقہ کی الجھنیں اور زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں میرے بھائی اور بھاوج دونوں اس سے رام ہو گئے۔ خاندان کے دوسرے عزیز و اقارب ملنے والوں، گھر کی خادماؤں سب پر اس کی نیک بخت کی میٹھی زبان، خوش مزاجی، فیاض طبعی نے اپنا سکہ جمالیا تھا، داد و دہش و غریب پروری داخل فطرت تھی۔ ابتدائی ماحول اہل رسوم و بدعات کے درمیاں رہا۔۔۔ رفتہ رفتہ حضرت تھانوی سے قرب و اعتقاد بڑھتا ہی گیا اور میرے تمام مخلص بزرگوں میں مولانا گیلانی اور سید سلیمان ندوی اور علی الندوی وغیرہم کے خیالات سے استفادے کے پورے موقع ملتے رہے نماز کی تارک شروع میں بھی نہ تھیں۔ کچھ روز میں پوری پابند ہو گئیں۔

۴ر جنوری ۱۹۶۹ء (جمعرات) کو قریب شام ایک لاری ۲۵، ۳۰ مسافروں سے بھری ہوئی لکھنؤ سے باندے جارہی ہے اور اس وقت کانپور کے حدود میں داخل ہو رہی ہے۔ سفر تفریحی نہیں، ماتمی ہے۔ تین لڑکیاں ہیں جو ابھی چند ہی گھنٹے ہوئے ماں کے سایہ سے محروم ہوئی ہیں اور جس کا جنازہ اپنی بچیوں کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک ۷۵، ۷۶ سال کا بوڑھا ہے جو ابھی دنیا کی عزیز ترین متاع سے محروم

ہو چکا ہے. اسی طرح چھوٹے بڑے دوسرے عزیز وقریب ہیں. کسی کی زبان پر کلمہ شہادت اور کسی کی زبان پر قرآن کی سورتیں اور اکثر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں. وقت سوا پانچ سے گزر چکا ہے. آفتاب زرد پڑ چکا ہے اور ہر منٹ بلکہ ہر سکنڈ اور ڈوبتا ہی چلا جارہا ہے۔۔۔۔ کھلے میدان میں جب کبھی غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے دل ہمیشہ اس سے متأثر ہوا ہے. رفیقۂ زندگی ہی کے آخری لمحات حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے. آج یہ خیال نہیں واقعہ ہے، قال نہیں حال ہے. اپنی دنیوی زندگی کے لطف وسکون وراحت کا آفتاب..... ڈوب نہیں رہا بلکہ واقعۃً ڈوب چکا ہے.

ساڑھے دس بجے شب کو لٹا پٹا قافلہ باندے یوسف منزل کے پھاٹک پر پہونچا. اس ۵۲ سال کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار اس ڈیوڑھی پر قدم رکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا. ہر بار اس سے کس درجہ مختلف! آج کی آمد سب سے نرالی تھی. در ودیوار تک گویا رو رہے تھے. کفن پوش چہرے کو خاموش وساکت ہوئے ۲۲ گھنٹے ہو چکے تھے. باندھے سے لکھنؤ اور پھر دریابادر ابطہ قائم کرنے ہی میں ٹیلیفون اور تار دونوں کے ذریعہ سے ۱۰، ۱۲ گھنٹے لگ گئے تھے. باقی ۱۰ گھنٹے پہونچنے کی کوشش میں لگ گئے! ۔۔۔۔ لاشۂ بے روح کو سامنے دیکھ کر کیا گزری ہے. یہ نہ پوچھیے. وہ وقت بہر حال یاد آ گیا جب کسی بڑی سی بڑی خوش جمال وخوش صفات خاتون کا ذکر سننے میں آتا تھا اور طبیعت میں بجائے کسی قسم کے رشک کے ایک گونہ فخر واطمنان ہی قائم رہتا تھا. بقول استاد شبلی ؎

یاد آں روزے کہ دست افشاں گزشتم از حرم
از غرور آں کہ من ہم آستاں داشتم!

نعمت بہر صورت فانی ہی تھی۔۔۔۔ اور دو ہی چار لمحہ کے بعد یہ صدا بلند ہوئی کہ ناسوت کی آخری زیارت ختم. بس اب آیندہ دیدار انشاء اللہ جنت ہی میں نصیب ہوگا۔

جس وقت کے آنے کا دھڑکا سالہا سال سے ہر گھڑی لگا چلا آرہا تھا وہ آخر اپنے وقت موعود پر آ ہی گیا. اور جس حی وقیوم نے صبر کا مطالبہ کیا. اسی نے گرتی ہوئی قوت بھی صبر کی بخشدی! کارخانۂ کائنات میں ایک ذرہ بھی فرق نہ آنے پایا. اور دنیا جس طرح چل رہی تھی ٹھیک اُسی طرح

چلتی رہی. کل شئ ھالک الا وجھه اور کل من علیھا فان ،قسم کے ارشادات بے معنی نہیں ،سرتاسر بامعنی تھے۔۔۔۔اپنے مخدوم بزرگ اور محترم دوست مولانا سید سلیمان ندویؒ فاضل وعارف تھے .شاعر نہ تھے لیکن شعر بھی خوب کہہ لیتے .اپنی زو جہ ثانیہ سے کمال لطف والتفات رکھتے تھے .وفات پر مرثیہ کہا اس کے اس شعر میں شاعری نہیں کی ،حقیقت کی ترجمانی کی ہے ۔

تیرے جانے سے گمان برہمیٔ دہر کا تھا
تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا!
کسی بندہ کی خود یہ خام خیالی بھی کس درجہ طفلانہ ہوسکتی تھی!

(ص:۲۵)

نئی نویلی

وہ ابھی بالکل نوجوان تھی .شادی کو پورا سال بھی ابھی کہاں گزرا .دس گیارہ مہینے تو ہوئے. قریب کے رشتے سے میری بھتیجی تھی .اردو ترجمہ قرآن پڑھنے میں شاگرد بھی .بڑی مذہبی ،بڑی صالح ، نماز کی عاشق ،روزے کی شیدائی ،سب کی ہمدرد غمخوار ،بڑی مخلص خدمت گزار ،بچہ ہنستا کھیلتا پیدا ہوا. دوسری رات کو بیمار پڑی اور تیسری صبح کو قبل اس کے کہ آفتاب اپنے پورے عروج کو پہونچے اس کی عمر کا آفتاب غروب ہوگیا انا للہ .زبان پر آخر تک یا اللہ یا رحمن یا رحیم رہا دوسروں سے سورہ یٰسین فرمائش کر کے پڑھوائی .مُردہ چہرہ پر بجائے مردنی اور بے رونقی کے رونق اور تازگی ،آنکھیں کھلی رہ گئیں ،ان سے بجائے بدنمائی کے اور خوش نمائی اور زیبائی !نام ایک پیغمبر زادی کے نام رقیہ تھا قبر میں باپ نے اُتارا. یہ نہ پوچھیے کہ کس دل سے.

موت کا وقت عجیب پُر اثر ،پُر درد تھا لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب شفاء الملک کے خطاب سے سرفراز ابھی ہاتھ نبض پر رکھے ہوئے ہیں .ابھی جواہر مہرہ حلق سے اتارنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں ،ابھی آنکھوں کی پُتلی کا معائنہ کر رہے ہیں کہ زندگی کے کچھ آثار باقی بھی ہیں!۔۔۔گویا یہ تدبیریں موت کے فرشتے کا ہاتھ پکڑ لیں گی۔۔۔ماں کی دلدوز آہیں اور دعائیں! کس قلم کے بس

میں ہے کہ مصوری ماں کے رنج کی کر سکے؟ لیکن رنج بحمداللہ مسلمان کا تھا۔ ادھر غشی سے اٹھی، اُدھر سلسلہ پھر دعاومناجات کا کلمہ تلاوت قرآن شروع ہوگیا۔ اے اللہ! تیری امانت تیرے سپرد، یہ نعمت تو ہی نے دی تھی اور اسے واپس بھی لے لیا!۔۔۔۔ مسلمان عورت بھی جنت، کتنے طریقوں سے لے سکتی ہے!

جسم رنجور، رُوح مسرور، ''اب کوئی ہمیں پہچان نہیں پڑتا'' مرنے والی نے ہر اس واضطراب سے نہیں سکون واطمنان سے کہا۔ سکرات شروع ہو چکا تھا۔ بصارت اپنا فعل چھوڑ چکی تھی اور معاً زبان بھی بند ہوگئی۔ ہونٹ دوبار اللہ اللہ کہنے کے لیے ہلے اور ایمان والی کی روح راضیۃً مرضیہ کی بشارت پر دوڑتی ہوئی اڑتی ہوئی روانہ ہوگئی!۔۔۔۔ اللہ کو جو بندی اپنے مولیٰ کی یاد میں کسی حال میں غافل نہ ہوئی تھی۔ جس نے نماز کو شادی کے نغموں اور رخصتی کے ہنگاموں میں بھی قضا نہ ہونے دیا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ مولیٰ کی یاد اس وقت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی، کوئی اس یاد کی طرف دوڑ کر دیکھے تو وہ یاد خود کب اس کا پیچھا چھوڑتی ہے؟۔۔۔۔ ''فاذکرونی اذکرکم'' کی ایک نئی تفسیر عملی رنگ میں!

(ص:۳۹)

ایک خدمت گار کی یاد میں

حاجی محبّ علی مرحوم ہمارے گھر کے پروردہ تھے۔ ان کے والد نے ہمارے ہی ہاں ملازمت میں انتقال کیا۔ ان کی ماں یہیں پلیں، بڑھیں، بوڑھی ہوئیں، اور ابھی زندہ ہیں محبّ علی پیدائش کے وقت سے گویا ورا ثۃً ہماری ملک ہوگئے۔۔۔۔ میاں لوگوں کی دنیا میں سلطان ابن سلطان کی طرح آقا ابن آقا اور خادم اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ ہوتے چلے آئے ہیں۔

پیدائش ۱۹۰۱ء کی عمر کے ۵۰ سال ہماری ہی ڈیوڑھی پر ادنیٰ معاوضہ پر گزار دیے۔ انتہائی اخلاص، دیانت داری، وفاداری، ہواخواہی اور ''نمک حلالی'' کے ساتھ۔ (یہ آخری لفظ بھی آقاؤں اور آقازادوں کے لغت کا ہے) خدمت گار کا آقا صرف ایک نہیں ہوتا گھر کی مالکہ، آقازادوں اور آقازادیوں ان کے بھائی بھتیجوں سب کی رضا جوئی یکساں اس پر واجب ہوتی ہے۔۔۔۔ اس امتحان میں پورا اترنا پہاڑ سے دودھ کی نہر کاٹ کر لانا ہے۔

۲۱ رمضان آخر وقت عصر میں جب نزع شروع ہوئی تو میں نے سب سے پہلے پہچانا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور تنفس بگڑ چکا تھا۔ الجھن بے انتہا بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ تسکین ''یٰسٓ سلام'' پڑھنے سے ہوگی۔ آواز سے نہ پڑھا جا سکے تو اندر سے اس کا ورد رکھو۔ خود بھی کئی بار پڑھ کر دم کیا۔ ہاتھ سرد ہو چکے تھے۔ پیروں میں کچھ گرمی باقی تھی۔ ایک طبیب کو بلا کر دکھایا انھوں نے کہا کہ نبض بال کی سی باریک چل رہی ہے۔ بعد مغرب سوئے تنفس نمایاں ہو گیا۔ عورتوں نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ میں زمین پر بیٹھ گیا اور لب مرگ مریض کے کان میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ہوش وحواس سب بالکل درست تھے۔ ایک عزیز سرہانے کھڑے کہتے گئے کہ یہ ماں ہیں یہ بیوی ہیں اور وہ ایک ایک کے لیے لفظ معافی زبان پر لاتے گئے۔ آخر میں مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب بیٹھے ہیں اس پر اپنا سوکھا ہوا لیکن متورم ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا ''معاف کیجیے گا''۔ میں نے ہاتھ دبا کر اور رو رو کر کہا کہ ''معافی دونوں طرف سے ہونا چاہیے، میں نے معاف کیا تم بھی معاف کر دو''۔ ایک حافظ نے سورہ یٰسین شروع کر دی اور چند منٹ کے اندر روح جسم کا ساتھ بالکل چھوڑ گئی۔ چہرہ خود بخود قبلہ رو ہو گیا۔

غسل کا اصل کام میرے حقیقی خالہ زاد بھائی نے انجام دیا۔ وضو کا وقت آیا تو اعضائے وضو پر پانی میں خود ڈالتا گیا اور رو رو کر جس طرح دعا مظلوم ومرحوم خادم کی مغفرت کے لیے کرتا گیا اسی طرح اس کے زندہ ظالم آقا کے لیے بھی۔۔۔۔ دل نے کہا جنت میں خادم ومخدوم کہاں، وہاں تو سب مخدوم ہی ہوں گے۔ تاہم یہ شخص جو دنیا میں مجھ پر اتنی جان چھڑکتا رہا۔ اور اسی طرح یہ جذبہ اس کی فطرت میں راسخ ہو گیا ہے کہ عجب نہیں جو یہ حقیقت میں کبھی (اگر اللہ نے وہاں اپنے کرم بے حساب سے پہنچا دیا) اپنے کو میری خدمت ہی کے لیے پیش کرتا رہے۔

کفن پہناتے جب کفنی میں نے گردن میں ڈالی ہے تو یہ یاد آ گیا زندگی میں بے شمار اس نے میرے کپڑوں کی دیکھ بھال رکھی ہے آج ایک بار تو عالم ناسوت میں اس کی یہ آخری خدمت کر لوں۔ نماز اور تدفین سب ویسی ہوئی جیسی ایک مسلمان کی ہوتی ہے۔ بڑی تمنا مرحوم کو اس کی تھی کہ

جمعہ کا دن نصیب ہو۔ اللہ نے یہ تمنا پوری کردی کہ رمضان مبارک کا آخری عشرہ عنایت کیا عتق من النار کا وعدہ یاد کر لیجیے۔ آگ سے تمام تر آزادی مخلصی! اور تدفین ایسے وقت ہوئی کہ قبر میں پہلی رات وہی جمعہ کی رات اور شب قدر کی ایک رات (۲۳ ویں شب) اکھٹی مل رہی تھیں۔ پھر دق کے مرض میں شہادت کی بشارت اس کے علاوہ۔ اب اس اخلاص محض کو آنکھیں عمر بھر ترستی رہیں گی۔

تراعاشق شود پیدا و لے مجنوں نخواہد شد!

(ص:۴۳)

عبدالرحمٰن کی موت

پہاڑی اور پہاڑی غاروں میں پتھروں اور سنگریزوں کی تعداد حد شمار سے خارج پڑی ہوئی ہے جنھیں انسان اور جانور ہر وقت پامال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان ہی میں کوئی سنگریزہ لعل یاقوت بن کر نکل آتا ہے۔ جس کی قیمت پوری ایک سلطنت کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے اس کو اگر کوئی توڑ ڈالے، تو دل پر کیا گزر جائے گی؟ سمندر میں بارش کے بے شمار قطرے ہر سال گرتے رہتے ہیں جو کسی حساب میں نہیں آتے، لیکن انھیں میں چند قطرے وہ بھی ہوتے ہیں جو آغوشِ صدف میں پل کر موتی بن کر نکلتے ہیں اور تاج سلطانی کا زیور بنتے ہیں۔ ان کو اگر کوئی سمندر میں پھینک دے تو دل کو کیوں کر صبر آئے گا۔ جنگل میں خودرو بیل اور پتے اور پودے، بوٹیاں اور پتیاں ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں جو جانوروں کی غذا کا کام دیتی ہیں، لیکن گلاب کی تازہ شاداب کلی بزمِ ہستی کو معطر کرنے کے لیے ہوتی ہے یہ کلی اگر پھول بننے کے ساتھ ہی خزاں کی دست برد کی نذر ہو جائے تو دل کو کیا کہہ کر سمجھایا اور قابو میں رکھا جاسکتا ہے؟

ایک چراغ جلا، لیکن قبل اس کے کہ اس کا اجالا پوری طرح پھیلے، بجھ گیا، ایک آفتاب چمکا، لیکن بیشتر اس کے کہ اس کی شعاعیں پورا نور پھیلائیں غروب ہوگیا۔ ایک پھول کھلا مگر معاً مرجھا گیا۔ سبزہ لہلہایا مگر فوراً خشک ہوکر زمین کے برابر ہوگیا۔ حق کی پکار بلند ہوئی لیکن معاً فضائے لامتناہی میں گم ہوگئی۔ عبدالرحمٰن نگرامی نے ۲۷، ۲۸ سال ہوئے ناسوت کے ظلمتکدہ میں اپنی آنکھیں

کھولیں، لیکن یہاں کی فضا کو شاید اپنے غیر موافق پا کر ۶/ مارچ ۱۹۲۶ء، ۲۱/ شعبان ۱۳۴۴ھ کو صبح کے وقت تعین اطلاق میں، محدود غیر محدود میں، مقید مطلق میں، قالب بے قالبی میں، جسد عالم جان میں جذب وگم ہوگیا. سچ کہا سچ کہنے والے نے کہ ہم سب ''اسی'' کی طرف جانے والے ہیں.

آنکھیں اشکبار، کہ عالم انسانیت کے اس جوہر آبدار کو اب کہاں تلاش کریں. قلب مضطر کہ کائنات آب وگل کے اس گوہر بے بہا کے بغیر کیوں کر آرام پائے. عقل حیران کہ گلشن بشری کے اس گل رعنا کو کہاں سے ڈھونڈ نکالا جائے. دنیا کی ظاہر بیں نگاہیں اس مرنے والے کے خط وخال سے زیادہ مانوس نہ تھیں. آج اگر اس مرحوم کے فضائل وکمالات کو پھیلا کر بیان کیا جائے تو یقیناً بہتوں کو مبالغہ کا شک گزرے گا. لیکن جن لوگوں کو خوش نصیبی سے ان سے ذاتی نیاز حاصل تھا وہی بدنصیب اندازہ کر سکتے ہیں، کہ ایک ذات کے اٹھ جانے سے امت اسلامیہ کیا کھو بیٹھی ہے. مرحوم کو اس زمانہ سے جانتا ہوں جب وہ دارالعلوم ندوہ کی شاید کسی نیچی جماعت میں پڑھتے تھے. اور ان کی عمر ۱۵، ۱۶ سے زاید نہ تھی تقریر کا شوق انھیں اسی وقت سے تھا اور قیصر باغ لکھنؤ میں جب پہلی بار میں نے ان کی تقریر سنی اتنی بلند وبرتر تھی کہ قدرۃً یہ بدگمانی ہوئی کہ کسی نے یہ تقریر قلمبند کر کے پیشتر سے حفظ کرادی ہے ورنہ اتنا کم سن طالب علم ایسی برجستہ تقریر کر نہیں سکتا. مگر جوں جوں سابقہ بڑھتا گیا یہ بدگمانی دور ہوتی گئی اور اس آئینہ کے اصل جوہر کھلتے گئے۔

چند شوریدہ سروں کو اصلاحی پرچہ نکالنے کی ضرورت عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی ۱۹۲۴ء کی آخری سہ ماہی میں مولوی ظفر الملک صاحب کی مستعدی سے یہ دشواری ایک بڑی حد تک حل ہوگئی. ۲۱/ ستمبر ۱۹۲۴ء کو دفتر سچ میں چار شخصیتوں کی ایک مختصر مجلس میں تمام ابتدائی مراتب طے پا گئے. اس مختصر مجلس کے ایک اہم رکن خود مولوی عبدالرحمٰن تھے. عام مقاصد سے ہمدردی واتفاق رکھنے والے متعدد احباب تھے. لیکن یہ اسی وقت نظر آ گیا تھا کہ اکثر عقائد وخیالات کے جزئیات تک میں جو موافقت عبدالرحمٰن کو عبدالماجد کے ساتھ ہے وہ شاید دوسرے عنایت فرما کو حاصل نہیں. اور شرکت تحریر میں جو سہولت، مرحوم کے ساتھ حاصل ہوسکتی تھی اس کی توقع کسی اور سے نہیں. بعد کے تجربہ نے اس توقع کو

حرف بہ حرف ثابت کر دیا۔ ایک سال سے کچھ اوپر کے طویل سابقہ میں مرحوم کے لہجہ تحریر سے صرف ایک بار جلد اول نمبر ۱۵ میں ایک مضمون کے عنوان اور اس کے بعض الفاظ سے متعلق مجھے اختلاف ہوا اور جب میں نے اپنی اس رائے کو ان پر ظاہر کیا تو اس بے نفسی کے ساتھ جو ان کے بعد میرے لیے اب خواب وخیال ہے انھوں نے بلا تأمل وتوقف میری گزارش کو تسلیم فرمالیا۔

حسن عمل اب بھی مسلمانوں سے بالکل رخصت نہیں ہو گیا ہے۔ سرزمین ہند کے گوشوں اور زاویوں میں ابھی بعض بڑے بڑے زاہدانِ شب بیدار موجود ہیں۔ قومی کام کرنے والوں ہی کی جماعت میں بھی ابھی چند نہایت اور مخلص اور پختہ ایمان جوان مرد زندہ ہیں، لیکن اگر میری دیانت سے یہ سوال کیا جائے کہ اب تک سب سے زیادہ معصومانہ زندگی لغزشوں اور آلائشوں سے پاک زندگی، بچوں کی طرح پاک، اور بے رنگ زندگی کسی کی دیکھی ہے۔ تو اپنی واقفیت وتجربہ کے دائرہ میں بلا تأمل، صرف مرحوم عبدالرحمٰن کا نام پیش کر سکتا ہوں۔ نوجوانی کے باوجود اس قدر صالح و پاکباز رہنا قومی واجتماعی زندگی میں پوری طرح پڑ کر بھی اس قدر محتاط و بے لوث رہنا محض عطائے الٰہی ولطف خداوندی کا حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

وہ صحیح معنوں میں متقی تھے۔ زبان، آنکھ، زبان، کان اور دل سب کو بدی اور بدکاری و بد خیالی سے روکے ہوئے تھے۔ حلم وتحمل خمیر میں داخل تھا، سخت سے سخت اشتعال کے موقع پر بھی برہم نہیں ہوتے تھے۔

اپنے طویل سابقہ میں، غصہ آئے۔ میں نے ایک موقع پر بھی نہیں دیکھا۔ یتیموں پر شفقت، محتاجوں کی خبر گیری، بے کسوں کی امداد کے بغیر زندگی محال تھی۔ انکسار اور فروتنی، ہر ادنی واعلی کے مقابلہ میں برتتے تھے۔ بڑوں کے ادب ولحاظ اور چھوٹوں سے محبت والفت سے کسی گھڑی خالی نہ تھے۔ نفل نمازیں پڑھتے تھے۔ مگر چھپ کر، روزے بہ کثرت رکھتے تھے۔ مگر راز بنا کر بے لوثی اور بے نفسی، انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ خودداری کے جدید مفہوم سے بالکل ناآشنا تھے۔ مگر ساری زندگی اطاعت وعبادت، تقوی وطہارت میں گزاری مگر کبھی اپنی مذہبیت، پاکبازی وتقدس کی تجارت نہ کی۔ قومی واجتماعی زندگی

میں پوری طرح پڑنے کے باوجود بھی کبھی آگے بڑھنے کی اور ابھرنے کی کوشش نہ کی۔

دل کی ان ساری فضیلتوں کے ساتھ دماغ بھی ممتاز لے کر آئے تھے صحیح معنی میں عالم وطالب علم تھے، علمی مصروفیتوں سے ایک لمحہ فرصت نہ تھی علوم میں سب سے زیادہ ذوق ودلچسپی کی چیز، کسی انسان کی نہیں، اللہ کی کتاب حکیم تھی۔ خاص شغف وانہماک اسی کے مطالعہ میں تھا، لیکن اس کے علاوہ بھی سارے دینی ومذہبی ذخیرہ ادبیات پر گہری، اور وسیع نظر تھی۔ خدمت دین کی غرض سے انگریزی بھی بقدر ضرورت پڑھ لی تھی۔ حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر رہنے کے لیے بہ کثرت اخبارات ورسائل کا مطالعہ برابر رہتا تھا۔ ذہن میں سلجھاؤ تھا۔ حسن ترتیب، حسن بیان، سلالت زبان ذوق انشاء کی شہادت ان کے قلم کی نکلی ہوئی سطریں دی رہی ہیں۔

الفاظ میں نہیں کہا جاسکتا کہ اس نادر شخصیت اس جامع کمالات، اس حیرت انگیز نمونہ عمل کی وفات سے امت اسلامیہ نے کیا کچھ کھودیا۔ بہر حال تقدیر الٰہی پوری ہو کر رہی اور بجز صبر وشکر کے اب کسی کے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں۔

عزیزوں سے بڑھ کر عزیز، مخلصوں سے بڑھ کر مخلص عبدالرحمٰن! اپنے ایک گنہگار اور شکستہ بھائی کی جانب سے مغفرت ورحمت کی بے گنتی اور دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کا ہدیہ حقیر قبول کر، تمہاری آنکھوں سے آج پردے اٹھ چکے ہیں۔ لفظ وعبارت سے گزر کر آج تم معنی وحقیقت کے محرم اسرار ہو چکے ہو۔ جمال سرمدی کے لیے بے حجاب نظارہ سے آج شادکام ہوئے ہو۔ تمہیں ان خوش نصیبوں کا واسطہ اور جس بے نیاز کی حریم ناز میں شرف باریابی حاصل کر چکے ہو۔ اُس کی عظمت وکبریائی کا صدقہ کہ لھم ما یشاء ون عند ربھم کے مرتبہ پر فائز ہو کر اور راضیۃً مرضیۃً کے خلعت سے سرفراز ہو کر اور لھم ما یشاء ون فیھا ولدینا مزید کے انعامات سے مالا مال ہو کر اپنے گناہگار اور بدنصیب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ دنیا نے تمہیں اگر نہیں پہچانا تو معذور تھی۔ اہل دنیا اگر تمہاری قدر وقیمت کا اندازہ نہ کر سکے تو کچھ ہرج نہیں جس سے تم کو اور ہر نیک وبد کو آخری اور دائمی سابقہ پڑنے والا ہے وہ تو بہر حال بے خبر نہیں۔ کل من علیھا فان ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال

والاکرام.

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشاخت دریغ

(ص:۵۴)

ہمنام نامور

مرحوم بدایوں کے مشہور و معزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے. ناز و نعمت میں پرورش پائے ہوئے، ابتدا سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک، دو مردوں کو کھلا کر کھانے والے تحریک خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیار زندگی بدل دیا. اور معاشرت بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کردی. جیل نہیں گئے، لیکن جیل پہونچنے کی کوشش میں کوئی کسر بھی نہیں اٹھا رکھی. اور ایک عمر کی عادتوں کو دفعۃً ترک کر کے درویشانہ زندگی اختیار کر لینے کا مجاہدہ بھی جیل جانے کے مجاہدہ سے کم نہ تھا.

ہر منٹ قومیات کے لیے وقف تھا. سکون و راحت کا کوئی زمانہ نہ تھا. مسلسل علالتوں اور پیہم خانگی صدمات کے باوجود، کام کے پیچھے دیوانے تھے. اور ایک جگہ بیٹھنا تو جانتے ہی نہ تھے. تیز بخار چڑھا ہوا اور حجاز کانفرس کے اہتمام میں مصروف، سینہ میں درد ہو رہا ہے اور امین آباد میں محفل میلاد ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹہ تک بیان کر رہے ہیں. شانے میں ورم، ہاتھ جھولے میں پڑا ہوا لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ مجلس تنظیم کی مجلسِ عاملہ میں شرکت نہ ہو؟ والدہ ماجدہ نزع میں اور مولانا کانپور میں تقریر کر رہے ہیں. بہو کی آخری سانسوں کی اطلاع آ رہی ہے. اور آپ ہیں کہ دہلی کی جامع مسجد میں خود رو رو کر دوسروں کو بھی رُلا رہے ہیں کل لکھنؤ میں تھے آج کلکتہ پہونچ گئے عید کا چاند لاہور میں دیکھا تھا نماز آ کر میرٹھ میں پڑھی. صبح پٹنہ میں تھے شام کو معلوم ہوا کہ دکن کے راستہ میں ہیں! عجیب و غریب مستعدی تھی. عجیب تر ہمت و مردانگی.

لکھتے اچھا تھے، متعدد رسائل و مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں. لیکن جیسا لکھتے تھے اس

سے کہیں بہتر، بدر جہا بہتر چند در چند بہتر بولتے تھے تقریر اور مؤثر تقریر ہر موضوع پر کر سکتے تھے اور سیاسی عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو لٹا دیتے تھے لیکن اصل ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی. حبیب رب العلمین کا ذکر پاک کرنے اٹھتے تو اپنے آپ میں نہ رہتے بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے. خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی اور خوش بیانی مست ہو کر منہ چومتی. ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور ایک ایک جملہ نظر آتا تھا کہ سوز و گداز کے عطر میں بسا نکلتا چلا آ رہا ہے! فصاحت و بلاغت کا ایک دریا اُبلا پڑتا ہے. کیا ربیع الاول میں جنت کی حوروں اور آسمانوں کے فرشتوں کو بھی اس کا شوق ہوا ہے کہ جس کے مرتبہ سے وہ خوب واقف ہیں اس کی نعت ایک خاکی کی زبان سے سنیں؟

ایک زبردست وخوش عقیدہ صوفی تھے. قادریت توحد غل تک پہونچی ہوئی. ہر بزرگ کے ادب شناس، اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش. بزرگان دیوبند سے صاف نہ تھے. لیکن حضرت شیخ الہند کے پوری طرح معتقد، بڑے ذہین، بڑے ذکی، شوخ طباع، بڑوں کی عظمت کرنے والے، چھوٹوں پر شفقت کرنے والے، متواضع وخوش اخلاق، فیاض ومہمان نواز. سو وصفوں کا وصف یہ تھا کہ جس سے ملتے کھل کر ملتے، دل سے ملتے، تکبر سے دور، تمکنت سے نفور، پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے اور اپنے اعزاز و وقار کی ذرا پروا نہ کرتے. جس کے دوست ہو گئے آخر تک ساتھ دیا، حق نباہ دیا. وضعدار ایسے کہ دوستوں اور دوستی کے اوپر سب کچھ قربان کر دیا لڑتے تو معاف کرنے پر تیار ہو جاتے، روٹھتے تو بخشنے میں دیر نہ کرتے. دوستوں سے خفا ذرا جلد ہو جاتے اور خوش جلد تر ہو جاتے. ہمدردی ہر مسلمان کے ساتھ کرتے. اور خدمت پر ہر چھوٹے بڑے کی کمر بستہ رہتے. لکھنؤ میں ایک مرید کے ہاں شادی کی تقریب تھی. خود دوڑ دوڑ کر مہمانوں تک کھانا پہونچاتے اور شیخ ہو کر مریدوں سے بڑھ کر کام کرتے تھے.

مرنے والے، اپنے مالک ومولا کے حضور جا اور اپنے ایک ادنی وگمنام ہمنام کا آخری سلام لیتا جا!

محقق گیلانی

جو کل تک ہر غمزدہ کے لیے مجسم تسکین وتشفی تھا، آج خود اس کے غم میں کون اور کس کس کو تسلی دے؟ جو کل تک ہمہ تازگی وزندگی، ہمہ جودت وذہانت تھا، کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاکی زیرزمین پہونچ چکا ہے؟

فاضل گرامی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی دورِ حاضر کے طبقۂ علماء کے خواص میں نہیں، اخص الخواص میں تھے، بلکہ کہنا چاہیے تھا کہ اپنی دقتِ نظر ونکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ ہی تھے. جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ دینیات وشیخ الحدیث سالہا سال رہے. اور نظر جیسی حدیث پر تھی ویسی ہی قرآن مجید، فقہ، اصول فقہ، کلام تصوف اور معقولات پر بھی تھی. عقائد اہل سنت میں پختگی دیوبندی تعلیم وتربیت کی کھلی ہوئی برکت تھی. پھر جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت استاد کے برسوں جو انگریزی خواں طلبہ اور اعلا ڈگریاں رکھنے والے استادوں سے یکجائی رہی اس نے علوم جدیدہ اور مسائل حاضرہ سے بھی انھیں پوری طرح باخبر کردیا تھا. اور خیالات میں وسعت اور رواداری اس کا قدرتی نتیجہ تھی. خوش عقیدگی اور روشن خیالی، رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر کہیں اور شاید ہی مل سکے.

ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں خود اس کے موجد تھے. تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی وبرجستگی تھی جب اور جس موضوع پر قلم اٹھایا بس لکھتے ہی چلے گئے. جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگاتے جاتے. خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی۔

مزاج میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی. اپنی بڑائی اور اپنے کمالات کا شاید انھیں وسوسہ بھی کبھی نہیں پیدا ہوا. اپنے سے چھوٹوں اور کہیں چھوٹوں کی بات کو اس التفات سے سنتے کہ وہ گویا ان کے ہمسر ہیں بلکہ بعض وقت تو اپنے چھوٹوں کو اتنا بڑھاتے کہ وہ بیچارے خود اپنے متعلق بڑی غلط

فہمیوں میں مبتلا ہوجاتے۔۔۔۔۔بے تکلف و بے ساختہ طرز انشاء اور بے تصنع و پر جوش رنگ تقریر دونوں اس سرشت وطینت کے پرتو تھے تحریر وتقریر دونوں میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا اُبلا پڑ رہا ہے۔

طبیعت کے لحاظ سے اتنے وارستہ تھے کہ کھانے کو جو کچھ مل گیا بس اسی کو نعمت سمجھے۔ پہننے کو جو کچھ ملا، خوش ہوکر پہن لیا۔ رہنے سہنے کا جو ادنی سا ادنی معیار بھی وقت کے ساتھ نصیب ہوگیا۔ اسی میں مگن زندگی گزار دی۔ ایک زمانہ میں موٹر بھی رکھا لیکن اُن کے لیے موٹر اور اِکہ اور جھنگا اور پیدل سب برابر ہی تھے۔۔۔۔بڑے رقیق القلب، بڑے رحم دل، بڑے نرم مزاج تھے، دوسرے سے اپنی بات منوانے کے فن سے واقف ہی نہ تھے۔ کسی ادنی شخص کی بھی ناخوشی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسے آزردہ دیکھ کر بلاوجہ اور خواہ مخواہ بھی اپنی غلطی تسلیم کرنے اور اسے منانے میں لگ جاتے۔

میرے ہم سن تھے۔ اور حضرت تھانویؒ اور مولانا محمد علیؒ کی وفات کے بعد اب ملت کے زندہ ہستیوں میں انھیں کی ذات میرے لیے محبوب ترین تھی۔ ہم سن کی وفات میرے لیے بھی قریب موت کی ایک اور گھنٹی بجادی ہے اور محبوب کے سفر آخرت نے میرے لیے بھی اس منزل مقصود میں ایک اور کشش و دلکشی پیدا کردی ہے!

صحت ادھر عرصہ سے بہت گر گئی تھی۔ پھر بھی اتنی جلدی وقت موعود آجانے کا ہم اہل غفلت کو خیال بھی نہ تھا۔ شوق لقاء رب پوری طرح رکھتے تھے جیسا کہ ایک درویش عارف کو رکھنا ہی چاہیے تھا اور جہاں تک دماغی قوت کے بس میں ہے خدا جانے کتنے اسرار غیب حل بھی کر چکے تھے۔ اصل حقائق کا انکشاف اب ہوا۔ اور اس وقت انشاء اللہ پوری طرح ابدی لذتوں اور سرمدی راحتوں کی آغوش میں ہوں گے۔ ابھی چند سال کی بات ہے کہ جب گیلانی مولانا سے ملنے جانا ہوا تھا اور ایک بار دفعۃً زور سا چکر سا آ گیا تھا، اضطراراً میں نے مولانا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور دل نے آناً فاناً خوشی اس کی محسوس کی تھی کہ اب نماز جنازہ مولانا ہی پڑھائیں گے۔ مشیت کو یہ منظور نہ ہوا اور اب لَو اس کی لگی ہوئی ہے جس وقت اپنا وقت موعود آئے گا تو اپنے مالک ومولا سے اپنے ایک قدیم تباہ کار رفیق

و نیازمند کی شفاعت میں اصرار ومبالغہ کرنے والوں میں ایک نمایاں وممتاز شخصیت مولانا کی بھی ہوگی۔رخصت اے امام المسلمین، عارضی طور پر رخصت، انشاء اللہ لنا ولکم العافیۃ وانشاء اللہ بکم لاحقون

(ص:۷۶)

مولانا صدر یار جنگ

زیارت سب سے پہلے ندوہ کے جلسۂ نظامیہ میں ہوئی سن غالباً ۱۹۱۱ء تھا۔۔۔ارکان کی دو پارٹیاں تھیں۔ایک کے لیڈر مولانا شبلی تھے اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواری اور مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری، ہم لوگ کالج کے لڑکے بھی تماشائیوں میں شریک کہ اگر کسی موقع پر پبلک کی مدد کی ضرورت پڑی تو پبلک کے نمائندہ بن کر مولانا شبلی کو کمک پہونچائی جائے گی۔فلاں صاحب آئے اور فلاں صاحب آئے۔اپنے لیے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسے میں بیٹھنے کو مل گیا۔ تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی!۔۔۔۔یہاں تک کہ مولانا شیروانی آ گئے۔حُسن مردانہ کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی۔متانت بلائیں لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست ''شبلوی'' ہیں، دیکھنے میں یہ آیا کہ اپنا دامن حریفانہ آلودگی سے بچائے ہوئے نہ گفتگو میں گرمی، نہ لہجہ میں درشتی، ایک پیکر حلم وآشتی، سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک لغوی کتاب (لغو تو اب کہہ رہا ہوں اس وقت تو وجہ نازش تھی) فلسفہ اجتماع کا مقدمہ الناظر میں نکلا۔اس میں دہلی کے ایک واقعہ سے مولانا شبلی پر تعریض تھی۔ اس کی تردید اور صفائی میں بطور شاہد عینی کے شیروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر میں موجود، لیکن تردید میں نہ تلخی اور نہ تعریض، بس صاف اور سادہ بیانِ واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ ہی پر نمایاں نہ تھا، قلم بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

۱۹۲۰ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک ہیجان کا دور ہوا ہے۔تحریک خلافت وترک موالات کا طوفان زوروں پر۔ملک کا سوادِ اعظم شیخ الہند اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور علی برادران اور مولانا ابوالکلام کے ساتھ۔ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے، ندوہ اور علی گڑھ دونوں پر، اور

ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکہ مورچہ علی گڑھ تھا۔شیروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے دوسرے کیمپ میں کچھ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سننا پڑا۔جوش اور ہیجان کے وقت کسی کو اپنی زبان پر قابو نہ رہا۔ آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے۔اور کل حبیب الرحمٰن سے حبیب الشیطان مشہور ہوئے!۔۔۔۔یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر ومتانت سے سنتا رہا۔۔۔۔ایک زمانہ وہ تھا ۱۳، ۱۴ سال قبل ابوالکلام کا شمار حلقہ میں مبتدیوں کے تھا اور مولانا شیروانی کے ہاں اُن کا تقرب خود اُن کے لیے باعثِ فخر ومباہات تھا۔اب دیکھتے دیکھتے وقت آ گیا تھا کہ مولانا ابوالکلام لیڈری کے بلند بام پر تھے۔اور شیروانی صاحب ایک اہل قلم اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہاں تھے وہیں قائم۔ظرافت اور شرافت کے امتحان کے لیے دوستی واتحاد کا نہیں مخالفت وبیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان اپنی تندمزاجی کے لیے بدنام ہیں اور شیروانی پٹھانوں ہی کے ایک خاندان کا نام ہے۔صدر یار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھوں نے پٹھانوں کو حلم ومتانت سے یکسر معرّی قرار دیا ہے، انھوں نے کلیہ قائم کرنے میں جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں حلم بھی کبھی شیروانیوں میں ہم

گفتگو بڑی پُر لطف ہوتی اور پُر مغز بھی، علمی، ادبی، شعری، مذہبی، سیاسی، تعلیمی جو موضوع بھی چاہیے چھیڑ دیجیے، اور گھنٹوں اس مجلس سے سیری نہ ہوگی، اللہ نے رئیس ہونے کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا۔کھاتے پیتے تو خوب تھے ہی کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے۔اور جاڑوں کے موسم میں شب دیگ کی دعوت بھی بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔اس دعوت میں جو ایک بار شریک ہو جاتا اس کو مدتوں تک نہ بھولتا۔تحریر میں ادیب سب سے بڑھ کر انشاء پرداز کی شان رکھتے تھے، سلجھا ہوا اندازِ بیاں، الفاظ ضرورت سے زیادہ نہ کم، بس ٹھیک اتنے ہی جتنے اثر اور ادائے مطلب کے لیے ضروری ہوتے گویا ہوشیار اور فن کار عمارت میں گڑھی ہوئی اینٹیں چُن چُن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق میں وہ ایک ستون مستحکم تھے! اور ملت کے سامنے ان کی تحریریں اُردو میں ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھیں. اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈنے سے بھی کہاں نظر آئے گی؟۔۔۔۔ کل من علیھافان سیکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر پڑھ کر دل تھام لیجیے۔

(ص:۸۱)

افضل العلماء عبدالحق کرنولی مرحوم

۱۸ر مارچ سہ پہر کو تازہ ڈاک دیکھ رہا تھا کہ نظر معاصر الجمیعۃ کی ایک نمایاں خبر پر پڑی کہ ڈاکٹر عبدالحق چیرمین مدراس سروس کمیشن کا دفعۃً انتقال حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوگیا!۔۔۔۔ زبان پر اضطراراً اناللہ، لیکن دماغ کے اندر شدید ہیجان وتلاطم برپا نہیں یہ نہیں ہوسکتا، وہ عبدالحق ہرگز نہیں. یہ ذکر ان کے کسی ہم نام کا ہوگا. خبر پھر پڑھی، اور پھر پڑھی، پُرنم آنکھوں کے سامنے الفاظ بھی دُھندلے ہوگئے. عبارت پوری طرح پڑھی بھی نہ ہوگی پھر اتنی تو چل ہی گئی کہ مفہوم سمجھنے میں کوئی شک واش تباہ نہ رہا۔۔۔۔ ایک دو سکنڈ بھی بہت ہوئے اسی مدت کے اندر دماغ اسی طرح تہ وبالا ہوگیا.

ابھی اسی جنوری کی ۲۶ر جنوری دس بجے مجھے کس طرح ہنسی خوشی کرنول اسٹیشن سے رخصت کیا تھا، کیسے خوش وخرام توانا وتندرست، ہشاش وبشاش اس وقت تھے، وہی چہرہ نظر کے سامنے برابر پھرے جارہا تھا. دعائیں بار بار اور دیر تک مرحوم کی مغفرت اور بلند درجوں کے لیے مانگیں. یہ بھی گویا اضطراراً ہی تھا ورنہ پختہ مومن ومرد صالح کے لیے دعائے مغفرت بس ایک تحصیل حاصل ہی تھا.

شدید مذہبیت اور دینداری کے باوجود تشقق چھو نہیں گیا تھا. خندہ روئی کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے سے ملتے اور بجائے فکرمندی یا جھلاہٹ کے ہر کام بڑے ہی سکون خاطر کے ساتھ نپٹاتے تھے. نفس مطمئنہ کی اصطلاح اسلاف صوفیہ نے جس معنی میں بھی استعمال کی ہو اس کی جھلک تو اس مرد مومن کی زندگی میں بھی دیکھنے میں آگئی.

عقیدت بزرگان دیوبند کے ساتھ انتہا کی تھی لیکن اس کے بھی حدود تھے اور توازن قائم

تھا سرسید کے مذہبی عقیدوں سے بچ کر ان کی تعلیمی کوششوں کے بڑے قائل اور مداح تھے۔ بلکہ جنوبی ہند کے حدود میں تو عملاً دوسرے سرسید خود بن گئے تھے۔ اسکول کالج خدا معلوم کتنے قائم کر دیے اور کرا دیے اور کتنی درسگاہوں کے روح رواں اور سرپرست تھے، انھیں میں زنانہ درس گاہیں بھی تھیں، لیکن بے حجابی کے قائل ذرا بھی نہ تھے، اپنی والی ہر کوشش ہر زنانہ اسکول اور کالج میں پردہ کی پابندی کے رکھی۔ خود اپنی صاحبزادی کو ایم، اے کرایا لیکن مذہبی تربیت کے پورے لوازم کے ساتھ۔ چنانچہ وہ ایک والہانہ ذوق وشوق کے ساتھ حج بھی کر آئی ہیں اور حجاب کا یہ اہتمام ہے کہ میں نے اسی گھر میں اپنے آٹھ دن کے قیام کے درمیان میں ایک بار بھی انھیں یا ان کی والدہ کو برقع کے ساتھ بھی باہر نہیں دیکھا۔ کسی کو سخت سست کہنا اور غیبت کرنا تو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ بعض اوصاف ایسے تھے کہ ان کی بنا پر ان پر گمان ولی اللہ ہونے کا گزرتا تھا۔ جس دن اپنی محبوب لڑکی کا عقد کیا اسی دن بستی کی ایک نہیں سات یتیم لڑکیوں کا بھی عقد کر دیا۔ اور اسی ساز وسامان کے ساتھ! اس کی اہمیت ومعنویت ذرا سوچنے کے بعد ہی منکشف ہوگی۔ ہم جیسے دنیا پرستوں کا حال تو اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم سے اگر ہماری لڑکی کی شادی کے دن کسی دوسرے لڑکی کے لیے امداد چاہی جائے تو الٹا غصہ آ جائے۔ اور ہم مانگنے والے پر برس پڑیں کہ یہاں لڑکی کے لیے انتظام کس مشکل سے ہو پایا ہے کہ یہ چلے ہیں سوال کرنے!۔۔۔۔ کیا ملکوتی ظرف تھا، جس نے فیاضی کو اس موقع پر، اور اس پیمانہ پر راہ دی!

بزرگی مقبولیت، عبدیت کسی مخصوص طبقہ کی جاگیر نہیں۔ لوگ اہل اللہ کی تلاش میں نکلتے ہیں تو اپنی نظریں صرف بندگی کی جگہوں، آستانوں، درس گاہوں، خانقاہوں تک محدود ومحصور رکھتے ہیں۔ کسی کو کیا خبر کہ زندگی کے ہر کوچہ اور ہر گوشہ میں کیسے کیسے صاحبِ دل موجود ہیں! اس تباہ کار کو اپنی زندگی میں اچھے اچھے بزرگوں کی صحبت رفاقت کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ لیکن عیب ہیں کو سابقہ کے بعد اکثر مایوسی ہی نصیب رہی۔ گنتی کے دو ہی چار ہستیاں ں ایسی ملیں۔ جہاں عیب جوئی کی نگاہ تھک کر ناکام رہی اور انھیں مستثنیات میں ایک ذات ان مرحوم کی تھی، انکساری، اخلاص، ایثار وشرافت کا ایک چلتا پھرتا پتلا تھا۔ جسے لذت ہی خدمت خلق میں آتی تھی، مجھ سے سن میں کل ۸، ۹

سال چھوٹے تھے اور علم میں اور دنیوی اعزاز میں جو مرتبہ تھا، وہ ظاہر ہی ہے، مگر برتاؤ یہ رکھا تھا کہ جیسے مجھ سے ۲۰، ۲۲ سال چھوٹے اور ہر طرح میرے ماتحت ہی ہوں۔ مدراس و کرنول دونوں جگہ ان کی مرجعیت و مقبولیت کا عالم دیکھ کر دل وہم آشنا نے یہ کہا کہ ایسا نہ ہو، یہ قبول خلق کا فتنہ انھیں لے ڈالے۔ چنانچہ آخری مصافحہ کے ساتھ جب گاڑی پر بیٹھنے لگا ہوں، اور انھوں نے اپنے انکسار و تواضع کے ساتھ دعا کی فرمائش کی، تو زبان پر الفاظ اس قسم کے آسکے تھے کہ ''اللہ آپ کے اخلاص کو قائم رکھے بلکہ روز افزوں اس میں ترقی دے'' اخلاص پیدا ہو جانا زیادہ دشوار نہیں، اصل مشکل اس کو قائم و برقرار رکھنے کی ہے۔

حکیم مطلق کی حکمتوں اور مصلحتوں کے سامنے کون دم مار سکتا ہے ورنہ ظاہری عقل تو ہم حقیر بندوں کی یہ سمجھنے سے بالکل عاجز ہے کہ ہمارے اپنے صوبے میں ایک بہترین دینی خدمت گزار کو نسبتاً کم عمری ہی میں مفلوج کر کے بے کار کر دیا گیا اسی طرح اس کل ہند مخلص ترین و سرگرم ملی خدمت گزار کو عین اس کی توانائی کے زمانہ میں بے شان و گمان دفعۃً اٹھا لیا گیا!۔۔۔۔ یہ بھی یقیناً رحمت ہی کا ایک کرشمہ ہوگا۔ کہ بس بندے، امتحان پورا ہو گیا۔ حیات مستعار کی امانت جو عطا ہوئی تھی اس کا حق تو نے ادا کر دیا۔ اب مزید تعب و مشقت اٹھانے کی اور اپنے وطن اصلی کی بے حد و حساب راحتوں سے دور رہنے کی ضرورت ایک لحہ ایک پل کے لیے بھی نہیں! اور فوراً آ، کہ انعامات اب خود تیرے لیے تڑپ رہے ہیں۔ **ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔**

(ص:۱۰۳)

محمد علی

اس پچھلے زمانے میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھا لیے گئے۔ ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا پڑا۔ انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا، ترکوں پر اتحادیوں کا نرغہ ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی۔ یہ سب کچھ ہوا اور ہوتا رہا، ایک محمد علی کا دم، ہر زخم کے لیے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے

وقت، دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی، تو اس خیال سے کہ جو کوئی بھی چلا جائے، محمد علی تو ہم میں موجود ہے۔ آہ، کہ شعبان ۱۳۴۹ھ کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا چھن گیا اور جس پاک و بے نیاز نے محمد کے لیے منادی کردی کہ ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل فإن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم اس کے فرشتوں نے اس کے بندوں تک محمد کا ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہونچادی۔

ذہانت، ناموری، شروع ہی سے حصہ میں آئی، علی گڑھ میں نام پیدا کیا، آکسفورڈ جاکر ناموری کہاں سے کہاں پہونچی، ''سول سروس'' کی جانب لپکے، الٹے پاؤں واپس کیے گیے۔ بروڑہ اور رامپور دونوں کی قدر شناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے جو غلاف کعبہ پکڑ کر مانگی گئی تھی ۔۔۔۔ ''میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم بنادے'' ساتھ نہ چھوڑا جو نہ صرف ''مسٹر'' تھا بلکہ مسٹروں کا سردار تھا۔ دیکھتے دیکھتے ''مولانا'' تھا۔ چہرہ پر داڑھی، سر پر پٹے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز اور دین کی تڑپ! ایک سوزش تھی، کہ ہر وقت پھونک رہی تھی۔ ایک جوتش تھی جو ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں دو لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پالی پوسی شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کی آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں۔ قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کامریڈ و ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر ایک متنفس، لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظر بندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں اور آخر عمر میں اس سے بڑھ کر آزمایش کہ عمر بھر کے دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ، مسلم لیگ سے جنگ، جمیعۃ العلماء سے جنگ، پنجابی ٹولی سے جنگ، بنگالی ٹولہ سے جنگ، اہل حدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ مدت سے تھی ہی۔ اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں تک سے جنگ! تصدق شیروانی، خواجہ مجید، ڈاکٹر محمود اور انتہا یہ ہے کہ

انصاری تک سے جنگ! غرض ایک خدا کے لیے ساری خدائی سے جنگ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا، لیکن جس کی نگاہ یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اسے کوئی کیا سمجھاتا اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر، اللہ کے لیے سب سے لڑا اور خوب لڑا۔

شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا۔ واقعات کی دنیا میں اس نے اسے سچ کر دکھایا۔ کہا کرتا تھا کہ اگر آج ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے کرائی گئی اور جب وہ امیدیں ان پاکوں سے پوری نہیں ہوئی ہیں تو ناپاکوں نے ان پر حملے بھی خوب کیے ہیں۔ آج کی کوئی نئی بات نہیں یہ سنت قدیم سے چلی آرہی ہے **قالوا یا صالح قد کنت فینا مرجوًا قبل ھٰذا اتنھٰنا ان نعبد ما یعبد اٰبؤنا وانا لفی شک مما تدعونا الیہ مریب**۔ اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعوئ محبت کیا، اس کا امتحان بھی ہو کر رہا کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروایا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا۔ کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی۔ کسی کے خاک اور خون میں تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا۔ کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی۔ کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کر دیا گیا اور کسی کو قید خانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا محمد علی کے لیے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا اور جس نے کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کا مزہ دیکھ

(ص:۱۱۳)

حسرت موہانی

اپنے وقت کے ایک بہترین شاعر تھے اور غزل گوئی کے تو کہنا چاہیے بادشاہ ہی تھے۔ شوخی کے ساتھ متانت کا اتنا دلآویز امتزاج کمتر ہی کسی کے حصے میں آیا ہے۔ اپنے رنگ میں فرد فرید تھے۔

کلام عاشقانہ تھا شوخی تھی بے حیائی نہ تھی، رندی تھی اوباشی نہ تھی. معاملہ پسندی تھی فحاشی نہ تھی. بے تکلفی تھی رکاکت نہ تھی. سنجیدگی تھی خشکی نہ تھی. ترکیبوں کی صناعت. بندشوں کی لطافت، اسلوب کی نزاکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ. جدت کی اجنبیت نہ تھی، ندرت تھی طرفگی تھی، گونگی نہ تھی. مومن و نسیم دہلوی کے رنگ کو پہلے اپنایا پھر پھیلایا چمکایا عشق جتلایا تو بنت عم کے ساتھ، شریف پردہ نشین خاتون کے ساتھ آشنائی کا دم رقیبوں کے غول در غول، بازاری بیسواؤں کے ساتھ کبھی نہ بھرا، کلام پڑھیے تو دل میں سوز گداز پیدا ہوگا، ولولے پیدا ہوں گے تمنائیں انگڑائیاں لیں گی، جذبات نفسانی میں ہیجان ایک بار بھی پیدا نہ ہوگا۔

محاورات پر عبور، زبان پر وہ حکمرانی بلکہ صاحبقرانی کہ باید و شاید، شعر جتنا اچھا کہتے تھے، اتنا ہی اچھا پرکھتے بھی تھے سخنگوئی اور شے ہے اور سخن فہمی اور یہاں جو پایہ سخنوری میں تھا وہی سخن سنجی میں۔

سیاسی، ادبی اور سارے پبلک پہلوؤں سے بڑھ چڑھ کر دلکش، پُر تاثیر قابل عظمت ستودہ صفات، خود حسرت کی شخصیت اور ذات تھی. سادگی، بے تکلفی، تواضع، انکسار کی ایک تصویر تھے اپنی بڑائی کا احساس تک نہ تھا. ان کی کمینوزم بھی درویشی کے مرادف تھی، گھر میں غلہ وغیرہ کا ذخیرہ سال بھر کے لیے کیا معنی مہینہ بھر یا چند روز کے لیے بھی جمع کرنا ناجائز سمجھتے تھے. روز کا روز سودا اپنے ہاتھ سے لاتے تھے. جب دیکھیے دامن میں لیے بازار سے چلے آرہے ہیں. نہ کسی سے تکلف نہ کوئی شرم اور جھجک. راستے میں بڑے بڑے موٹر نشین مل گئے بے دھڑک ان سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں. میلی شیروانی، میلی ٹوپی، بوسیدہ عینک کے ساتھ راجہ سلیم پور کے ہاں چلے گئے. فلاں راجہ، فلاں نواب، فلاں گورنر کے ہاں چلے گئے اور جو کچھ کہنا تھا، لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ سُن آئے. کوئی مہمان آ گیا تو کچھ پروا نہیں، رات کی باسی کھچڑی چھینکے پر ٹنگی ہوئی وہی لے کر خود بھی کھائی اس کو بھی کھلا دی بڑا تکلف کا اہتمام کیا تو جا کر دو پیسہ کا دہی لے آئے. ہر حال میں مست ۔۔۔۔ اور مگن اتنے لیڈروں میں انھیں کو دیکھا، بے صبری اور ناشکری کا لفظ جیسے ان کے کان میں کبھی پڑا ہی نہ تھا. جو کچھ بھی مل گیا ہنسی خوشی کھالیا اور کچھ نہ ملا تو فاقہ بھی اسی خوش دلی اور بشاشت کے ساتھ کاٹ دیا. نفسِ مطمئنہ کتابوں

میں پڑھا تھا کہ بعض بزرگوں کو حاصل ہو جاتا ہے، آنکھوں سے مثال اسی درویش کی زندگی میں دیکھی۔

(ص:۱۲۹)

آہ۔ ابوالکلام!

آج وہ اٹھ گیا

۱۔ جو اردو ادب وانشاء میں ایک ممتاز ترین مقام رکھتا تھا جس کا اس میدان میں کوئی سہیم وشریک نہ تھا اور وہ جس نے اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔

۲۔ جو اردو زبان کا ایک بہترین مقرر وخطیب تھا۔

۳۔ جو مدتوں دین اور قرآن کی خدمت بھی اپنی بصیرت اور ادراک کے مطابق کرتا رہا۔

۴۔ جو ملکی سیاسیات کی صف میں اول ۳۰، ۳۵ سال سے رہا کیا۔

۵۔ جس نے اردو صحافت میں ایک بالکل نیا اور شاندار باب کھولدیا۔

۶۔ جو عظیم الشان تحریک خلافت کے اکابر کی کہنا چاہیے اب آخری یادگار رہ گیا تھا۔

۷۔ جو اب ایک پیکر شرافت بن گیا تھا اور ۴۷ء کے بعد سے خدا معلوم کتنے بے سہاروں کا سہارا بنا رہا۔

اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ

(ص:۱۳۲)

رفیع احمد قدوائی

علی گڑھ میں تعلیم پائی، تربیت خصوصاً سیاسی تربیت موتی لال نہرو کے سایۂ عاطفت اور جواہر لال نہرو کی رفاقت میں ملی، نظم وتنظیم کی بے مثل صلاحیت فطری تھی علی گڑھ میں اس کی نشو ونما ہوئی۔ درو دیوار ملت علی گڑھ سے لیا۔ سیاسی سوجھ بوجھ کے لیے آنند بھون کے درو دیوار کافی تھے۔

کہتے کم تھے کرتے زیادہ تھے کتابوں کا مطالعہ برائے نام سا تھا مصداق فی الحقیقت ''خودی تو ئی ام الکتاب'' کے تھے۔ اپنی فطری ذہانت، ہوشمندی، فہم سلیم کی مدد سے باتیں اپنے دماغ

سے نکالتے تھے تقلید جامد کے قائل نہ تھے تقریر کے شوقین اور تقریر باز نہ تھے ضرورت کے وقت تقریر کرتے وہ بھی مختصر اور حشو وزوائد اور خطابیات سے پاک سرتاپا عمل تھے اور ہر وقت عملی سرگرمی میں منہمک، اس کے باوجود خشک یا عبوس ذرا سا بھی نہ تھے۔ ہر وقت خوش رہتے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ بہت سویرے اٹھتے۔ اور اسی وقت سے ان کا کام کاج شروع ہو جاتا۔ دنوں کے کام گھنٹوں اور گھنٹوں کے کام منٹوں میں چکا دیتے۔ کھڑے ہو کر اور ٹہلتے ہوئے یا لیٹے ہوئے بہر حال وضع میں کام ہی کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ غالباً جانتے ہی نہ تھے کہ کوئی چیز بے شغلی بھی ہوتی ہے ہندو سیاسی کارکنوں، مدبروں، اہل سیاست کے مقابلہ میں ان کے درمیان میں گھرے رہ کر اپنے حسن عمل، قابلیت، حسن انتظام، کارگزاری، تدبر وتدین سے مسلمانوں کا بول بالا کر دیا تنہا یہی ایک خدمت، قدوائی مرحوم کو امتیاز اور بڑے امتیاز کے مقام پر کھڑا کر دینے کو کافی ہے۔

دشمنوں سے اس طرح ملتے کہ جیسے دوستوں سے ملا جاتا ہے۔ دوستوں سے یوں برتاؤ کرتے کہ کہ جیسے عزیزوں قریبوں سے کیا جاتا ہے۔ اور عزیزوں اور قریبوں کو اپنے نفس کی طرح عزیز رکھتے۔ بلکہ شاید اس سے بھی مقدم اور یہ دوست ودشمن اپنے اور غیر کی تفریق بھی کیسی، کوئی ان سے کام نکالنا چاہے یا کسی کو ان سے کوئی ضرورت آپڑے تو انھیں یاد نہیں رہتا تھا کہ کون اپنا ہے اور بے گانہ کون! مقصود انھیں صرف کام کر دینا ہوتا تھا۔ اور اس وقت ہر ایک ان کا ''اپنا'' ہوتا تھا۔ بے گانہ کوئی بھی نہ رہتا۔۔۔۔ خلق اللہ کی خدمت وہ عبادت کی طرح کرتے تھے اور خدمت کرنے میں انھیں وہی مزہ آتا تھا جو دوسروں کو خدمت لینے میں آتا ہے!

زندگی تمام تر سادہ ہی رہی۔ وہی موٹے کپڑے کی معمولی شیروانی اور پائجامہ، سوٹ ہیٹ کو چھوا ہی نہیں۔ کپڑے کسی اور اونچے ٹیلر ماسٹر کی دوکان سے نہیں گھر سے سل کر آئے۔ سرکاری کوٹھی اور فرنیچر جیسا شاندار ہو۔ ان کے گھر کو جا کر دیکھیے تو حیرت ہو جائے ٹوٹا پھوٹا سا پرانی وضع کا مکان جو اتنے بڑے منسٹر کیا معنی ان کے کسی ماتحت اچھے عہدہ دار کے بھی شایان شان نہیں۔ دفن کے موقع پر ہزاروں اجنبی باہر سے مسولی پہونچے۔ انھیں کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ کسی بڑے منسٹر کا مکان اتنا معمولی بھی ہو سکتا ہے!۔۔۔۔ وضعداری کی ایک یادگار مثال یہ بھی ہے کہ عید بقرعید کی نماز پابندی

سے اپنے وطن مسولی ہی میں آ کر پڑھتے تھے۔

جس سے جس طرح ایک بار ملے بس عمر بھر اسی طرح ملے گئے نخوت اور خود بینی کا مفہوم ہی ان کے دماغ سے غائب تھا خلوت میں جلوت میں اندر باہر کہیں بھی ملتے یہ کہیں سے معلوم ہی نہ ہونے پاتا کہ ملاقات کسی وزیر مملکت سے ہوری ہے۔ یو پی میں زمینداری ٹوٹی بلکہ انھیں کی تحریک پر ٹوٹی۔ یہ بھی ایک چھوٹے سے زمیندار تھے اپنی زمینداری کو بچالے جانا ان کے لیے کیا مشکل تھا مطلق کوئی تدبیر نہ کی۔ اپنے عہدہ سے اپنی ذات کے لیے کسی ادنی فائدہ اٹھانے کا سبق انہوں نے پڑھا ہی نہ تھا سوتیلی والدہ زندہ ہیں۔ خاندان کے ایک صاحب سے روایت سننے میں آئی کہ ایک روز انھوں نے فرمایا "رفیع زمینداری تو خوب ختم کردی، اب گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ خاندان بھوکا مرے گا سب کا انتظام کیا اپنے گھر کے لیے کچھ نہ کیا"۔ رفیع مرحوم ہنس کر بولے (اور یہ ہنس کر بولنا ان کی عادت تھی) کہ اماں جان! آپ گھبراتی کیوں ہیں۔ زمینداری ختم ہوجانے سے کیا ہوتا ہے۔ میں گھر پالے کر گھاس چھیلوں گا آپ بوجھ بنا کر بیچے گا سب سے کی روٹی چلے گی"۔۔۔۔ یہ جواب دنیادار انسانوں کے بس کا نہ تھا اس کے لیے اعتماد اولیاء اللہ کا سا ہونا چاہیے۔

بڑے اور صاحب اقتدار شخص کے دشمن سیکڑوں ہزاروں ہوتے ہیں۔ رفیع مرحوم نے اپنی سلامت روی اور شرافت نفسی کے طفیل اپنا دشمن شاید ہی کوئی چھوڑا ہو۔ سیکڑوں یتیم آج انھیں رو رہے ہیں۔ صدہا بیوائیں ان کا سوگ منا رہی ہیں اور ہزار ہا انسانوں کو آج دل سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا دنیوی سہارا پاش پاش ہوگیا اور وہ ایک جنگل میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں! اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور بلند سے بلند مرتبے عطا فرمائے۔

(ص:۱۴۰)

قائد ملت

موت کا سوچ اکثر آتا ہی رہتا ہے ابھی کل ہی کی بات ہے کہ سوچتے سوچتے خیال یہ آیا کہ موت اگر آج ہی کل میں آ گئی تو نماز جنازہ کس سے پڑھوانے کا دل چاہتا ہے؟ نام کئی ایک ذہن

میں آئے لیکن سب سے پہلا نام ذہن میں آیا وہ اسی مجاہدِ اسلام بہادر خان حیدرآبادی کا تھا۔کاش بہادر یار جنگ دورہ کرتے پھرتے عین اس وقت اتفاق سے آموجود ہوتے !ایسا کیوں ہونے لگا لیکن دل کی کشش سے ایسا ہوجانا کچھ ناممکن بھی نہیں!۔۔۔۔یہ تھی اس نامۂ سیاہ کے دل میں اس شیر دل مجاہد کی محبت،عظمت اور عقیدت!

اے بسا آرزو کے خاک شدہ

آہ کہ جس سے یہ امیدیں قائم کی جارہی تھیں، کسے وہم گزر سکتا تھا کہ وہ یوں دھوکا دے جائے گا اور جس کی دعاؤں کے لیے یہ طلب وتمنا تھی وہ خود آناً فاناً دوسروں کی دعاؤں کا مستحق ہوجائے گا!۔۔۔آہ مشت خاک انسان اور اس کے تار عنکبوت جیسے بودے، پھسپھسے کمزور ارادے، حوصلے، سہارے!

۴۰ سال کی عمر بھی کوئی عمر تھی !اور پھر کیسے تندرست وتوانا ،ہنس مکھ اور خوش مزاج،خوش سیرت،خوش صورت،بلا کے ذہین ونکتہ رس،کسی بشر کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر سکتا تھا کہ یہ کھلا ہوا پھول،چمن بھر کو مہکاتا ہوا بات کی بات میں نذر خزاں ہوجائے گا؟محفل بھر کو منور رکھنے والی شمع اسی لمحہ، اسی آن بجھ جانے کو ہے!۔۔۔کہتے ہیں کہ موت بالکل اچانک ہوئی نہ سکرات،نہ تکلیفیں نہ نزع. روح کی سختیاں اور کیوں ہوتیں.جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کی ڈسپلن (اطاعت) کا خوگر بنالیا تھا،اس کی روح پکارنے پر معاً لبیک آخر کیوں نہ کہتی؟ تاخیر وتأمل کی وجہ ایک منٹ کے لیے بھی آخر اسے کیا ہوسکتی تھی؟

قائد ملت جس کسی نے اسے کہا!اس نے کوئی شاعری نہیں کی.ادبی صنعت گری لفظی شعبدہ بازی سے کام نہیں لیا.ایک حقیقت بیان کردی.تاریخ کی طرح خشک سائنس کی طرح بے لوث، ریاضی کے اعداد کی طرح اٹل کھری،قائد ملت کاش بجائے دکن کے انگریزی ہند کو نصیب ہوا ہوتا تو محمد علی کی جانشینی کا سوال لاینحل نہ رہا ہوتا.ہندوستان نے دوسرا محمد علی اگر کوئی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا وہی اخلاص،وہی جوش،وہی تڑپ،وہی سوجھ بوجھ،وہی نبض شناسی وہی ہمت وعزم،غرض بجز محمد

علی کی انگریزی انشاء پردازی کے اور سب کچھ وہی.

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج !

خوش نصیب قبر، خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لیے اللہ کے دین کا دلیر باہمت سپاہی آرہا ہے، وہ غریبوں کا سہارا تھا، بے کسوں کا والی تھا، ملت کا پشت پناہ، وہ ایک امیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا.

حکیم مطلق اور احکم الحاکمین بے نیاز کی مشیت میں دم مارنے کی مجال کس کو؟ کیسے کیسے باغی و طاغی، غدار و سرکش، اسی پچاسی کی عمروں کے پورے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور یہ مطیع و فرمانبردار بندہ، دین کا سپاہی، اور امت کا علمبردار، چالیس ہی کی عمر میں واپس بلا لیا جاتا ہے. سچ کہا اس عارف نے جس نے یہ کہا ۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چوں و چرا در قضائے ما

روایتوں میں آیا ہے کہ خلیفۂ برحق عمر فاروقؓ نے جب عین میدان قتال میں خالد سیف اللہ کو معزول کر دیا تو ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ ''لوگوں کا تکیہ حق تعالی سے زیادہ خالد پر ہو چلا تھا، اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ فتوحات جو حاصل ہو رہی ہیں یہ خالد کی شجاعت و تدبیر کا نتیجہ ہیں، میں اس خیال کو مٹا دینا چاہتا ہوں'' ۔۔۔۔ عجب کیا، جو ایک مصلحت کچھ اس طرح کی، اس جوانمرگ قائد ملت کی موت میں بھی ہو، ملت بہت زیادہ تکیہ اس بندۂ حق پر کر چلی تھی اور مشیت تکوینی کو سبق یہ دینا منظور ہوا کہ جو خدائے قادر و توانا ایک بندہ کے توسط سے نصرت و کامرانی پر قادر ہے، وہی اسی واسطے کے بغیر بھی اسی طرح قادر و متصرف ہے.

(ص:۱۵۴)

مرزا ثاقبؔ

بات یہ ۱۹۱۴ء کی ہے لکھنؤ کے خوش ذوق رئیس چودھری خلیق الزماں صاحب تعلقدار گڑھی بھلول نے رقعہ لکھ کر مجھ سے دریافت کیا کہ ایک ادبی حلقہ میں ذیل کے دو اہم مضمون شعروں سے متعلق بڑی بحث چھڑی ہوئی ہے محاکمہ آپ کیجیے دونوں شعر یہ ہیں:-

(۱) شب جو زنداں میں ہوئی تازہ گرفتاروں کو
سر یہ ٹکرایا کہ در کر دیا دیواروں کو

(۲) شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیواروں سے

شعر بادی النظر میں اور پہلی دفعہ پڑھنے میں پہلا ہی اچھا معلوم ہوا لیکن ذرا سوچنے کے بعد ترجیحی رائے دوسرے شعر کے حق میں قائم ہوئی اور یہی میں نے چودھری صاحب کو جواب میں لکھ بھیجا.

پہلے شعر میں لفظوں ہی کا زور ہے. ورنہ اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے قید خانے کی دیواریں محض ٹوٹ پھوٹ کر محض در کی طرح کھلی رہ جائیں. حد فطرت سے بڑھا ہوا ہے. اور پھر جب زنداں کی دیواریں باقی نہ رہیں تو خود زنداں کا وجود کب باقی رہ گیا. قیدی آزاد ہو کر نکل ہی بھاگیں گے! دوسرا شعر بے عیب ہے بلکہ "کچھ کچھ" نے انتہائی حسرت و بے کسی کی تصویر کھینچ دی ہے. تاریکی اس بلا کی ہے کہ قیدی کو یہ خفیف سی روشنی بھی بہت غنیمت معلوم ہو رہی ہے. پھر اتنا مبالغہ کہ سر ٹکرانے سے دیوار میں ہلکا سا رخنہ پیدا ہو جائے حد و فطرت سے اس درجہ بعید بھی نہیں۔

غرض اپنی رائے لکھ کر بھیج دی اور یہ خبر ہی نہ تھی کہ پہلا شعر کس کا ہے اور دوسرا کس کا. چودھری صاحب تو خیر خوش ہوئے ہی. دو ہی ایک روز بعد دیکھتا کیا ہوں کہ جناب مرزا ثاقب غریب خانہ پر تشریف لا رہے ہیں. آئیں! یہ مرزا صاحب کہاں! ان کی نازک مزاجی (نازک خیالی ہی کی طرح) مشہور ہے یہ تو بڑے بڑوں کے ہاں نہیں جاتے. مجھ غریب طالب علم کے ہاں (کالج

اسی زمانہ میں چھوڑا تھا) کہاں قدم رنجہ فرمانے لگے! میں تو دور سے راستہ گلی میں بس اِن کی صورت دیکھ لیتا تھا۔ کبھی بڑھ کر ملنے کی بھی ہمت نہیں پڑی تھی۔ چہ جائیکہ انھیں اپنے گھر پر دیکھتا

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

خیر بیٹھے تو فرمایا کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں چودھری صاحب نے آپ کا خط مجھے دکھایا۔ آپ نے نقادی اور انصاف کا حق ادا کیا ورنہ وہ شعر تو میر..... صاحب مرحوم کا ہے۔ ان کے سامنے بھلا کون پوچھتا!

بس اس روز سے ثاقبؔ صاحب مہربان ہوگئے۔ اسی صحبت میں خوش ہوکر اپنا کلام بھی زبانی سنایا غزل کا مطلع ہے اور دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں کے اندر حسن وعشق کی پوری داستان رنگین سمیٹ لی ہے ۔

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

اور پھر جو ایک شعر پڑھا۔ ظالم نے تڑپا ہی دیا۔

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستان کہتے کہتے

شعر بلا ترنم کے تحت اللفظ پڑھتے، لیکن ہاتھ اور چہرے کے اشاروں سے مضمون کی تصویر بھی کھینچتے جاتے۔ دوسرا مصرعہ جب پڑھا ہے تو آنکھیں ذرا بند کرکے سر کو ایک طرف اس طرح جھکایا اور ہاتھ کو اس کے نیچے اس طرح لائے کہ جیسے سچ مچ تکیہ پر سر رکھ کر سو ہی گئے ہیں! اس ہیچ مداں نے شعر کی تکرار اس کثرت سے دوستوں کے سامنے کی اور اپنی تحریروں میں اتنی بار لایا کہ اب وہ شعر بے تکلف سب کی زبانوں پر چڑھ گیا ہے۔ ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت اس میں موجود ہی تھی۔

اس نیاز مند سے حُسن ظن آخر تک قائم رکھا۔ کئی سال کا ذکر ہے کہ پہلے خط لکھ کر اور پھر لکھنؤ میں خود مل کر زبانی فرمایش کی کہ ''دیوان مرتب ہوگیا ہے اس پر مقدمہ تم ہی لکھ سکتے ہو، لکھدو''۔ اب

اتنی فرصت کہاں نصیب تھی بہت دب دب کر، اور لچ لچ کر معذرت کرنی پڑی!
افسوس کہ یہ شمع سخن ۲۳ نومبر ۱۹۴۶ء گل ہو کر مجلسِ ادب سونی کر گئی۔
(ص:۱۷۸)

چودھری محمد علی مرحوم

زندہ دلی، شگفتگی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، اگر مجسم ہو سکتیں تو عجب نہیں کہ قالب انھیں مرحوم کا اختیار کرتیں اور جو کہیں یہ چودھری صاحب یونانیوں کے دور شباب میں پیدا پڑے ہوتے تو ہو نہ ہو یہ دیوتا، ظرافت تفنن وانبساط کے، مان لیے جاتے اور بے تکلف ان کی پوجا چل پڑتی!۔۔۔۔ رودلوی بس نام کے تھے۔ ورنہ بول چال، چال ڈھال، ٹھاٹھ باٹ کے آئینہ میں لکھنوی! وہی آن، وہی شان، وہی لوچ وہی چھل بل لکھنے ہی میں نہیں بولنے میں بھی اور علم مجلس کے تو جیسے بادشاہ تھے۔

بوڑھوں میں بیٹھتے تو سنجیدہ وحکیم، جوانوں میں آنکلے تو سرمست وظریف، بچوں میں گھر گئے تو کھلنڈرے! ادیب ہوں کہ طبیب، شاعر ہوں کہ اہل حرفہ، مولوی ہوں کہ مشائخ کسی کی بھی مجلس میں گزر ہو جائے میر مجلسی ان کے لیے رکھی تھی!

ناول اور افسانے کئی ایک لکھے۔ جنسیات کے ماہر تھے۔ (شہوانیات کے نہیں) قلم کی شرافت کا کمال یہ ہے کہ ہر "ناگفتہ بہ" کو پیش کرتے وقت "گفتہ بہ" بنا دیتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی کتاب (کتاب کیوں کہیے کہیے) پردے کی بات ہے اس میں شریف بہو بیٹیوں سے وہ باتیں کہہ گئے ہیں کہ جو کوئی رازدار سہیلی ہی کہہ سکتی ہے اور وہ بھی کان میں۔

ہنسی کی عمر ختم ہوئی اور فالج میں مبتلا ہونے کے بعد ہنسوڑ نے اب مستقل رونا شروع کیا اور گریہ وزاری خوف آخرت سے! فرنگی محلی، ندوی، کسی قسم کی بھی مذہبی شخصیت کو جب پاجاتے رو رو کر اس سے دعائے مغفرت کا وعدہ لیتے اور اس کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھتے اور یہ مبارک کیفیت ایک دو دن نہیں، مدتوں رہی۔

(ص:۱۹۹)

طبیب کی موت

صبح تھی ۲۵ر دسمبر کی، اور وقت کوئی ۹ بجے کا، کہ خلقت کا ایک ہجوم موٹروں سے اور گاڑیوں سے اور ٹانگوں سے اور سائیکلوں سے اُتر کر پیدل رواں نظر آیا لکھنؤ کے ایک مشہور محلّہ کی تنگ گلی میں محلّہ جھوائی ٹولہ، شہر اور صوبہ کا مشہور دارالشفاء دہلی کے بعد طب یونانی کا دوسرا دارالحکومت! مریضوں اور زندگی کے مایوسوں کا قبلۂ امید. آج سے نہیں پُشتہا پُشت سے. اس وقت سے کہ جب کسی کے کان میں نام بھی نہیں پڑا تھا، کسی کے ذہن میں تصور بھی نہیں آتا تھا. وکٹوریہ ہاسپٹل کا، کنگ جارج میڈیکل کالج کا!۔۔۔۔ مریضوں کے پھیرے گلی میں روز ہی لگتے رہتے تھے، اور یہی وقت بھی ہوتا تھا. آج کے مجمع کا رنگ سب دنوں سے الگ تھا. آج قدم اٹھ رہے تھے افسردگی سے اور دل پگھل رہے تھے عبرت کی گرمیوں سے. آج نبض دکھانی نہ تھی نسخہ لکھانا نہ تھا. خود حکیم کا جنازہ پڑھنا تھا. قبر میں اُتارنا تھا اور وہ جو دوسروں کے جسم کا محافظ سمجھا تا تھا خود اس کے جسم کو ایک گہرے گڑھے میں دفن کرنا، تُربت پر فاتحہ پڑھنا تھا!۔۔۔۔ طبیب موت کے منہ میں، چارہ گر قضا کے شکنجہ میں! تقدیر سے تدبیر کی شکست کی بے شمار مثالوں میں، لاتعداد نظیروں میں ایک اور اضافہ!

طبیب ابن طبیب، حاذقوں کی اولاد، حاذق کے بیٹے، حاذق کے پوتے شفاء الملک حکیم عبدالحمید محتاج نہ تعریف کے نہ تعارف کے، مشہور طبی درسگاہ تکمیل الطب کے روح رواں، اچھی خاصی صحت، سرخ وسفید چہرہ، تندرست بشرہ، ابھی اس مایوس کو دوا پلا رہے ہیں، ابھی اُس لب مرگ کو خدا کے حکم سے جلا رہے ہیں، کہ یک بیک خود بیمار پڑے، ذیابطیس اور پھر دق، پہاڑ گئے اور آئے، علاج یہ ہوا اور وہ، اور انجام آخر وہی ہوا جو اس کشمکش کا ہمیشہ کے لیے مشہور تھا، پلک جھپکتے ہی خود اس کی زندگی افسانہ بن کر رہ گئی! طب کی کتابیں اَزبر کر لینے سے کیا انسان آئی ہوئی گھڑی کے آگے پیچھے کر دینے پر کچھ بھی قدرت حاصل کر لیتا ہے؟ دواؤں کو پہچان لینے، بیماریوں کا نام جان لینے، مرض کی اصطلاحیں یاد کر لینے سے کیا مرگ وفنا کے قانون کی گرفت ایک ذرہ بھی ہلکی ہو جاتی

ہے؟ کاٹھ کی پتلیوں کو کپڑے جس کے چاہے پہنا دیجیے، نام بادشاہ، وزیر، کوتوال، فراش، بھشتی، دربان جو چاہے رکھ دیجیے، قوت ساری کی ساری کٹھ پتلی والے تار اور اس کی میت کے ہاتھ میں ہے، یا زرق برق لباس والی مختلف شاندار ناموں والی کٹھ پتلیاں بھی اس میں کسی درجہ میں شریک ہیں. اختیار اور قوت سے متعلق پردے کیسے کیسے پڑے ہوئے ہیں! بچے کس معصومیت کے ساتھ بادشاہ اور وزیر اور کیا کیا اُن پتلیوں ہی کو یقین کیے ہوئے ہیں۔

(ص:۲۱۲)

''جشن نوشابہ''

لکھنؤ ۲۹ر مارچ جمعہ، ۷ بجے صبح، مرشد آباد پیلس دفتر کی بارہ دری میں اس وقت یہ چہل پہل کیسی ہے؟ چہل پہل ماتمی رنگ کی، جسے دیکھیے روئے دیتا ہے، رو ہی رہا، ہنسنا مسکرانا جیسے سب بھول ہی گئے ہیں، گھر اندر باہر بھرا پڑا ہے، اپنے بھی بیگانے بھی، بوڑھے بھی بچے بھی، عوام بھی، خواص بھی، ہر آنکھ میں آنسو، ہر لب پر آہ وفغاں!۔۔۔۔ سامنے دیکھیے نہ، دیوان خانہ میں اُجلی شفاف چادروں میں لپٹی ہوئی، تازی نہائی دھوئی ہوئی کافور اور عطر کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی گھر بھر کی مَینا، بیٹی نوشابہ پلنگڑی پر لیٹی ہوئی ہے!۔۔۔۔ اچھا تو یہ ''جشن نوشابہ'' ہے وہ پرانا جشن مسرت نہیں، مجلس ماتم، نوحۂ غم اور نغمۂ مسرت کے درمیان فرق ہی کیا ہے؟

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

سنا تھا کہ ماں باپ کو اپنی اس گڑیا کی شادی رچانے کا بڑا ارمان ہے، ارمان کسے نہیں ہوتا، یہاں تو اولاد کے داغ پر داغ اٹھانے کے بعد سات آٹھ اولادوں کو خاک میں سُلانے کے بعد یہی ایک زندہ سلامت بچی تھی. سات لڑکوں سے بڑھ کر یہ لڑکی عزیز. ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، گھر بھر کی امیدوں کا مرکز لڑکا بھی گھر ہی میں ہے کہیں لینے جانا نہیں. بھائی کی اولاد بھی اپنی ہی اولاد ہوتی ہے. تو کہیں لڑکی کی رخصتی ہی تو نہیں ہو رہی ہے؟ بارہ برس کا سن شادی کا سن تو نہیں ہوتا لیکن عجب کیا

جوار مان کے مارے ہوئے ماں باپ نے اسی سن میں شادی اور رخصتی کی ٹھان لی ہو!۔۔۔۔ بیشک نوشابہ آج رخصت ہورہی ہے، پھاٹک پر سیاہ رنگ کی لاری بھی لگی ہوئی ہے، رخصت وہاں کے لیے ہورہی ہے، جہاں جاکر پھر کوئی واپس نہیں آتا معصوم نے کل ہی اپنی بہنوں سہیلیوں سے کہا بھی تو تھا کہ ''اب ہم اپنے گھر جارہے ہیں۔ ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔ وہ دیکھو سفید موٹر کھڑے ہوئے ہیں'' ۔۔۔۔ بچوں کا انکشاف بہت قوی ہوتا ہے عجب کیا جو برزخ کا انکشاف قبل سے ہوگیا ۔۔۔۔ تو کیا، وہ ہنستی کھیلتی بھولی بھالی، نیک سیرت وقبول صورت محلہ کے غریبوں کو پیسے بانٹنے والی، پڑوسنیوں کے دل میں جگہ رکھنے والی لڑکی دنیا سے رخصت ہوگئی؟۔۔۔۔ کل دوپہر کو اسی طرح کا فقرہ حسرت نصیب باپ کی زبان سے سنا بھی تو تھا کسی آنے والے عزیز کو خبر دے رہے تھے۔ پلی پلائی ۱۲ برس کی اکلوتی کے لیے موت کا لفظ ان کی زبان سے نکلا کیوں کر! تلفظ ادا کرنے پر قدرت ہی زبان کو کیسے رہی؟ اور پردہ نشین غمزدہ ماں! لوگ کہتے ہیں کہ وہ روئی بھی نہیں ہے محض سکتہ کا عالم طاری ہے۔ بیشک آنسو سلب ہوگئے ہوں گے لیکن کلیجہ کی کھرچن کو کیا کررہی ہوں گی؟ ہر لحہ جو زبردست ہوک سینہ میں اٹھتی ہوگی اس کا کیا علاج ہے؟ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی کی بنی ہوئی عاجز وناتواں مخلوق ہے، آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو لٹتے ہوئے اجڑتے ہوئے خود زندہ کیسے رہیں؟ ہوش وحواس پر قابو رکھنے کی قوت وتوانائی کس نے دیدی؟ کڑے کڑے امتحان مالک ومولی کے دربار میں پیغمبروں اور خاص خاص برگزیدہ بندوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کیا ان عاجز وناتواں بندوں کو بھی اُسی مرتبہ پر پہونچانا منظور ہے؟

در ودیوار بھی مرشد آباد ہاؤس کے اگر اس وقت رورہے ہیں تو حیرت نہ کیجیے، اس سے بڑھ کر پُراثر دردانگیز منظر اس نے دیکھا کب ہوگا؟

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوئے مدفن ابھی نہ لیجائیں

''سوئے مدفن'' کہاں کسے لیے جارہے ہیں! لڑکی کے دن یہ کھیلنے کھانے کے

تھے، دوڑنے پھرنے کے تھے۔ گڑیا گڈے کے بیاہ رچانے کے تھے یا ''سوئے مدفن'' لیجانے کے تھے؟ لیکن شور وشیون کے ہنگامے میں ذرا کان لگا کر سنیے، تو غسل دینے والیوں کا بیان ہے کہ غسل والی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ عجب نہیں جو ہنس ہنس کر کچھ کہہ بھی رہی ہو۔ دل کے کانوں سے سنیے، صدا کچھ اس طرح کی آرہی ہے ''میری امی، یہ آپ کا رونا بلکنا سب کے آپ کے حق میں رحمت ہورہا ہے۔ دنیا سے معصوم جارہی ہوں، پھر آج جمعہ کا دن۔۔۔۔ انوار ورحمتوں کی وہ بارش کہ میں خود اس میں گم ہوئی جارہی ہوں۔۔۔۔ اپنے پیارے ابو کو دیکھ رہی تھی، کیسا دھڑا دھڑ روپیہ میرے دوا علاج میں صرف کررہے تھے، جیسے کہیں کے امیر کبیر ہیں! آخر میرے ہی لیے تو جوڑ بٹور کر رکھنے والے تھے، میرے فرض سے سبکدوش ہوگئے۔ امانت اپنے مولا کو واپس پہونچ گئی۔ یہ جدائی گے دن، دن ہی کتنے ہیں۔ اپنے اُن آقا سردار کی یاد میں کاٹ دیجیے، جنھوں نے اپنی ایک نہیں، دو دو اور کنواری نہیں بیاہی ہوئی جوان جوان صاحبزادیوں کو کفنایا، دفنایا، اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا، مٹی میں سُلایا، اپنے مالک ومولی کی سپردگی میں دیا۔ آپ کو تو انھیں کی کنیزی پر فخر ہے، انھیں سے سبق صبر کا بھی لیجیے۔ میرے لیے زیادہ نہ گھلیے۔ یہ چند روزہ پردہ اور حجاب تو آپ ہی کی مصلحت کے لیے ہے۔ میں تو آپ لوگوں کی بخشش کا ذریعہ اور حیلہ بن رہی ہوں، دنیا میں تو آپ کی خدمت کرہی کیا سکتی تھی، آپ کی شفقتوں کا بدلہ کسی درجہ میں کہاں دے سکتی تھی۔ یہاں البتہ انشاء اللہ حوض کوثر پر آپ سے ملوں گی۔ بڑھ کر اور لپک کر آپ سے لپٹوں گی۔ مچلوں گی۔ آپ دونوں کی انگلی پکڑ کر جنت میں لے چلوں گی۔ یہ وعدے سچے کی زبان سے آپ کو پہونچ چکے ہیں۔ اور سچے کے وعدے غلط نہیں ہوتے''۔

(ص:۲۳۸)

ہماری چند اہم کتابیں

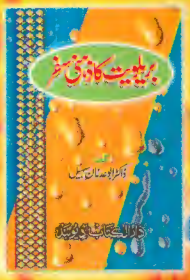

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

دار الکتاب دیوبند

PRINT ART Delhi Ph. 23634222 Fax : 011-23634222